اسباقِ تاریخ

اسلامی تاریخ کے سبق آموز صفحات

مولانا وحید الدّین خاں

اسباق تاریخ

اسلامی تاریخ کے سبق آموز صفحات

مولانا وحید الدّین خاں

Asbaq-e-Tareek
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1999
Reprinted 2019
This book is copyright free

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. +9111-41827083, Mob. +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Goodword Books, Chennai
Mob. +91-9790853944, 9600105558

Printed in India

بسم الله الرحمن الرحيم

دیباچہ

زیر نظر مجموعہ عام معنوں میں کوئی مرتب کتاب نہیں۔ وہ مختلف اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ماہنامہ الرسالہ میں چھپتے رہے ہیں۔ یہاں ان کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کردیا گیا۔ ان مضامین کا مشترک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم تاریخ کے مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر واقع میں کوئی ایسی نصیحت ہے جو اس کو عمومی بنادیتی ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کے کئی طریقے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً فخر کے جذبہ کی تسکین حاصل کرنا یا ماضی کی معلومات کے طور پر اس کو دیکھنا۔ زیر نظر کتاب میں، اس کے بجائے تاریخ کا مطالعہ سبق اور نصیحت کے لئے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقصد کے تحت تاریخ کو پڑھنا بے حد اہم ہے۔ اور اگر اس سے صحیح تاثر لیا جائے تو وہ زندگی کی تعمیر کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

بدقسمتی سے ہماری مدون تاریخ اس نہج پر نہیں لکھی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں تاریخ کو زیادہ تر جنگ وفتوحات کی داستان کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ یہی انداز ساری دنیا میں پھیل گیا۔ قدیم زمانہ میں تاریخ کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ تقریباً سب کی سب بادشا نامہ یا جنگ نامہ تھیں۔ یہی مروجہ انداز مسلمانوں کے درمیان بھی غیر شعوری طور پر داخل ہو گیا۔

اسلام کے ظہور کے بعد ہزار سال تک اسلام کی تاریخ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں ہیں مگر وہ زیادہ تر فتوحات مسلمین یا جنگ نامۂ اسلام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلا شخص جس نے اسلامی تاریخ کی اس کمی کو محسوس کیا وہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۷۳۲۔۸۰۸ھ) تھا۔ اس نے نئے اسلوب پر تاریخ نگاری کے اصول وضع کیے جو اس کی

مشہور کتاب مقدمہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس نے ان اصولوں پر تاریخ کو مرتب کرنے کی کوشش کی تاہم وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کمی نے اسلام کی تاریخ کو بظاہر جنگ وفتوحات کی تاریخ بنادیا۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام ایک شمیری مذہب ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی تاریخ، وسیع تر معنوں میں حیات انسانی کی تاریخ ہے۔ مگر عملاً وہ کشور کشائی کی تاریخ بن گئی۔ اسلام نے اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں کروروں انسانوں کو متاثر کیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کا سبب بنا۔ انسانی زندگی میں ایسا ہمہ گیر انقلاب صرف شمشیر کے ذریعہ وجود میں نہیں آسکتا۔

مورخین عام طور پر اسلامی تاریخ کے جس پہلو سے سب سے زیادہ متاثر ہیں وہ اسلام کی استثنائی نوعیت کی انتہائی تیز رفتار جغرافی توسیع ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے دوست اور دشمن دونوں میں سے کوئی بھی اس واقعہ سے صحیح سبق نہ لے سکا۔ اسلام کے معترفین نے اسلامی تاریخ کے اس واقعہ سے زیادہ تر فخر کی غذا لی۔ اس کے برعکس اسلام کے معترضین نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام کی اصل طاقت اس کی تلوار ہے نہ کہ اس کی آئیڈیالوجی۔

زیر نظر کتاب گویا کہ اسلام کی تاریخ کا درست زاویہ سے مطالعہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس اعتبار سے شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ غلط طریقہ مطالعہ کی تصحیح کی طرف ایک قدم ہے۔ اگرچہ وہ محدود بھی ہے اور غیر مرتب بھی۔

وحید الدین

دہلی، ۲۰ نومبر ۱۹۹۸

فہرست

پہلا باب ۱۲
جماعت صحابہ ۱۴
برتر تدبیر ۱۵
زمانی فرق ۱۶
دو نمونے ۱۷
دو انسان ۱۸
اسلام کے سفیر ۲۰
رہنما کی اہمیت ۲۱
غلط فہمی ۲۲
زیادہ ثواب ۲۴
عوام و خواص ۲۶
باشعور افراد ۲۸
اتحاد کی شرط ۳۰
مقام کیسے ملا ۳۲
انقلابی فیصلہ ۳۵
یہ حاملین اسلام ۳۶
خوف خدا ۳۷
قدردانی ۳۸
یہود کے نقش قدم پر ۳۹
اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے ۴۴
توبہ نے طاقت ور بنادیا ۴۵
معیار کی تبدیلی ۴۷
حکم آنے کے بعد ۴۸
جب آدمی عقل کھودے ۵۰
متحدہ محاذ کی سیاست ۵۱
سب سے بڑی ضمانت ۵۵
امتحان کی قیمت ۵۷
انصاف کا طریقہ ۵۹
سورہ نور کی روشنی میں ۶۲
الزام کافی نہیں ۶۵
اپنی پہچان ۶۷
آیت فتنہ ۶۹
اقدام سے پہلے تحقیق ضروری ۷۱
سچائی کا زور ۷۴

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ۷۶
خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا ۷۸
ایک خاندانی جھگڑا ۸۰
حیوانیت کی سطح پر ۸۴
کتنا فرق ۸۶
الٹا نتیجہ ۸۸
مردہ لوگ ۹۱
خدا کی سنت ۹۳
اکابر قوم ۹۵
دے کر پانا ۹۶
ایک واقعہ ۹۸
اعتراف ۱۰۰
غلطی کی اصلاح ۱۰۱
وہ بادشاہ ہو کر بھی ۱۰۳
عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے ۱۰۵
انسانوں کی ایک قسم یہ بھی ہے ۱۰۵
انسانی اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں ۱۰۶
سیاست کے لئے جوش و خروش ۱۰۷
یہ تھا مشرکین عرب کا کردار ۱۰۸
ایک واقعہ ۱۱۴
حبش کی ہجرت ۱۵
عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے ۱۱۶
ان کے پاس ہر روش کے لئے ۱۱۸
عزت و ذلت ۱۲۱
کبھی ایسا ہوتا ہے ۱۲۱
سرسری مطالعہ ۱۲۵
اس میں آپ کے لئے سبق ہے ۱۲۶
لطیفہ ۱۲۸
دوسرا باب ۱۲۹
فطرت پر ۱۳۱
دو کردار ۱۳۲
حالات کے نتیجہ میں ۱۳۳
تعصب کی حد ۱۳۴
حکومتی منصب ۱۳۵
کتنا فرق ۱۳۷
قرآن سے تعلق ۱۳۸
تاریخ کا سبق ۱۳۹
اسلامی رواداری ۱۴۱

یہ بھی ممکن ہے ۱۴۲
بادشاہ بھی ۱۴۳
تعصب کی قیمت ۱۴۴
امامت کا راز ۱۴۵
تاریخ سبق دیتی ہے ۱۴۶
مغربی قومیں ۱۴۷
جب یہ نوبت آجائے ۱۴۸
دعوت سے غفلت ۱۴۹
تاریخ کا فتنہ ۱۵۰
عہدہ نہ ملنے پر ۱۵۱
آدمی بدل جاتا ہے ۱۵۲
محل سے کھنڈر ۱۵۳
منفی سیاست مہنگی پڑی ۱۵۴
موت کے وقت ۱۵۵
غلط استدلال ۱۵۶
عقل کی آنکھ سے ۱۵۷
ماضی اور حال ۱۵۸
ماضی اور حال کا فرق ۱۶۰
ترقی کا راز ۱۶۴
ظالم کے لئے کامیابی نہیں ۱۶۵
فتوحات کا راز ۱۶۶
تخریبی سیاست کا انجام ۱۶۸
تار تاری فتنہ اختلافی سیاست کا نتیجہ ۱۷۱
دو تاریخی تجربے ۱۷۵
اچھی زندگی ۱۸۰
اخلاص کافی نہیں ۱۸۱
اعلیٰ ظرفی ۱۸۳
علامتی سرزمین ۱۸۶
تعمیر، سیاست ۱۸۷
اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے ۱۹۱
الفاظ کا فتنہ ۱۹۲
دو قسم کے انسان ۱۹۳
غلط فہمی ۱۹۴
معاشی فراغت ۱۹۵
نازک مسئلہ ۱۹۶
یہ صحیح نہیں ۱۹۹
طارق بن زیاد ۲۰۰
یونانی علوم ۲۰۸

تاریخ کا سبق ۲۱۰
نصیحت کا اثر ۲۱۳
دو مثالیں ۲۱۴
دو تصویریں ۲۱۶
ایک عام برائی ۲۱۷
نصیحت ۲۱۸
پکار پر دوڑنے والے ۲۱۹
جب کرتب بازی کو ۲۲۰
بڑھیا کی دلیری ۲۲۱
اچھا گمان رکھئے ۲۲۲
تیسرا باب ۲۲۳
عصری تقاضے ۲۲۵
خود شکن بنئے ۲۲۶
صفحۂ عبرت ۲۲۷
بلند کردار ۲۲۹
ذمہ دار کون ۲۳۰
تاریخ سبق دیتی ہے ۲۳۲
کتنا فرق ۲۳۳
جدو جہد ۲۳۵
فساد کا ذمہ دار ۲۳۶
خدا کی مدد ۲۳۹
اسلام کے نام پر ۲۴۱
سبق آموز ۲۴۲
تاریخ پکارتی ہے ۲۴۴
اتفاق کا نتیجہ ۲۴۷
پہچان ۲۴۸
بڑاپن ۲۴۹
جاننا کافی نہیں ۲۵۰
بربادی کے باوجود ۲۵۱
قومی عظمت ۲۵۳
عروج زوال ۲۵۵
منفی تحریکیں ۲۵۶
چوتھا باب ۲۵۷
ایک مثال ۲۵۹
ماضی اور حال ۲۶۰
اخلاق کی طاقت ۲۶۱
اللہ کو بہت یاد کرو ۲۶۲
کل اور آج کا فرق ۲۶۳

جہاد کے نام پر ۲۶۴
تاریخ کا نوشتہ ۲۶۷
اسلام کا عطیہ ۲۶۸
قدردانی ۲۶۹
منفی جوش ۲۷۰
تھوڑا وقت زیادہ کام ۲۷۱
بے فائدہ باتیں ۲۷۲
کتنا فرق ۲۷۳
صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں ۲۷۴
ایک اہم کتاب ۲۷۵
ملت کا سرمایہ ۲۷۶
کام سے پہلے کام کی بنیاد تیار کیجئے ۲۷۷
بے فائدہ سیاست ۲۷۸
جذباتی نہ بنو ۲۷۹
عبرت ناک ۲۸۰
خبر غلط تھی ۲۸۱
نظام تعلیم ۲۸۳
کیسی عجیب غفلت ۲۸۴
آہ یہ بے شعوری ۲۸۶
وہ مواقع جو استعمال نہ ہوسکے ۲۸۸
کیسا عجیب ۲۹۰
فلسطین: ایک علامت ۲۹۱
اسلام کے نام پر اسلام کا قتل ۲۹۴
اسلامی تخریب کاری ۲۹۶
ان کا مکمل انقلاب جزئی انقلاب ۲۹۷
انقلابی خوش خیالیاں ۲۹۹
عبرت کے لئے ۳۰۰
یہ خوش خیال مفکرین ۳۰۲
مدعو میں برتری کی نفسیات پیدا کرنا ۳۰۷
ضمیر۔ دنیا میں خدا کی عدالت ہے ۳۰۸
ہم کہاں ہیں ۳۰۹
نظام مصطفے کی نئی تعبیر ۳۱۰
الفاظ، الفاظ، الفاظ ۳۱۱
مسلمان: کل اور آج ۳۱۲
سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت ۳۱۴
سیاست کے ساتھ دینی خدمت ۳۱۶
جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں ۳۱۸
اسی سے تعمیر دنیا بھی ۳۱۹

موت کے عقیدہ نے زندگی دے دی	۳۲۱	جاحظ اور حریری	۳۴۱
قناعت	۳۲۲	ایک عبرت انگیز واقعہ	۳۴۲
زندہ رہنمائی	۳۲۴	تقریر و خطابت کے کمالات	۳۴۳
کہاں سے کہاں تک	۳۲۶	شاعر کا اعتراف	۳۴۵
خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد	۳۳۲	بناوٹی قصے	۳۴۶
دوسرے کا اعتراف	۳۳۳	ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو	۳۴۸
کرنے کا کام	۳۳۴	العراق اول قطر	۳۵۰
صابرانہ طریقہ	۳۳۵	عربی زبان نئی اہمیت	۳۵۲
غریبی کا سبب	۳۳۶	ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی	۳۵۷
ایک تقابل	۳۳۷	نصف صدی بعد	۳۶۰
مسجد کو دیکھ کر	۳۳۸	جب بادشاہ بھی	۳۶۴
تبرکات	۳۳۹	جب خدا کی زمین	۳۶۵
ہر آدمی کے لئے سب سے پہلا کام	۳۴۰	دین داری یہ ہے	۳۶۶

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں حال کی انسانی نسلیں
اپنے ماضی کا مشاہدہ کر سکتی ہیں

پہلا باب

جماعت صحابہ

صحیح مسلم (کتاب الجہاد والسیر) میں یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بیان کیا کہ جب بدر کا دن تھا۔ اور دونوں گروہ ایک میدان میں آمنے سامنے جمع تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار مسلح افراد تھے۔ اور دوسری طرف آپ کے اصحاب صرف ۳۱۲ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ، تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما ـــــ اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کی اس جماعت کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی :

اللّٰھمّ اِن تُہلِك ھٰذہِ العِصابۃَ مِن اھل الاسلام لاتُعبد (بعدھا) فی الارض (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۲/۸۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بلا مبالغہ درست تھے۔ آپ کے یہ اصحاب جن کو حالات نے میدان بدر میں اکٹھا کیا تھا، وہ خیار انسانیت تھے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام (تمہارے جو افراد جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہوں گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرب میں جو لوگ اکٹھا ہوئے تھے، وہ پوری بشری تاریخ کے بہترین لوگ تھے، وہ لمبے تاریخی عمل کے دوران بن کر تیار ہوئے اور پھر انھیں یہ موقع ملا کہ وہ خاتم الرسل کا ساتھ دے کر وہ انقلاب برپا کریں جو ہزاروں سال سے اللہ تعالٰے کو مطلوب تھا۔ مگر اب تک وہ وقوع میں نہیں آیا تھا۔

یہ وہ قیمتی گروہ تھا جو تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھا۔ وہ ایک طرف خیار انسانیت تھا اور دوسری طرف خیار اسلام۔

برتر تدبیر

حضرت ابراہیم بن عیلہ کو خلیفہ ہشام بن عبدالملک اموی نے بلایا اور ان کو مصر کے محکمۂ خراج کے افسر کا عہدہ پیش کیا۔ حضرت ابراہیم بن عیلہ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

خلیفہ ہشام کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا ورنہ آپ کو سخت سزا دی جائے گی۔ حضرت ابراہیم بن عیلہ نے نہایت نرمی کے ساتھ کہا "اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کو امانت پیش کی مگر انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کردیا۔ پھر جب خدائے بزرگ و برتر ذمہ داری قبول نہ کرنے پر خفا نہیں ہوئے تو آپ کیوں مجھ پر خفا ہو رہے ہیں" خلیفہ ہشام بن عبدالملک یہ سن کر چپ ہوگیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ابراہیم بن عیلہ کے مذکورہ جواب سے پہلے خلیفہ ہشام کو غلطی ابراہیم بن عیلہ کی طرف نظر آرہی تھی، اس جواب کے بعد خلیفہ کو محسوس ہوا کہ غلطی خود اس کی اپنی طرف ہے۔ اس احساس نے اس کی سوچ کو بدل دیا اور اس نے اپنے متشددانہ حکم کو واپس لے لیا۔

یہ ایک عظیم الشان فطری ہتھیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لیے اور ہر آدمی کے خلاف مہیا کیا ہے، خواہ اس کا حریف بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

آدمی اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ وہ تیز و تند الفاظ بول کر یا مخالفانہ کارروائی کرکے معاملہ کو مزید نہ بگاڑے تو یقینی طور پر وہ اس امکان کو اپنے حق میں استعمال کرسکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب بھی اپنے خلاف کوئی صورت حال پیش آئے، وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر کارروائی کرے۔ وہ فریق ثانی کے اندر احساس خطا کو جگانے کی کوشش کرے۔ اگر فریق ثانی کے اندر احساس خطا بیدار ہوگیا تو گویا وہ خود ہی اپنے ہتھیاروں سے زخمی ہوگیا۔

فریق ثانی کے اندر چھپی ہوئی فطرت کو جگانا اس کے اوپر سب سے بڑا حملہ ہے۔ کوئی بھی شخص نہیں جو اس حملہ کی تاب لا سکے۔ تاہم یہ حملہ وہ لوگ کرسکتے ہیں جو اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی کرلیں۔ جو لوگ اشتعال کی بات پر مشتعل ہوجائیں وہ کبھی اس اعلیٰ تدبیر کو استعمال نہیں کرسکتے۔

زمانی فرق

مکی دور کا ایک واقعہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک روز وہ کعبہ میں گئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق نماز پڑھنا شروع کیا۔ مکہ کے مشرکین نے ان کو کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ دوڑ کر آئے اور ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے ان کو بری طرح مارا پیٹا حتی کہ یہ ممکن نہ رہا کہ وہ وہاں اپنی نماز کو پورا کر سکیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کو یہاں میں بلا تقابل درج کر رہا ہوں۔ اس دن بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس کو سوادھیائے تحریک والوں نے منظم کیا تھا۔ چوپاٹی کے میدان میں تقریباً دس لاکھ ہندو حضرات اکٹھا تھے۔ ایک سرے پر بہت اونچا اور بہت وسیع منچ بنایا گیا تھا جس پر مسٹر ایل کے اڈوانی اور دوسرے بہت سے بڑے بڑے ہندو لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی مقرر کے طور پر وہاں مدعو تھا۔

اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے منچ کے ایک طرف کھڑے ہو کر سب کے سامنے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت سوادھیائے تحریک کے چیرمین دادا جی پانڈورنگ شاستری کی تقریر ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر روکی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ دور اول کے واقعہ میں غیر مسلموں نے ایک مسلمان کو نماز پڑھنے نہیں دیا تھا۔ آج خود غیر مسلموں کے بڑے مجمع میں ایک مسلمان آزادی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ اس فرق کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ اور موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر آج مذہب کے حق میں ایسے امکانات کھل گئے ہیں جو کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔

پہلے تشدد کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ آج امن کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آزادانہ طور پر مذہبی سرگرمیاں جاری نہیں کی جا سکتی تھیں، آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کامل آزادی کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کو جاری کیا جائے۔

دو نمونے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کے سامنے بھی اسلام کو پیش کیا اس نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ تردد کا اظہار کیا۔ مگر ابوبکر کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے سامنے جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کسی شبہ یا تردد کا اظہار نہیں کیا بلکہ فوراً ہی اسلام قبول کر لیا (حیاۃ الصحابہ ۱/۶۸) حضرت ابوبکر اپنی اسی صفت کی بنا پر الصدیق کہے گئے۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں ایک نمونہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہے۔ دوسرا نمونہ وہ ہے جو حضرت عمر فاروق کی زندگی میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر نے پہلے اسلام کی سخت مخالفت کی اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ انھوں نے قرآن کے کچھ حصہ کو پڑھا اور اس پر غور کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے رویہ کو بدلنے کا فیصلہ کیا اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

یہ دو علامتی نمونے ہیں۔ یہ دونوں رہنما نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق کے معاملہ میں انسان کو ان دو میں سے کسی ایک کی مانند ہونا چاہیے۔ ان دو کے بعد کوئی تیسرا نمونہ مطلوب نمونہ نہیں۔

پہلے نمونہ کے مطابق، آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ گہرے غور و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو اتنا پختہ بنائے کہ وہ خود ہی حقیقت کو اس کی گہرائی تک سمجھ جائے۔ وہ فکری اعتبار سے خود یہ اہلیت رکھتا ہو کہ شکوک و شبہات کے پردے کو پھاڑ سکے اور غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھ لے۔ یہ فکری پختگی کا اعلیٰ درجہ ہے اور حضرت ابوبکر صدیق اسی درجہ کی آخری تکمیلی مثال ہیں۔

دوسرے نمونہ کے مطابق، آدمی کو متعصبانہ فکر اور بے اعترافی سے آخری حد تک پاک ہونا چاہیے۔ اس کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اتنا زیادہ خالی ہونا چاہیے کہ جب بھی دلیل کی زبان میں اس کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کی جائے تو وہ فی الفور اس سے باخبر ہو جائے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ حضرت عمر فاروق اس دوسرے نمونہ کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ نے ایک ایسا فیصلہ فرمایا جو درست نہ تھا اس کے بعد کسی شخص نے دلیل کی زبان میں اس کی وضاحت کی تو آپ نے فوراً ہی اس کو مان لیا اور شدت اعتراف کے تحت آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

لولا فلان لهلك عمر۔

دُو انسان

مسیلمہ کذاب (م ۱۲ھ) نجد کے علاقہ میں یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس مقام کو اب جُبَیلہ کہا جاتا ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اسی لیے وہ کذاب (جھوٹا) کہا جاتا ہے۔ عربی میں مثل ہے:
اکذب من مسیلمۃ ۔ یعنی مسیلمہ سے بھی زیادہ جھوٹا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ؓ نے یمامہ جاکر مسیلمہ سے ملاقات کی۔ مسیلمہ نے پوچھا کہ تمہارے صاحب پر حال میں اترنے والی وحی کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ آپ پر ایک سورہ اتری ہے جو نہایت مختصر اور نہایت بلیغ ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے اس کو سورہ العصر سنائی:

والعصر۔ ان الانسان لفی خسر۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

اس کو سن کر مسیلمہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا کہ میرے اوپر بھی اسی قسم کا کلام اترا ہے۔ عمرو بن العاص نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ مسیلمہ نے حسب ذیل الفاظ سنائے:

یا وبر یا وبر و انما انت اذنان وصدر وسائرک حفر ونقر۔

اس کے بعد اس نے پوچھا کہ اے عمرو، تمہارا کیا خیال ہے۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا: خدا کی قسم، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تفسیر ابن کثیر ۴/۵۴۷) مسیلمہ کو معلوم تھا کہ اس کے یہ الفاظ بالکل لغو ہیں۔ مگر اس نے نعوذ باللہ قرآن کا مذاق اڑانے کے لیے ان کو موزوں کرکے سنایا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ یہ سورہ العصر مکہ میں نازل ہوئی تھی، جب وہ اتری تو بعض صحابہ نے اس کو ایک تختی پر لکھا اور اس کو کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے اس کو پڑھا۔ انھیں میں سے ایک لبید بن ربیعہ العامری (م ۴۱ھ) تھے۔ وہ بھی نجد کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں ہوتا ہے۔ بعد کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیعت کرکے اسلام قبول کیا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام سے ان کا پہلا تاثر سورہ العصر کے ذریعہ ہوا تھا، وہ مکہ آئے اور کعبہ کی دیوار پر لکھی ہوئی مختصر سورہ العصر کو پڑھا۔ ان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ جوش میں آکر

اسی وقت کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ آخر میں انھوں نے کہا : واللہ ما ھذا من کلام البشر (خدا کی قسم، یہ کسی انسان کا کلام نہیں)

اس کے بعد وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ عرب کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ مگر انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ شاعری کیوں چھوڑی تو جواب دیا : أبعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا (ترك الشعر فلم يقل في الاسلام إلا بيتاً واحداً) الاعلام ۵/۲۴۰

ایک ہی واقعہ ایک شخص کے لیے گمراہی کا سبب بن گیا اور دوسرے آدمی کو اس سے ہدایت مل گئی۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ اُنانیت ہے۔ مسیلمہ اپنے سینہ میں انانیت لیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کو سب سے بڑا سمجھتا تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں گم تھا، اس لیے وہ حق کو دیکھنے سے محروم رہا۔ اس نے اپنے آپ کو جانا، اور اس کی ذات کے باہر جو زیادہ بڑی حقیقت تھی اس کا ادراک کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس معاملہ لبید کا تھا۔ وہ حق کو سب سے بڑا سمجھتے تھے۔ ان کا سینہ خود پسندی سے پاک تھا۔ وہ ذاتی مصالح سے اوپر اٹھ کر حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس بنا پر جب حق آیا تو فوراً وہ اس کو پہچان گئے، اور اپنے آپ کو فوراً اس کے حوالے کر دیا۔

اس دنیا میں سب سے بڑا جرم حق کا انکار ہے، اور سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف۔ پہلی چیز آدمی کو جہنم میں لے جاتی ہے، اور دوسری چیز اس کو جنت کا مستحق بنا دیتی ہے۔

اسلام کے سفیر

ام حرام بنت ملحان ایک صحابیہ ہیں۔ان کا نکاح حضرت عبادہ بن الصامت انصاری سے ہوا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اور اب قبرص (Cyprus) میں ان کی قبر ہے۔ ان کی قبر کو وہاں قبر المرأۃ الصالحۃ کہا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۱/۵۹۲) حضرت خالد بن الولید کی قبر حمص (شام) میں ہے، حالاں کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔

یہی معاملہ بیشتر اصحاب رسول کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن آج اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ کو بہت کم صحابہ کی قبریں ملیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ ان میں اکثر کی وفات ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں ہوئی اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مدینہ کی مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو تم لوگ اختلاف نہ کرو۔ بلکہ تم ملکوں اور شہروں میں جاؤ اور ہر جگہ کے لوگوں تک میری طرف سے میرا پیغام پہنچا دو (فأدُّوا عنّي) سیرت ابن ہشام ۴/۲۷۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر اصحاب کرام عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ باہر کے ملکوں میں جا کر وہ تجارت کرتے تھے یا محنت سے اپنی روزی کماتے تھے اور لوگوں تک اس پیغام کو پہنچاتے تھے جو ان کو پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ ملا تھا اس طرح ہر شخص اسلام کا سفیر بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام زمین کے چاروں طرف پھیل گیا اور تمام آباد دنیا میں اسلام کے نشانات دکھائی دینے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان معاشی اسباب کے تحت ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ اس طرح دوبارہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ہر جگہ اسلام کے سفیر کا کام انجام دے سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا یہ سفر صرف معاشی سفر نہ رہے گا بلکہ پورے معنوں میں دعوتی سفر بن جائے گا۔ اس طرح اسلام کی عالمی اشاعت پھر اسی طرح ہونے لگے گی جس طرح وہ دور اول میں ہوئی تھی۔

رہنما کی اہمیت

صحیح البخاری (کتاب مناقب الانصار) میں ایک طویل حدیث آئی ہے۔ خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک خاتون نے پوچھا کہ دین کا معاملہ کب تک درست رہے گا۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا: بقاؤکم علیہ ما استقامت بکم ائمتکم (فتح الباری ۷/۱۸۲) یعنی دین صحیح پر تم لوگ اس وقت تک قائم رہوگے جب تک تمہارے رہنما درست رہیں۔

کوئی تحریک خواہ وہ اچھی ہو یا بری، ہمیشہ رہنما طبقہ اس کو چلاتا ہے۔ کسی قوم کا رہنما طبقہ ہی اس قوم کا ذہن ساز طبقہ (opinion-maker class) ہوتا ہے۔ وہی عوام کو کسی اشو پر موبیلائز کرتا ہے، وہی لوگوں کو ابھار کر کسی محاذ پر کھڑا کرتا ہے۔ کوئی تحریک خواہ بظاہر عوام کے نام پر اٹھی ہو، حقیقۃً وہ کچھ رہنماؤں کی اٹھائی ہوتی ہے۔

کسی معاملہ کی نوعیت کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف خواص ہیں جو اس کی واقعی نوعیت کو سمجھتے ہیں اور عوام کو رہنمائی دیتے ہیں۔ یہی رہنمائی کسی قوم کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگر رہنما نے قوم کو صحیح رخ پر اٹھایا ہو تو وہ آخر کار اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔ اور رہنما اگر قوم کو غلط رخ پر دوڑا دے تو ساری قربانیوں کے باوجود قوم تباہی کے گڑھے میں جاگرتی ہے۔ وہ پانے کے بجائے کچھ اور کھو دیتی ہے۔

کسی قوم کی عملی زندگی میں رہنما کا رول بے حد نازک ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رہنما آخری حد تک سنجیدہ ہو۔ کیوں کہ اس نے اگر قوم کو غلط سمت میں دوڑا دیا تو اس کے بعد جو تباہی آئے گی اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی رہنما پر ہوگی۔

دریا میں تیرنے کے لیے وہی آدمی اترتا ہے جو تیراکی کا فن جانتا ہو۔ اسی طرح رہنمائی کے میدان میں صرف اس شخص کو آنا چاہیے جس نے اس کی ضروری شرطوں کو پورا کیا ہو ــــــ دین کا بخوبی علم، حالات موجودہ کا گہرا مطالعہ، قوم کی ایمانی اور اخلاقی حالت کا صحیح اندازہ، بیرونی طاقتوں کے بارہ میں کامل معلومات، اس قسم کے تمام ضروری پہلوؤں پر جس کو دستگاہ حاصل ہو اسی کو رہنمائی کے میدان میں اترنا چاہیے۔ اس کے بغیر رہنمائی کا کام سنبھالنا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔

غلط فہمی

صحیح البخاری (کتاب النکاح، باب عرض الانسان ابنته او اخته علیٰ اهل الخیر)، میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا۔ جب ان کی صاحبزادی حفصہ بیوہ ہوگئیں جن کا نکاح خنیس بن حُذافہ السہمی سے ہوا تھا۔ اور وہ مدینہ میں وفات پاگئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر میں عثمان بن عفان کے پاس آیا اور میں نے ان کو حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ چند دن کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس وقت میں نکاح نہیں کرسکوں گا۔

حضرت عمر کہتے ہیں کہ پھر میں ابو بکر صدیق سے ملا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی حفصہ کا نکاح آپ سے کردوں۔ ابو بکر خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا (فصمت ابوبکر فلم یرجع الیّ شیأً)

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابو بکر پر مجھے عثمان سے بھی زیادہ غصہ آیا (وکنت اوجدَ علیه منی علی عثمان، وفی روایة: فغضب علیٰ ابی بکر وقال فیها، کنت اشدّ غضبا حین سکت منّی علی عثمان)

پھر میں کچھ دن تک ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ کے ساتھ میں نے حفصہ کا نکاح کر دیا۔ اس کے بعد میری ملاقات ابو بکر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ شاید تم مجھ پر غصہ ہوئے ہوگے جب کہ تم نے مجھ سے حفصہ کا پیغام دیا تھا۔ اور میں نے تم کو کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر نے کہا کہ اس معاملہ میں جواب سے مجھے صرف اس چیز نے روکا تھا کہ میں جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا ذکر کیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں رسول اللہ کا راز کھول دوں۔ اگر آپ ان کو چھوڑ دیتے تو میں ضرور انھیں قبول کر لیتا (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۸۱-۸۳)

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ اس کے باوجود

ایسا ہوتا ہے کہ ایک صحابی دوسرے صحابی کے رویہ کو اتنا زیادہ غلط سمجھ لیتا ہے کہ اس پر اس کو غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ یہ دراصل غلط فہمی کا معاملہ تھا نہ کہ غلط کاری کا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر ابتدائی مرحلہ میں مذکورہ واقعہ کو محض ظاہر کے اعتبار سے لے رہے تھے۔ ظاہر کے اعتبار انھیں دکھائی دیا کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان نے نامناسب رویہ اختیار کیا۔ مگر جب معاملہ کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کا رویہ بالکل درست تھا۔ اس میں غصہ ہونے کی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

ایک صحابی کو جب دوسرے صحابی کے معاملہ میں غلط فہمی ہو سکتی ہے تو عام مسلمان کو دوسرے مسلمان کے معاملہ میں بھی یقیناً غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنے میں وہ انتہائی محتاط ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعض ظاہری چیزوں کو دیکھ کر وہ بری رائے قائم کر رہا ہو۔ حالاں کہ زیادہ گہرے اسباب بتا رہے ہوں کہ یہ سراسر غلط فہمی کی بات ہے، کیونکہ وہاں سرے سے کوئی غلط فعل پایا نہیں جا رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں باہمی تعلقات میں بگاڑ کا سبب اکثر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ حتی کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر حالات کے اعتبار سے غلط فہمی بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

یہ غلط فہمی دو مخلص افراد یا دو بے قصور گروہوں کے درمیان بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب بھی غلط فہمی کی صورت پیدا ہو تو ایسا نہ کرے کہ اس پر یقین کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ متعلق افراد سے مل کر اس کی تحقیق کرے۔ کامل تحقیق کے بغیر ہرگز وہ اس کو تسلیم نہ کرے۔ تحقیق کا طریقہ غلط فہمی سے پیدا ہونے والی برائیوں کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیق کے بعد جب غلط فہمی بے بنیاد ثابت ہو تو فوراً اپنے دل و دماغ سے اس کو نکال دے۔ اپنے آپ کو دوبارہ اسی طرح معتدل بنا لے جس طرح وہ غلط فہمی کی صورت پیدا ہونے سے پہلے تھا۔

تحقیق کو اپنا اصول بنا لیجئے۔ اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

زیادہ ثواب

قرآن کی سورہ النور میں ۶ھ میں پیش آنے والے اس واقعہ کا ذکر ہے جو اسلام کی تاریخ میں اِفک کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر مدینہ کے کچھ شرپسندوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ایک جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے نتیجہ میں پورے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ وقتی طور پر مسلمانوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے (لا تحسبوہ شراً لکم بل ھو خیر لکم) النور ۱۱

اس قسم کا فتنہ یا اس قسم کی شر انگیزی کیوں اہل ایمان کے لیے خیر ثابت ہوتی ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ایسا ہر فتنہ سچے مومن کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ ایمانی عمل کا ثبوت دے جس کو قرآن میں ظن خیر کہا گیا ہے (النور ۱۲) افواہوں کی آندھی میں حسن ظن کا طریقہ اختیار کرکے وہ مزید ثواب کمائے، وہ زیادہ بڑا عمل کرکے اللہ کی نظر میں زیادہ مقبول بندہ بن جائے۔

مثلاً الزام تراشی کی اس مہم میں جو لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر شریک ہو گئے ان میں سے ایک حسان بن ثابت انصاریؓ بھی تھے۔ چنانچہ بعد کو جب متحقق ہوگیا کہ یہ پورا قصہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھا تو حسان بن ثابت کو ان کی غلطی پر کوڑے مارے گئے۔ مگر جہاں تک حضرت عائشہ کا تعلق ہے وہ کبھی حسان بن ثابتؓ سے متنفر نہیں ہوئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اس کو سخت ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حسان کو برا کہا جائے (قال عروۃ وکانت عائشۃ تکرہ ان یُسبّ عندھا حسان) وہ حسان کے اشعار پڑھ کر کہا کرتی تھیں کہ حسان وہ ہیں جنھوں نے اسلام کی مدافعت میں ایسے اور ایسے اشعار کہے ہیں (التفسیر المظہری ۲۷۳/۹)

حضرت عائشہؓ کا یہ قول شرافت اور بلند اخلاقی کی نہایت عظیم مثال ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ ایسا ایک کلمہ آدمی کو جنت میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ مگر اس قسم کے جنتی کلام کا کریڈٹ کسی کو ٹھنڈے حالات میں نہیں مل سکتا۔ یہ تو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ اس کے خلاف شر انگیزی اور فتنہ پردازی کا طوفان کھڑا کیا جائے مگر وہ مشتعل نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ انصاف اور

خیر خواہی کی روش نہ چھوڑے۔ اس کے باوجود اس کی زبان سے دوسروں کے لیے خیر کا کلمہ نکلے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کا اعتراف کرے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے حق میں نیک دعا کرے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح منفی ردعمل سے بچائے اور ہر حال میں تقویٰ کی مثبت روش پر قائم رہے۔

اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں جب یہ بے ہودہ خبر پھیلی تو حضرت ابوایوب انصاریؓ اپنے گھر میں آئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ اے ابوایوب، آپ نے سنا کہ عائشہؓ کے بارہ میں کیا کہا جارہا ہے۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ ہاں میں نے سنا۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کروگی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے افضل ہیں۔ ان کی بیوی نے جواب دیا کہ ہاں، آپ نے صحیح کہا۔ (تفسیر قرطبی ۱۲/۲۰۲)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صفوان بن المعطل السلمی کا نام لیا جن کے ساتھ ظالموں نے حضرت عائشہ صدیقہ کو ملوث کیا تھا۔ ابوایوب انصاری نے کہا کہ میں خود اپنے بارہ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت اگر میں صفوان کی جگہ پر ہوتا تو میرے دل میں اس طرح کا خیال تک نہیں آسکتا تھا۔ پھر صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے، وہ کیوں کر ایسا سوچ سکتا تھا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں قول سدید کہا گیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ کیا کہ ایک سادہ منطق کو استعمال کرکے اسے پہلے ہی مرحلہ میں رد کردیا۔ انھوں نے سوچا کہ کوئی بھی شریف انسان ایسا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ عائشہ صدیقہ جیسی شریف خاتون یا صفوان جیسا مخلص مومن اس قسم کی ذلیل بات کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہنگامی واقعہ اگر نہ پیش آتا تو ابوایوب انصاری کو اس عظیم عمل کا انعام کیسے ملتا کہ ذہنی بھونچال کے وقت بھی انھوں نے اعتراف کا ثبوت دیا۔ ناموافق پروپگنڈوں کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو فکری اعتدال پر باقی رکھا۔ زلزلہ خیز حالات بھی اس میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ان کے قدم کو حق وصداقت سے ہٹادیں۔

حسن ظن ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے آدمی کو خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے حسن ظن کو خدا کی نظر میں ایک عظیم عمل بنادیا ہے۔

عوام و خواص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر قدیم مکہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک نام رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف کا ہے۔ وہ قریش کے پہلوانوں میں سے تھے۔ روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ میں کشتی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد رکانہ نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ کشتی کیسے ہوئی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ سے کہا: افرأیتَ إن صرعتُك تعلم أن ما أقول حق (اگر میں کشتی میں تم کو پچھاڑ دوں تو کیا تم جان لوگے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق ہے) البدایۃ والنھایۃ ۳/۱۰۳

دوسری روایت میں اس قول کو رکانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: إن صرعتنی علمتُ أنك صادق (اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو میں جان لوں گا کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں) الکامل فی التاریخ ۲/۷۵

رکانہ کی طرح عمر بن الخطابؓ بھی قدیم مکہ کے پہلوانوں میں سے تھے۔ مگر نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی میں پچھاڑنے کی بات کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایسا کہا۔ اس کے برعکس عمر فاروقؓ نے قرآن کو پڑھا۔ اس کو پڑھنے سے ان پر حقیقت منکشف ہوئی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اصل یہ ہے کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک عوام اور دوسرے خواص۔ عوام وہ ہیں جو پیدائشی طور پر کم تر ذہنی سطح سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور خواص وہ ہیں جو بلند ذہنی سطح کے مالک ہوں۔ دونوں کی ذہنی ضرورتیں الگ ہیں اور دونوں کو ان کی ذہنی ضرورت یا ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام دیا جاتا ہے۔

رکانہ کا تعلق عوام کے طبقہ سے تھا۔ وہ کشتی کی ہار جیت سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ مگر عمر فاروقؓ خواص کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے مالک تھے۔ اور اعلیٰ ذہن کے لوگ دلائل و حقائق سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ مذکورہ نوعیت کی کسی چیز سے۔

عوام وخواص یا کمتر ذہنی سطح اور اعلیٰ ذہنی سطح کی یہ تقسیم خود خالق فطرت کی قائم کردہ ہے۔ یہ فطری فرق تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کی دعوت دو سطح پر چلائی جائے۔ ایک عوام کی سطح پر جہاں قصے اور مثالیں اور فضائل کی زبان میں لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے۔

دوسری سطح خواص کی ہے۔ یہاں لوگوں کو اسلام کا پیغام دلائل وحقائق کی زبان میں دینا ہوگا۔ یہاں اسلام کی تعلیمات کو اعلیٰ عقلی اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا۔ اسی لیے ایک صحابی نے کہا کہ لوگوں سے ان کے عقلی معیار کے مطابق بات کرو (کلموا الناس علی قدر عقولهم)

اس تقسیم کو توڑا نہیں جاسکتا۔ عوام کے سامنے اگر منطقی اسلوب یا دلائل کی زبان میں بات کی جائے تو وہ ان کے ذہن کو اپیل نہیں کرے گی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے عاجز رہیں گے۔ اسی طرح اگر خواص کے سامنے عوام کی زبان میں بات کہی جائے تو وہ خواص کو متاثر کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔

اسلام کے احیار کے لیے عوام اور خواص دونوں قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر خواص دین سے دور ہوں تو صرف عوام میں دین کا پھیلنا احیار اسلام کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر عوام میں دین نہ پھیلا ہو تو صرف خواص کا اسلام پسند بن جانا کوئی حقیقی انقلاب لانے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایسی تحریکیں جاری ہوں جو دوطرفہ تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوں۔ ایک طرف وہ عوام کے اندر عمومی دینی فضا پیدا کریں۔ دوسری طرف خواص کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرکے انھیں دین کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ دین کی گاڑی پہلے بھی انھیں دونوں پہیوں کی یکجائی سے چلی تھی اور آج بھی وہ اسی طرح چلے گی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ دین کی گاڑی کو چلانے والا نہیں۔

باشعور افراد

عبداللہ بن اُبی قدیم مدینہ کا سب سے بڑا سردار تھا۔ حتی کہ مدینہ کے باشندے اِس پر متفق ہو گئے تھے کہ اُس کو اپنا بادشاہ بنا لیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آگئے تو آپ ہی کو مدینہ کے لوگوں نے بڑا مان لیا۔ مدینہ میں ابتداءً مہاجرین اقلیت میں تھے۔ مگر مختلف مقامات سے لوگ ہجرت کر کے آتے رہے، یہاں تک کہ مدینہ میں مہاجرین کی اکثریت ہو گئی اور انصار اقلیت میں ہو گئے جن کا عبداللہ بن ابی سردار چلا آرہا تھا (تفسیر ابن کثیر ۴/۳۷۰)

ان باتوں کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین سے سخت بغض ہو گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو اور مہاجرین کو مطعون کرتا اور انھیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں عبداللہ بن اُبی اپنے قبیلہ کے بہت سے لوگوں کے ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک واقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے خلاف دشنام طرازی کی۔ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہم لوگ مدینہ کے عزت والے لوگ ہیں۔ اگر ہم مدینہ پہنچ جائیں تو ہم لوگ اپنے شہر سے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے (المنافقون ۸)

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ قافلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہوا جو راوی کے الفاظ میں یہ تھا :

ان ابنہ عبداللہ وقف لابیہ عبداللہ بن ابی بن سلول عند مضیق المدینۃ فقال قِف فواللہ لاتدخلہا حتی یأذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک۔ فلما جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استأذنہ فی ذلک فأذن لہ

اس کے لڑکے عبداللہؓ اپنے باپ عبداللہ بن اُبی بن سلول کے لیے مدینہ کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ عبداللہ بن اُبی وہاں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ٹھہرو، خدا کی قسم تم شہر میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دے دیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو عبداللہ بن اُبی نے آپ سے اجازت مانگی۔ آپ

فارسلہ حتی دخل المدینۃ نے اس کو اجازت دے دی۔ اس کے بعد عبداللہ نے اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مدینہ میں داخل ہوگیا۔ (البدایہ والنہایہ ۴/۱۵۸)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام اتنے دانش مند لوگ تھے کہ وہ بتائے بغیر باتوں کو جان لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ انھوں نے بطور خود یہ جان لیا کہ اس موقع پر انھیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ اس وقت موزوں ترین بات یہ تھی کہ عبداللہ بن ابی کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ ہوجائے کہ اب مدینہ کے بڑے تم نہیں ہو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بڑے اور مدینہ کے سردار ہیں۔

حضرت عبداللہ نے اس بات کے مظاہرہ کا انتہائی بروقت اور صحیح طریقہ اختیار کیا۔ اس کام کو کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ عبداللہ بن ابی کا بیٹا اسے انجام دے۔ حضرت عبداللہ نے اس حقیقت کو سمجھا اور عین وقت پر وہ مطلوبہ کردار ادا کیا جو اس موقع پر انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔

کسی مشن کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کو باشعور افراد کی ایک ٹیم مل جائے، اس طرح کی باصلاحیت ٹیم کے بغیر کوئی بھی مشن کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس ٹیم کے افراد میں دو صفت لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد اطاعت گزار ہو۔ اس سے جو کچھ کہا جائے وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کرے۔ وہ کسی عذر کو عذر نہ بنائے، خواہ وہ ذاتی عذر ہو یا خارجی عذر۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس ٹیم کے افراد اتنے باشعور ہوں کہ وہ کہے بغیر باتوں کو جان لیں۔ وہ بتائے بغیر صورت حال کو سمجھ لیں۔

اس دوسری صفت کی اہمیت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں بہت سی باتیں بتائی نہیں جاسکتیں. جب مشن پھیلتا ہے اور نئے نئے تقاضے سامنے آتے ہیں تو یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ لوگوں کو ساری ضروری باتیں بتادی جائیں۔ ایسے وقت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی عقل سے باتوں کی گہرائی کو سمجھے، وہ خود ہر موقع پر اس کے موافق ضروری اقدام کرسکے۔ کوئی بھی دوسری چیز اس شعوری پختگی کا بدل نہیں بن سکتی۔

اتحاد کی شرط

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اجتماعیت ٹوٹ گئی اور لوگوں میں کثرت سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت ایک شخص نے حضرت علی سے پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا معاملہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں لوگ اختلافات میں پڑ گئے ہیں، جب کہ ابو بکر و عمر کے زمانہ میں یہ اختلافات نہ تھے۔ حضرت علی نے جواب دیا: لان ابابکر و عمرَ کانا والیَین علی مثلی و انا الیوم والٍ علی مثلک (یعنی اس کا سبب یہ ہے کہ ابو بکر و عمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں تھے، اور میں تمہارے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں ہوں۔

ابن خلدون نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دینی حکومت کے قیام کے لئے اس کے مطابق دینی رجحان (الوازع الدینی) کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر معاشرہ کی سطح پر غالب دینی رجحان موجود نہ ہو تو محض حاکم کے اسلامی ہونے سے کامیاب اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ حضرت علی کے اس جواب میں آپ کا اشارہ اسی دینی محرک اور رجحان کی طرف تھا۔ المامون کو دیکھو۔ جب اس نے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق کو اپنا ولی عہد نامزد کیا اور ان کو الرضا کا لقب دیا تو کس طرح عباسیوں نے اس پر شدید ناگواری ظاہر کی۔ انھوں نے ان کی بیعت کو توڑ کر المامون کے چچا ابراہیم بن المہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور اس کے ردعمل میں ایسا اختلاف پیدا ہوا اور بغاوت پر آمادہ شورش پسند گروہوں کی ایسی کثرت ہو گئی کہ قریب تھا کہ پورا حکومتی نظام کالعدم ہو جائے۔ یہاں تک کہ المامون، پیش قدمی کر کے خراسان سے بغداد پہنچا اور علی الرضا کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے اپنے خاندانی شخص کو ولی عہد نامزد کیا۔

ابن خلدون نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ خلفاء راشدین ایسے زمانہ میں تھے جب کہ ملوکیت کا مزاج ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور معاشرہ پر دینی محرک اور رجحان کا غلبہ تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے اندرونی محرک کے تحت صرف ایسے ہی فرد کو خلافت کی ذمہ داری سونپی جو دینی اعتبار سے قابل قبول تھا اور اس کو دوسرے کے اوپر ترجیح دی۔ اس کے علاوہ

دوسرے افراد جن کی نگاہیں خلافت کی طرف اٹھ رہی تھیں انھیں ان کے اپنے رجحان اور محرک کے حوالہ کر دیا۔

تاہم اس کے بعد حضرت معاویہ کے زمانہ سے عصبیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اقتدار پر اسی مزاج کا تسلط ہو گیا۔ دینی رجحان کمزور پڑ گیا۔ اس کی جگہ ملوکیت اور گروہی رجحان کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا۔ چنانچہ اگر ایسے شخص کو اقتدار سونپا جائے جو گروہی عصبیت کے اعتبار سے ناقابل قبول ہو تو اس کو رد کر دیا جاتا، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حکومت انتشار کا شکار ہو جاتی اور جماعت میں اختلاف پڑ جاتا۔ جیسا کہ بعد کے زمانہ میں پیش آیا۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۲۱۱)

دور اول کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ملت میں اتحاد کس طرح آتا ہے، اور کن اسباب سے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہے، ابن خلدون کے الفاظ میں، وازع دینی کا ہونا یا نہ ہونا۔ گویا اتحاد کبھی اتحاد کی اپیلیں کرنے سے نہیں آتا۔ بلکہ اس وقت آتا ہے جب کہ پورے معاشرہ میں اس کے موافق غالب دینی رجحان موجود ہو۔

اتحاد ملت کا کام دراصل اصلاح ملت سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معاشرہ میں دینی فضا پیدا کی جائے۔ لوگوں کو اس اعتبار سے باشعور بنایا جائے کہ انھیں آخرت میں اپنے قول و عمل کا حساب اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔ لوگوں میں گہری آخرت پسندی پیدا کی جائے تاکہ وہ آخرت کے فائدے کے لئے دنیوی نقصان کو برداشت کر سکیں۔ لوگوں کو اسلام کے بارہ میں اس حد تک ایجوکیٹ کیا جائے کہ جب خدا اور رسول کا حکم سامنے آجائے تو وہ اپنی گردن جھکا دیں، خواہ وہ ان کے ذوق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں یہ مزاج ہو کہ اللہ کی خاطر وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو جائیں۔

کسی گروہ میں اتحاد پیدا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اتحاد ہمیشہ زیر اتحاد افراد کی قربانیوں سے قائم ہوتا ہے۔ رائے کی قربانی، مفادات کی قربانی، اپنے کو پیچھے کر لینے کی قربانی، اپنے اختلاف کو ختم کرنے کی قربانی۔ الفاظ رکھتے ہوئے چپ ہو جانے کی قربانی۔ اس لئے پہلے ذہن بنایا جاتا ہے، اس کے بعد اتحاد قائم ہوتا ہے۔

مقام کیسے ملا

حمزہ بن عبد المطلب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ ان کے متعلق اسلامی تاریخ میں لکھا گیا کہ حمزہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے ذریعہ اللہ نے دین کو طاقت دی (کان حمزۃ ممن أعز اللہ بہ الدین)، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، الجلد الاول، صفحہ ۴۴۶) حضرت حمزہ کو یہ مقام بلا سبب نہیں مل گیا۔ بلکہ وہ ان کے حقیقی عمل کے نتیجہ میں انھیں حاصل ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حکم ہوا کہ اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو آگاہ کرو (الشعراء ۲۱۴) تو آپ نے خصوصی طور پر حمزہ کے سامنے دین توحید کو پیش کیا۔ مگر ان کے ذہن پر باپ دادا کے دین کا اتنا غلبہ تھا کہ ابتداء میں کئی سال تک اسلام کی صداقت ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ آخر کار نبوت کے چھٹے سال انھوں نے اسلام قبول کیا۔

ایک روز وہ شکار کھیل کر واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ عین اس وقت ایک عورت نے آکر ان سے کہا کہ ابھی میں نے صفا پہاڑی کے پاس محمد کو دیکھا ہے۔ وہاں عمرو بن ہشام (ابوجہل) بھی تھا اور وہ تمہارے بھتیجے کو گالی دے رہا تھا اور بہت زیادہ برا کہہ رہا تھا۔ حمزہ خاندانی غیرت کے تحت گھر سے نکلے۔ کعبہ میں انھوں نے ابوجہل کو پالیا۔ وہ ابھی تک غصہ میں تھے۔ انھوں نے لوہے کی کمان ابوجہل کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون نکل آیا۔ انھوں نے ابوجہل سے کہا کہ تم میرے بھتیجے کے دشمن بنے ہوئے ہو، تو سن لو کہ میرا دین بھی وہی ہے جو محمد کا دین ہے (دینی دین محمد) ابوجہل کا تعلق قبیلہ بنو مخزوم سے تھا اور حمزہ کا تعلق قبیلہ بنو ہاشم سے۔

گھر واپس آئے تو قوم کے کچھ لوگ ان سے ملے۔ انھوں نے حمزہ کو شرم دلائی کہ تم صابی (بددین) ہو گئے۔ تم نے اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دیا۔ ایک بھتیجے کی خاطر تم قوم کے تمام اکابر سے کٹ گئے وغیرہ۔ اس طرح کی باتوں سے حمزہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں شبہ ہونے لگا کہ شاید میں نے خاندانی حمایت کے جوش میں آکر غلطی کر دی ہے۔ وہ رات بھر بے چین رہے۔ انھیں ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوئی تو اسی بے چینی کے عالم میں خانہ کعبہ میں گئے۔ وہاں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے پورے تضرع اور انابت کے ساتھ دعا کی:

ما صنعتُ اللّٰھم اِن کانَ رُشداً فاجعلْ تصدیقہ فی قلبی وَ اِلاّ فاجعل لِی مما وقعتُ فیہ مَخرجاً (صفحہ ۴۴۶)	میں نے جو کچھ کیا، اے اللہ اگر وہ ہدایت ہے تو اس کی تصدیق میرے دل میں ڈال دے۔ ورنہ میں جس میں پڑ گیا ہوں اس سے میرے لئے نکلنے کی صورت پیدا فرما۔

اسی کے ساتھ اگلے دن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں ایک معاملہ میں پڑ گیا ہوں۔ اور اس سے نکلنے کی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی ہے۔ اس لئے آپ اس معاملہ میں مجھے بتائیے۔ اے بھتیجے میں تم سے اس معاملہ میں سننا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے ان کو نصیحت کی۔ انھیں خوف دلایا اور ان کو اللہ کے انعام کی خوش خبری دی۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے دل میں یقین ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں۔ اے میرے بھتیجے، اپنے دین کا اعلان عام کرو۔ خدا کی قسم، اگر مجھے وہ سب کچھ دیا جائے جس پر آسمان نے سایہ کیا ہے، تب بھی میں اس دین کو نہیں چھوڑوں گا (صفحہ ۴۴۶)

اس کے بعد حضرت حمزہ آپ کے مکمل ساتھی بن گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ ایک دولت مند شخص تھے۔ اسلام میں آنے کے بعد ان کی دولت ختم ہوگئی۔ انھیں اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ اسلام کی خاطر انھیں اپنی قوم سے لڑائی لڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ احد کی جنگ میں وہ شہید ہو گئے۔ تاہم آخر تک وہ پوری وفاداری کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے۔

یہ وہ عظیم سعادت ہے جو حضرت حمزہ کو حاصل ہوئی۔ تاہم یہ سعادت انھیں سادہ طور پر نہیں مل گئی۔ انھوں نے اپنے غیرت کے جذبات کو خدا کے دین کے لئے استعمال کیا۔ جب شیطان نے ان کے اندر شبہ ڈالا تو انھوں نے اس شبہ کو قبول نہیں کر لیا، بلکہ اس کے لئے گریۂ و زاری کے ساتھ دعائیں کیں۔ رسول اللہؐ سے مل کر اس کی وضاحت معلوم کی۔ اور جب بات واضح ہوگئی تو پھر کوئی چیز ان کے لئے اعتراف میں مانع نہیں ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا بلکہ ہر نقصان اور مصیبت کو برداشت کرتے ہوئے برابر اس پر قائم رہے۔

یہ ہے حضرت حمزہ کی وہ قربانی جس کے نتیجہ میں ساری دنیا کے مسلمان ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں "سید الشہداء حمزہ" کہہ کر ان کی دینی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

جواں مردی یا مردانگی سے عربوں کی کیا مراد ہوتی تھی، اس کو قدیم عربی اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے جس کو عہد جاہلی کا کلام کہا جاتا ہے۔ اس جاہلی کلام کا ایک منتخب مجموعہ وہ ہے جو "الحماسۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہم حماسہ سے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔

اذا ھَمَّ ھمًّا لم یرِ اللیل غُمَّۃً ۔۔۔ علیہ ولم تصعب علیہ المراکب

قلیل التشکی للمھمّ یصیبہ ۔۔۔ کثیر الھوی شتّی النوی والمسالک

اذا المرء لم یدنس من اللؤم عرضہ ۔۔۔ فکل رداء یرتدیہ جمیل

یسرّک مظلومًا ویرضیک ظالمًا ۔۔۔ وکلّ الذی حمّلتہ فھو فاعلہ

اذا ھمَّ لم تردع عزیمۃ ھمّہ ۔۔۔ ولم یأت ما یأتی من الامر ھائبا

لا مترفا ان رخی العیش ساعدہ ۔۔۔ ولا اذا حل مکروہ بہ خشعا

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم ۔۔۔ فی النائبات علی ما قال برھانا

فذالک قریع الدھر ما عاش حوّل ۔۔۔ اذا سُدّ منہ منخر جاش منخر

ترجمہ

جب وہ کسی بات کا ارادہ کرلیتا ہے تو رات اس کو غم گین نہیں کرتی اور نہ سواری پر چلنا اس کے لیے مشکل ہوتا۔
سخت معاملہ پیش آنے پر وہ شکایت نہیں کرتا۔ وہ بہت باحوصلہ ہے۔ اور بہت منزلوں اور بہت راستوں والا ہے۔
جب آدمی کی آبرو ملامت زدہ بات سے گندی نہ ہوئی ہو تو وہ جو چادر بھی اوڑھے وہ اس کے لیے اچھی ہے۔
وہ تم کو مظلومی میں خوش کردے گا اور تم ظالم ہو تو تم کو راضی کرے گا۔ اور تم جو ذمہ داری بھی اس پر ڈالو اس کو وہ ضرور کرے گا۔
جب وہ ارادہ کرلے تو اس کے پختہ ارادہ سے اس کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔ اور آنے والی چیزوں میں سے کوئی چیز اس کو خوف زدہ نہیں کرتی۔
اگر اس کو زندگی کی آسودگی ملے تو وہ عیش پرست نہیں بنتا، اور اگر اس کو تنگی پیش آجائے تو وہ پست ہمت نہیں ہوتا۔
ان کا بھائی کسی مصیبت پر ان کو پکارے تو وہ اس سے دلیل نہیں پوچھتے بلکہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں۔
یہی انتخاب زمانہ شخص ہے، وہ جب تک جیتا ہے متحرک رہتا ہے، اس پر ایک راستہ بند ہوتا ہے تو وہ دوسرے راستہ میں چل پڑتا ہے۔

انقلابی فیصلہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب قرآن جمع کیا گیا تو آپ نے حکم دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی لکھا ہوا حصہ ہو، وہ اس کو لے آئے۔ چنانچہ ایک بڑا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت زید بن ثابت انصاریؓ نے دوسرے حافظوں کی مدد سے قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں تحریر کیا۔

زید بن ثابتؓ کا یہ مصحف قریش کے لہجہ پر تھا، جب کہ جمع شدہ ٹکڑوں میں کوئی ٹکڑا قریش کے لہجہ پر تھا اور کوئی دوسرے قبائل کے لہجہ پر۔ مذکورہ قرآن جب مرتب ہو گیا تو صحابہ کی متفقہ رائے کے مطابق، تمام بچے ہوئے ٹکڑے جلا دیئے گیے۔ یہی واقعہ دوبارہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا جب کہ مصحف صدیقی کے مطابق نسخے تیار کیے گیے، اور بقیہ لوگوں کے بطور خود لکھے ہوئے تمام مصحف صحابہ کی رائے سے جلا کر ختم کر دیے گیے۔

وہ لوگ جو کبھی پتھروں کے تقدس کے قائل تھے، ان کے لیے کلامِ الٰہی کی تختیوں کو نذر آتش کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم الشان انقلابی فیصلہ تھا جو حقائق کے اعلیٰ شعور کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب رسول جو مختلف عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے، فطری طور پر انھوں نے اپنے اپنے لہجہ پر قرآن کی آیتیں لکھ رکھی تھیں۔ اگر ان کے لکھے ہوئے یہ مختلف اوراق اور ٹکڑے جلائے نہ جاتے تو بعد کو ہر ٹکڑا ایک مستقل فتنہ بن جاتا۔ کیوں کہ ہر ٹکڑا اور ہر ورق کسی صحابی کی طرف منسوب ہو کر مقدس بن جاتا۔ اس کے بعد قرآن کے متن کے بارہ میں اتنا اختلاف پیدا ہوتا کہ نہ قرآن محفوظ رہتا اور نہ امت مسلمہ۔

ان ٹکڑوں کو اگر زمین میں گاڑ دیا جاتا یا دریا میں ڈال دیا جاتا تب بھی لوگ کسی نہ کسی طرح ان کو حاصل کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلانے کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر ان کو ختم کرنے کی نہ تھی۔

اس انقلابی فیصلہ تک پہونچنے کے لیے وہ برتر فکر درکار تھی جو جذباتی احترام سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے تقاضوں کو دیکھ لیتی ہے۔ اصحاب رسول کو ان کے ایمان نے یہی انقلابی فکر عطا کی تھی۔ اور یہی انقلابی فکر ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ کے مقام پر کھڑا کرتی ہے۔

یہ حاملینِ اسلام

صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسی سال کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ انھیں میں سے ایک خط وہ تھا جو دحیہ کلبی کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل (Heraclius) کے نام بھیجا گیا۔ یہ مسیحی تھا اور نہایت ذہین اور حقیقت پسند آدمی تھا ہرقل اُس وقت فلسطین میں تھا۔ اس زمانہ میں عرب کے لوگ تجارت کی غرض سے اس علاقہ میں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہرقل نے تحقیق حال کے لیے کچھ عربوں کو بلوایا جن میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ہرقل نے ترجمان کے ذریعہ ان سے گفتگو کی۔ ایک روایت کے مطابق، گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال اخبرنی یا اباسفیان۔ فقال ھو ساحر کذاب ولیس بنبی۔ فقال ھرقل انی لا اُرید شتمہ ولکن کیف نسبہ فیکم ... کیف عقلہ ورأیہ

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۳)

ہرقل نے کہا کہ اے ابوسفیان مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کہ وہ جادوگر اور جھوٹے ہیں، وہ پیغمبر نہیں۔ ہرقل نے کہا میں تم سے ان کی سب و شتم سننا نہیں چاہتا۔ بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا حسب و نسب کیا ہے، ان کی سمجھ کیسی ہے اور ان کی رائے کیسی ہے۔

ہرقل ایک "کافر" تھا۔ وہ کافر ہی رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اُس کو اِس سے دلچسپی نہیں تھی کہ کوئی شخص اُس کے حریف کے بارہ میں برے الفاظ بولے اور وہ اس کو سن کر خوش ہو۔ بلکہ اُس کی دلچسپی اس میں تھی کہ وہ جانے کہ جو شخص اس کا حریف بن کر ابھرا ہے، وہ خاندانی شرافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کیسا ہے، وہ صاحب رائے ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ حاملین اسلام کو دیکھئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کے خلاف کوئی بھی لغویات سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی کمینہ آدمی اگر ان کے مفروضہ حریف کے خلاف جھوٹے مضامین شائع کرے تو اس کو روکنا تو درکنار، وہ اس کو لطف لے کر پڑھیں گے اور ان کے معتقدین اُس کو ہر طرف پھیلائیں گے ـــــ کیسے عجیب ہیں وہ حاملینِ اسلام جو حاملین کفر کے اخلاقی معیار پر بھی پورے نہ اتریں۔

خوف خدا

عمر بن عبد العزیز بن مروان بن الحکم الاموی (۱۰۱-۶۱ ھ) کا درجہ اسلام میں اتنا بڑا ہے کہ ان کو پانچویں خلیفہ راشد (خامس الخلفاء الراشدین) کہا جاتا ہے۔ ان کی مدت خلافت ڈھائی سال ہے۔ ان کے حالات پر کئی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

ابن الجوزی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد اللہ بن الحکیم	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد الرؤف المناوی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
احمد زکی صفوت	عمر بن عبد العزیز
عبد العزیز سید الاہل	الخلیفۃ الزاہد

اموی خلفاء میں وہ واحد خلیفہ ہیں جن کا اعتراف ان کے بعد عباسیوں نے کیا۔ شیعہ حضرات کے درمیان بھی ان کا احترام پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی ان کا غیر معمولی اعتراف کیا گیا۔ محمد بن معبد کہتے ہیں کہ میں شاہ روم کے یہاں گیا تو اس کو مغموم حالت میں زمین پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے کہا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ کتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حادثہ۔ اس نے کہا کہ مرد صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون۔ شاہ روم نے کہا کہ عمر بن عبد العزیز۔ میرا خیال ہے کہ عیسٰی بن مریم کے بعد اگر کوئی شخص مردہ کو زندہ کرنے والا ہوتا تو یقیناً وہ عمر بن عبد العزیز ہوتے۔ ایک مسیحی راہب کو لوگوں نے روتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ زمین پر ایک نور تھا، مگر اب وہ نور نہیں رہا

عمر بن عبد العزیز کی موت کے بعد کچھ لوگ ان کی اہلیہ کے پاس گئے اور کہا کہ ان کی کوئی خاص بات بتائیے۔ اہلیہ نے کہا کہ خدا کی قسم، عمر نماز اور روزہ میں تم سے زیادہ نہ تھے۔ مگر خدا کی قسم، میں نے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا جو عمر سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو (واللہ ما کان عمر باکثرکم صلاۃ ولا صیاماً ولکنی واللہ ما رأیت عبداً للہ قط کان اشد خوفاً للہ من عمر)

قدردانی

قرآن کی سورہ محمد (آیت ۲۴) میں کہا گیا ہے کہ کیا یہ منافقین قرآن پر تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں تفسیروں میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے :

عَنْ هشام بن عُروة عَنْ اَبيهِ، قَالَ تلا رَسُولُ اللّٰه صلى اللّٰهُ عليه وسلم يومًا (أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها) فقال شابٌ من أهل اليمن بل عليها أقفالها حتى يكون اللّٰه تعالى يفتحها أو يفرجها۔ فما زال الشاب في نفس عمر حتى ولي فاستعان به

(تفسیر ابن کثیر ۴/۱۸۰)

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز یہ آیت تلاوت فرمائی (کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے ہیں) یہ سن کر یمن کے ایک نوجوان نے کہا ہاں، ان کے دلوں پر تالے ہیں، یہاں تک کہ خدا ہی ان تالوں کو کھول دے۔ اس نوجوان کی یاد برابر حضرت عمرؓ کے دل میں رہی یہاں تک کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس سے حکومت کے کام میں مدد لی۔

اسی صفت کا نام قدردانی ہے۔ کسی قوم یا کسی حکومت کا نظام اچھا رہنے کی ایک ضمانت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار لوگ افراد کی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ان کی قدردانی کریں، وہ ایسے افراد کو ان کی صلاحیت کی نسبت سے کام کے مواقع فراہم کریں۔ ایسے کسی فرد کو وہ جہاں پائیں اس کو اس طرح اٹھالیں جس طرح ایک جوہری راکھ میں پڑے ہوئے سونے کے ٹکڑے کو اٹھالیتا ہے۔

اس کے برعکس جب ذمہ دار لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ افراد کو اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ میرا رشتہ دار ہے یا اجنبی ہے۔ وہ میری تعریف کرتا ہے یا میرا ناقد ہے۔ وہ میرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا میرے گروہ سے باہر کا آدمی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے رکھتا ہے یا کسی معاملہ میں اس کی رائے مجھ سے مختلف ہے۔

کسی قوم یا کسی حکومتی نظام میں اول الذکر صفت والے اشخاص کا اختیار کے مناصب پر ہونا اس قوم یا حکومت کی ترقی کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس قوم یا حکومتی نظام میں ثانی الذکر صفت والے اشخاص اختیار کے مناصب پر قابض ہو جائیں، اس کو کوئی چیز تباہی اور بربادی سے بچانے والی نہیں۔

یہود کے نقش قدم پر

حضرت سلیمان بن داؤد (۹۳۰-۹۹۰ ق م) کا زمانہ یہود کی تاریخ میں سب سے زیادہ باعظمت زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں فلسطین اور اطراف کے علاقوں میں ان کی مضبوط اور شاندار سلطنت قائم تھی۔ حضرت سلیمان کے بعد یہودیوں میں دینی اور اخلاقی زوال شروع ہوا۔ وہ خدا سے بے خوف ہو کر سطحی اعمال میں مبتلا ہو گئے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

اس زمانہ میں یہود کے مصلحین اور انبیاء نے ان کو زبردست تنبیہات کیں جو آج بھی کثرت سے بائبل میں موجود ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ایک جزء نقل کیا جاتا ہے:

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں ان پر تلوار اور کال اور وبا بھیجوں گا اور ان کو خراب انجیروں کی مانند بناؤں گا جو ایسے خراب ہیں کہ کھانے کے قابل نہیں۔ اور میں تلوار اور کال اور وبا سے ان کا پیچھا کروں گا اور میں ان کو زمین کی سب سلطنتوں کے حوالے کروں گا کہ دھکے کھاتے پھریں اور ستائے جائیں اور سب قوموں کے درمیان جن میں میں نے ان کو ہانک دیا ہے لعنت اور حیرت اور سسکار اور ملامت کا باعث ہوں۔ اس لئے کہ انھوں نے میری باتیں نہیں سنیں۔ خداوند فرماتا ہے کہ جب میں نے اپنے خدمت گزار نبیوں کو ان کے پاس بھیجا، ہاں میں نے ان کو بروقت بھیجا، پر تم نے نہ سنا (یرمیاہ ۲۹: ۱۸)

اس بگاڑ اور اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سلطنت ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک، یہودیہ جو جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقہ میں تھی، اس کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ دوسرے، اسرائیل جو شمالی فلسطین اور شرق اردن کے علاقہ میں قائم ہوئی، اس کا پایہ تخت سامریہ قرار پایا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی قائم کی ہوئی عظیم ریاست ٹکڑے ٹکڑے ہو کر صرف دو کمزور حکومتوں کی صورت میں باقی رہ گئی۔

یہودیوں کے اخلاقی زوال اور باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اطراف کی سلطنتوں نے ان پر حملے شروع کر دئے۔ ۷۲۱ ق م میں اشور (Assyrian) کے حکمراں سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بنو کد نضر (Nebuchadnezzar) نے یروشلم کو مسخر کر کے سلطنت یہودیہ پر قبضہ کر لیا۔

خدا کے خاص لوگوں کے اوپر غیر قوم کا قبضہ یہود کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان کے اندر شدت سے مخالفانہ جذبات جاگ اٹھے۔ ان کے درمیان وہ قومی رہنما ابھرے جن کو بائبل میں "جھوٹے نبی"، یا "جھوٹی نبوت کرنے والے لوگ" کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ دینی الفاظ بولتے تھے۔ مگر حقیقۃً جو چیز ان کی رہنما تھی وہ صرف ان کے اپنے رومانی تخیلات تھے جو اسرائیل کی عظمت رفتہ کو جلد از جلد واپس لانے کے لئے وقت کے حالات کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نبوت کی زبان میں کلام کرتے تھے مگر حقیقۃً وہ جھوٹے نبی تھے۔ بائبل کے الفاظ میں وہ خدا کے نام پر اپنی بات کہتے تھے۔ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے (یرمیاہ ۲۸: ۱۵، ۲۹: ۳۱) ان رہنماؤں کی جذباتی باتوں کے زیر اثر یہودیوں میں آزادی اور احیار نو کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ وہ بابل کی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے دوبارہ اپنی گزری ہوئی عظمت کو واپس لانے کا خواب دیکھنے لگے۔

اس موقع پر ان کے نبی حضرت یرمیاہ اٹھے اور یہودیوں سے کہا کہ تم کو دوسروں کے خلاف مہم چلانے سے پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔ غیر قوم کا غلبہ تمہارے اوپر خدا کے حکم سے ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ تم خدا کے راستہ سے ہٹ گئے ہو۔ اب اپنے آپ کو خدا کی طرف واپس لاکر ہی تم اس مغلوبیت سے نجات پا سکتے ہو نہ کہ محض دنیوی قسم کی کارروائیاں کرکے۔ اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے خدا کی یہ تنبیہات بائبل کی کتاب یرمیاہ (باب ۲۷-۳۰) میں موجود ہیں۔ چند فقرے یہ ہیں:

تم اپنے (جھوٹے) نبیوں اور غیب دانوں اور خواب بینوں اور شگونیوں اور جادوگروں کی نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت گزاری نہ کروگے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں تاکہ تم کو تمھارے ملک سے آوارہ کریں اور میں تم کو خارج کردوں اور تم ہلاک ہو جاؤ (۲۷: ۹-۱۰) تم اپنی گردن شاہ بابل کے جوئے تلے رکھ کر اس کی اور اس کی قوم کی خدمت کرو اور زندہ رہو (۲۷: ۱۲) اور ان نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت نہ کروگے کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں نے ان کو نہیں بھیجا۔ پر وہ میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ تاکہ میں تم کو خارج کردوں اور تم ان نبیوں کے ساتھ جو تم سے نبوت کرتے ہیں ہلاک ہو جاؤ۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اپنے نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے نبوت کرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو خداوند کے گھر کے ظروف اب تھوڑی ہی دیر میں بابل سے واپس آجائیں گے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ ان کی نہ سنو، شاہ بابل کی خدمت گزاری کرو اور زندہ رہو۔ پر اگر وہ نبی ہیں اور خداوند کا کلام ان کی امانت میں ہے تو وہ رب الافواج

سے شفاعت کریں تاکہ وہ ظروف جو خداوند کے گھر میں اور شاہ یہوداہ کے گھر میں اور یروشلم میں باقی ہیں بابل کو نہ جائیں (۲۷ : ۱۸-۱۴) رب الافواج اسرائیل کا خدا ان سب اسیروں سے جن کو میں نے یروشلم سے اسیر کرواکر بابل بھیجا ہے یوں فرماتا ہے، تم گھر بناؤ اور ان میں بسو اور باغ لگاؤ اور ان کا پھل کھاؤ۔ بیویاں کرو تاکہ تم سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں، اور اپنے بیٹوں کے لئے بیویاں لو اور اپنی بیٹیاں شوہروں کو دو تاکہ ان سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں اور تم وہاں پھلو پھولو اور کم نہ ہو۔ اور اس شہر کی خیر مناؤ جس میں میں نے تم کو اسیر کرواکر بھیجا ہے اور اس کے لئے خداوند سے دعا کرو۔ کیونکہ اس کی سلامتی میں تمہاری سلامتی ہوگی۔ کیونکہ رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ وہ نبی جو تمہارے درمیان ہیں اور تمہارے غیب داں تم کو گمراہ نہ کریں اور اپنے خواب بینوں کو جو تمہارے ہی کہنے سے خواب دیکھتے ہیں نہ مانو۔ کیونکہ وہ میرا نام لے کر تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو نہیں بھیجا (۲۹ : ۹-۵)

حضرت یرمیاہ کی ان باتوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہود غیر قوموں کی غلامی پر ہمیشہ کے لئے راضی ہو جائیں۔ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ تم اپنی موجودہ کمزوریوں کے ساتھ حکومت کے خلاف تحریکیں چلا کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تمہاری جن کمزوریوں نے غیر قوم کو تمہارے اوپر غلبہ دیا ہے ان کو ختم کئے بغیر کس طرح یہ ممکن ہے کہ تم دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن حاصل کرلو۔ اس لئے ان کا کہنا تھا کہ تم بغاوت کی مہم چلانے سے پہلے اصلاح کی مہم چلاؤ۔ چنانچہ انھوں نے "شاہ بابل کا جوا" قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہود کو یہ بشارت بھی دی کہ اگر تم خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلو تو رب الافواج فرماتا ہے کہ میں اس کا جوا تیری گردن پر سے توڑ دوں گا اور تیرے بندھنوں کو کھول ڈالوں گا اور بیگانے پھر تجھ سے خدمت نہ کرائیں گے۔ اس لئے اے اسرائیل گھبرا نہ جا کیونکہ دیکھ میں تیری اولاد کو اسیری کی سرزمین سے چھڑاؤں گا اور یعقوب واپس آئے گا اور کوئی اسے نہ ڈرائے گا (۳۰ : ۹-۸)

مگر یہود نے اپنے نبی کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ ان جھوٹے رہنماؤں کی باتیں سنتے رہے جو ان کو الفاظ کی جذباتی شراب پلا رہے تھے۔ جو ان کو معمولی عمل سے بڑے بڑے نتائج کی فرضی امیدیں دلاتے تھے۔ جو نفرت اور ٹکراؤ جیسی فتنہ انگیز باتیں کرتے تھے (یرمیاہ ۲۸ : ۱۶) اس حماقت (۲۹ : ۲۳) کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ بابل بنوکد نضر ان کے اوپر غضب ناک ہوا اور ۵۸۷ ق م میں دوبارہ ان کے اوپر شدید تر حملہ کیا۔ اس کے بعد اس نے یہودیہ کی تمام آبادیوں کو ویران کر کے رکھ دیا۔ بے شمار یہودیوں کو قتل کیا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح برباد کیا کہ بائبل کے الفاظ میں اس کی ایک اینٹ بھی دوسری اینٹ کے اوپر باقی نہ رہی۔

سابق حاملین کتاب (یہود) کی یہ تاریخ موجودہ حاملین کتاب (مسلمان) پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ مسلمان پچھلے ہزار برس تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ کمزوریوں کا شکار ہوئے۔ ان کے افراد میں اعلیٰ کردار باقی نہ رہا۔ وہ محنت کے بجائے عیش کے عادی ہو گئے۔ باہمی اختلافات نے ان کو بے شمار گروہوں میں بانٹ دیا۔ علم اور تہذیب کی ترقی میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ اس قسم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر غیر مسلم قومیں ان کے اوپر غالب آگئیں۔ مسلمانوں کی عظمت ہر جگہ پامال کر کے رکھ دی گئی۔

یہ واقعہ انیسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ بیسویں صدی عیسوی اس صورت حال کے خلاف جدوجہد کی صدی ہے۔ مگر یہاں بھی عملاً وہی ہوا جو ڈھائی ہزار سال پہلے یہود کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اب کچھ اللہ کے بندے اٹھے جنھوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ پہلے اپنے آپ کو مستحکم بناؤ۔ غالب قوتوں سے تصادم کے بغیر اصلاحی میدان میں اپنی کوششیں صرف کرو جواب بھی تمھارے لئے کھلا ہوا ہے۔ مگر مسلمانوں نے ایسے مصلحین کی بات بالکل نہیں سنی۔ ان کو انھوں نے بزدل، سامراج کا ایجنٹ اور انقلاب اسلام کا دشمن قرار دیا۔

دوسری طرف بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ اٹھے جو جہاد اور انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔ انھوں نے جذباتی تقریریں کیں۔ رومانی اشعار سنائے۔ خوبصورت نظرئے پیش کئے۔ مبالغہ آمیز قسم کی امیدیں دلائیں۔ مسلمان ایسے لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ ہر جگہ دوسری قوموں کے خلاف سیاسی ٹکراؤ اور انقلابی جہاد میں مشغول ہو گئے۔

بائبل کے الفاظ میں اس "جھوٹی نبوت" کا نتیجہ وہی ہوا جو یہودیوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہر محاذ پر شکست کھائی۔ ان کی بڑی بڑی تحریکیں اس طرح فنا ہو گئیں جیسے وہ ایک تنکا تھا جو ہواؤں کے طوفان میں اڑ گیا۔ ان کے مفکروں اور رہنماؤں کے بولے ہوئے شاندار الفاظ کاغذ کی کشتی ثابت ہوئے جو دریا کی موجوں میں ایک منٹ بھی کسی مسافر کے کام نہیں آتی۔

ان مسلم رہنماؤں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے۔ وہ حق کے ترجمان نہ تھے بلکہ عوامی جذبات کے ترجمان تھے۔ اور جو لوگ اس قسم کی بے حقیقت چیزوں کے اوپر کھڑے ہوں ان کا انجام حقیقت کی اس دنیا میں وہی ہے جو ان رہنماؤں کا ہوا۔

اوپر جس حقیقت کا ذکر کیا گیا، وہ کوئی انوکھی یا غیر معلوم بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ اور دینی تعلیمات میں بالکل واضح ہے۔ اس کے باوجود ہمارے رہنما اور مفکرین کیوں اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ردعمل کی نفسیات نے لوگوں کا ذہنی شاکلہ بگاڑ دیا ہے، اور آدمی کسی بات کو اپنے ذہنی شاکلہ ہی کے مطابق سمجھ پاتا ہے۔ اگر آدمی کا ذہنی شاکلہ مختلف ہو تو وہ کسی طرح اصل بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ہم اس کی ایک مثال پیش کریں گے۔

ایک مشہور مفکر اسلام نے سورہ بنی اسرائیل (آیت ۵) کی تفسیر کے تحت ایک لمبا نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ یہود کے بگاڑ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔"

اوپر کے اقتباس کے آخری جملہ پر غور کیجئے۔ موصوف کے الفاظ کے مطابق یہ بداعمالی کی ایک قسم ہے کہ غالب حکومت کے خلاف سیاسی جہاد کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کی جائے۔ گویا انھوں نے ہماری مذکورہ بات کی صداقت کو مزید شدید تر الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے۔ مگر یہی وہ مصنف اور مفکر ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں اس نظریہ کی پرزور وکالت کی کہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے نیا دور لانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ حکمرانوں سے تصادم کر کے ان کو تخت سے بے دخل کیا جائے اور خود اپنی طویل عمر کے تمام بہترین سال انھوں نے اسی قسم کے سیاسی جہاد میں گزار دئے۔

حقیقت کے اس قدر قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے اس قدر بے خبر رہنے کی وجہ صرف شاکلہ کا فرق ہے۔ آدمی ایک آیت کے مطالعہ کے ذیل میں تاریخ انبیاء کے مذکورہ واقعہ کو پڑھتا ہے۔ وہ اس کے علم میں آتی ہے۔ مگر چونکہ اس کا ذہنی شاکلہ مختلف ہے اس لئے یہ حقیقت اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی، وہ اس کی فکر کی تشکیل میں مؤثر ثابت نہیں ہوتی ــــــ ہدایت کے راستہ کو پانے کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے مصنوعی شاکلہ کو توڑے اور فطرت کے حقیقی شاکلہ کے مطابق چیزوں کو دیکھے۔ اس کے بغیر کوئی شخص ہدایت کے ابدی راستہ کو نہیں پا سکتا۔

اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے

قرآن کی دو سورتوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے :

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ (توبہ ۳۳، صف ۹)

اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو ہر دین سے اوپر کر دے خواہ شرک کرنے والوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت میں ہدایت کی تفسیر قرآن سے کی گئی ہے اور دین حق کی اسلام سے۔ اور اظہار سے مراد حجت و بیان کے اعتبار سے اس کو سب پر فائق کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے اپنا جو آخری دین اتارا ہے وہ کلی صداقت کا حامل ہے۔ اس کے لئے مقدر ہے کہ وہ ہر دوسرے دین کے مقابلہ میں بالا و برتر ثابت ہو، ہر دوسرا دین اس کے سامنے بے اصل ہو کر رہ جائے۔ اظہار اسلام سے مراد تقریباً اسی قسم کا ایک نظریاتی غلبہ ہے جو موجودہ زمانہ میں جمہوری طرز فکر کو بادشاہی طرز فکر پر اجتماعی ملکیت کے نظریہ کو انفرادی ملکیت کے نظریہ پر اور طبیعی علوم (سائنس) کو فلسفیانہ علوم پر حاصل ہوا ہے۔

قرآن کا یہ بیان دور اول میں مکمل طور پر واقعہ بن چکا ہے۔ اسلام کے ظہور نے دوسرے تمام مذاہب پر سایہ ڈال دیا۔ اس وقت جو ادیان رائج تھے ـــــ بت پرستی، پارسیت، یہودیت، عیسائیت، سب کے سب خود اپنے پیروؤں کی نظر میں اس طرح بے وزن ہو گئے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئی۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک کو آج مسلم ممالک کہا جاتا ہے، وہ سب نزول قرآن کے وقت غیر مسلم قوموں کی آبادیاں تھیں۔ مگر اسلام کے برتر فکر نے ان کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ اپنے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام کے سایہ میں آگئیں۔

اسلام کی یہ برتری موجودہ زمانہ میں واقعہ نہ بن سکی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اس کو برتر بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ہماری تحریکیں زیادہ تر دوسروں سے سیاسی زور آزمائی میں مصروف رہیں۔ انھوں نے دوسروں کے اوپر اسلام کے فکری اظہار کی جدوجہد نہ کی۔ یہ جدوجہد اگر آج سے ہونے لگے تو آج ہی سے اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے۔

ایک شخص نماز کے لئے مسجد روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا، یہاں تک کہ جماعت کی نماز ختم ہو گئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کو اسلام کی مثبت دعوت کے لئے اٹھنا تھا۔ مگر وہ بعض سیاسی شکایات سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں سے قلمی اور لسانی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گئے۔ انھیں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام کی نئی تشریح کر کے سیاسی زور آزمائی ہی کو عین اسلام قرار دے دیا۔ اب ہر ایک سیاست کے کاروبار میں مشغول ہے۔ دین کے مثبت پیغام کو لے کر اٹھنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

توبہ نے طاقت ور بنا دیا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم موسیٰ کے مقابلہ میں غالب رہے تو ہم کو اس کا انعام تو ضرور ملے گا۔ فرعون نے کہا ہاں۔ اس کے بعد جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی مانند نظر آنے لگیں۔ اب حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا۔ آپ کا عصا اژدہا بن کر گھوما تو اس کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں کی ہر لکڑی لکڑی اور ہر رسی رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ نے جو چیز دکھائی ہے وہ جادو نہیں بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ ان کا سینہ حق کے لئے کھل گیا۔ اور انھوں نے اسی وقت ایمان قبول کر لیا۔ فرعون غضب ناک ہو کر بولا: تم لوگ موسیٰ کے مومن بن گئے قبل اس کے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ یہ تم لوگوں کی خفیہ سازش ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور پھر تم سب لوگوں کو سولی پر چڑھادوں گا (اعراف) ——— جادوگروں نے جواب دیا: اس ذات کی قسم جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی روشن نشانیوں کے مقابلہ میں ہم تم کو ترجیح دیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہو کر لو۔ تم صرف اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو اور اللہ زیادہ اچھا ہے اور وہ باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ)

وہی جادوگر جو ابھی فرعون کے سامنے خوشامدی باتیں کر رہے تھے اور اس کے انعام اور اعزاز کے طالب تھے وہی تھوڑی دیر بعد اتنے دلیر اور بلند حوصلہ ہو گئے کہ فرعون کی انھیں کوئی پروا نہ رہی۔ حتیٰ کہ فرعون کی طرف سے سخت ترین سزا کی دھمکی بھی انھیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے جادوگروں کو اچانک پستی سے بلندی اور بزدلی سے بہادری تک پہنچا دیا۔ وہ ایمان کی طاقت تھی۔ انھوں نے انسانوں سے گزر کر خدا کو پا لیا تھا، پھر ان کو انسانوں کا ڈر کیوں ہوتا۔

شہر کے مسلم محلہ کو تخریب کاروں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ مسلمان اپنے گھروں سے نکلے تو تخریب کاروں نے پتھر پھینکنے شروع کئے۔ مسلمانوں نے بھی اس کے جواب میں پتھر پھینکے۔ تخریب کاروں کو جب پتھراؤ سے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو انھوں نے بندوقوں سے فائر کئے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان بھاگے اور اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ اب تخریب کاروں کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر محلہ میں گھس گئے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اب محلہ کے ایک بدنام شخص کو اللہ نے ہمت دی اور اس نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس شخص میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ البتہ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ اپنے

کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیمم کیا اور سجدہ میں گر پڑا۔ سجدہ کی حالت میں اس نے دعا کی: خدایا آج تو ہماری عزت رکھ لے اور ہماری مدد کر۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ اس نے یہ دعا کی اور اس کے بعد پڑوسی کی بندوق لی اور تھیلہ میں کارتوس بھر کر مجمع میں گھس گیا۔ اس نے چن چن کر تخریب کاروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی ہر وقت تخریب کاروں کے نشانہ کی زد پر تھا مگر اس وقت ڈر اس کے دل سے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ تخریب کاروں نے جب دیکھا کہ ان کے بہت سے ساتھی خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں اور "ہائے مار ڈالا" کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے (فاطر ۱۰)
مذکورہ مسلمان کی دعا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس نے جب اپنی دعا کے ساتھ شراب چھوڑنے کا عہد کیا تو اس نے ایک نیک عمل کیا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے اس کی دعا اوپر اٹھ کر فوراً خدا کی بارگاہ میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ جب بھی آدمی اپنی دعا کے ساتھ اس قسم کا کوئی نیک عمل کرے تو اس کی دعا ضرور قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ دعا کے ساتھ اس کے موافق نیک عمل دعا کے معاملہ میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کا ثبوت ہے، اور جب آدمی اپنی مانگ میں سنجیدہ ہو تو اس کی مانگ ضرور پوری کی جاتی ہے۔

اس واقعہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جب آدمی نے یہ کہا کہ "خدایا میں آج سے شراب کو چھوڑتا ہوں تو میری مدد کر" تو اس نے اپنی طاقت کو بڑھایا۔ کیوں کہ اب اس نے خدا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ صرف "خدایا مدد کر" کے الفاظ بولتا تو اس سے اس کے اندر وہ یقین نہ آتا۔ کیوں کہ یہ چھپا ہوا خیال پھر بھی اس کے دل میں باقی رہتا کہ میں خدا کو پکار رہا ہوں حالاں کہ میں خدا کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جب اس نے شراب چھوڑنے کا عزم کیا تو بھرپور طور پر اس کو یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ کیونکہ اب اس نے اپنے اور خدا کے درمیان پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا دیا تھا۔ پہلی صورت میں اس کی مثال اگر چور کی سی تھی تو اب اس کی مثال اس شخص کی سی ہو گئی جس نے سامان کی قیمت اس کے دکان دار کو ادا کر دی ہو۔ اس کی توبہ نے اس کو نڈر بنایا اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ توبہ کے فوراً بعد اس کے اندر سے احساس جرم نکل گیا۔ اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا کہ میں خدا سے دور ہوں۔ اب وہ خدا کی مدد کو اپنے حق میں یقینی سمجھنے لگا۔ اس کے اور خدا کے درمیان جو رکاوٹ تھی جب اس رکاوٹ کو اس نے دور کر دیا تو اندیشوں کے تمام غبار اس کے دل سے ہٹ گئے۔ خدا اس کو اپنا نظر آنے لگا کیوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بنا چکا تھا۔

معیار کی تبدیلی

ہجرت کے دوسرے سال بدر کے مقام پر مسلمانوں میں اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش کی سرداری ابوجہل کو حاصل تھی۔ جنگ سے ایک دن پہلے اس نے خدا سے اپنی فتح کی دعا کی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہو تو کل کے دن اس کو ہلاک کر دے (اللھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ)

ابوجہل کو خدا سے یہ کہنا تھا کہ وہ قریش کو مسلمانوں کے اوپر فتح دے۔ اس کی یہ بات اسی وقت باوزن ہو سکتی تھی جب کہ وہ یہ بھی دکھا سکے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کا گروہ حق پر ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے قطع رحم کو فیصلہ کی بنیاد بنایا۔ کیونکہ اسلام کی دعوت نے قریش کے خاندانوں میں باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔ اس معیار پر جانچنے کی صورت میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اپنا گروہ حق پر ہے اور مسلمانوں کا گروہ باطل پر۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے خدا کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ معیار قائم کیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو چاند پر سے نظر آنا چاہئے۔ جب روس کے راکٹ نے اپنے چاند کے سفر کی رپورٹ میں خدا کا کوئی نشان نہیں بتایا تو خروشچوف نے اعلان کر دیا: خدا کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نظر نہیں آیا۔

یہی غلطی مختلف شکلوں میں خود اسلام میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کون اسلام پر ہے اور کون اسلام پر نہیں ہے۔ اس کا ایک خدائی معیار ہے۔ لیکن اگر آپ اس معیار کو بدل دیں تو آپ کے لئے سارا معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ذاتی معیار کی بنا پر دین کو بے دینی سمجھ لیں گے اور بے دینی کو دین۔

اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ دعوت دین کی بنیاد اکابر کے ملفوظات ہیں تو آپ کو وہ دعوت دینی دعوت نظر نہ آئے گی جس کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھی گئی ہو۔ اگر آپ یہ معیار قائم کر لیں کہ دین وہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت پیدا کرے تو آپ کو وہ دین دین معلوم نہ ہوگا جو خدا سے عقیدت پیدا کرنے والا ہو۔ اگر آپ کا ذہن یہ ہو کہ کامل دین وہ ہے جو سیاسی انقلاب کا علم بردار ہو تو آپ کو وہ دین ناقص دین دکھائی دے گا جو فرد کے اندر نفسیاتی انقلاب پر زور دیتا ہو۔ اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ جہاد اور عزیمت کے مقام پر وہ ہے جو حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ کی مہم چلائے تو آپ کو وہ شخص جہاد اور عزیمت کے مقام سے گرا ہوا نظر آئے گا جو یہ کہے کہ حکمرانوں سے تصادم نہ کرتے ہوئے غیر سیاسی دائرہ میں کام کرو۔ اگر آپ یہ معیار بنا لیں کہ جو شخص فرعی مسائل اور فنی موشگافیوں میں کمال رکھتا ہو وہی ماہر دینیات ہے تو آپ کو وہ شخص علم دینیات کا ماہر نظر نہ آئے گا جو خوف خدا اور فکر آخرت کی باریکیوں کو بیان کرتا ہو۔ اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم احیاء ملت کی مہم ہے تو آپ ملت کے اندر خود تعمیری کی تحریک کو احیائے ملت کی تحریک سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

حکم آنے کے بعد

شراب اور جوا اسلام میں حرام ہیں۔ مگر ان کے بارے میں احکام بتدریج اتارے گئے۔ شروع میں یہ آیت اتری کہ شراب اور جوا گناہ کے فعل ہیں، اگرچہ اس میں لوگوں کے لئے کچھ ظاہری فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹)

اس وقت عرب کے لوگ جوئے اور شراب کے عادی تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ انھیں صاف لفظوں میں منع نہیں کیا گیا ہے تو یہ کہہ کر بدستور ان میں مشغول رہے کہ یہ دونوں چیزیں ہم پر حرام نہیں کی گئی ہیں۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں گناہ ہے اور کچھ فائدہ بھی (فقال الناس ماحرم علینا، انما قال: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ)

اس کے بعد سورہ مائدہ میں صاف حکم اترا کہ شراب اور جوا گندی چیزیں ہیں اور شیطانی فعل ہیں، تم ان سے بچو۔ یہ حکم دیتے ہوئے جب قرآن میں یہ الفاظ آئے کہ فھل انتم منتھون (کیا تم ان سے باز آؤ گے) تو صحابہ کرام بول اٹھے: انتھینا ربنا، انتھینا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو اسے سنایا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اس کے گھر میں شراب موجود تھی۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان اما علمت ان اللہ حرمھا۔ فاقبل الرجل علی غلامہ فقال اذھب فبعھا۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان بماذا امرتہ۔ فقال امرتہ ان یبیعھا۔ قال ان الذی حرم شربھا حرم بیعھا فامربھا فافرغت فی البطحاء (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے شخص، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جاؤ شراب کو بیچ دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے شخص تم نے اپنے لڑکے کو کیا حکم دیا ہے۔ آدمی نے کہا میں نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ شراب کو بیچ دے۔ آپ نے

فرمایا، جس چیز کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے
اس کے بعد اس نے حکم دیا اور اس کی شراب بطحاء میں
بہادی گئی

مومن کے اندر بھی وہی جذبات ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہوتے ہیں۔ کبھی خواہش کے زیر اثر وہ لفظی تاویل کرتا ہے، کبھی اس کے اوپر مال کی محبت غالب آجاتی ہے۔ مگر یہ سب اسی وقت تک ہے جب تک خدا کا حکم اس کے سامنے نہ آئے۔ خدا کا واضح حکم سامنے آتے ہی وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لفظی تاویلوں کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مال یا کسی دوسری چیز کی محبت کو بھی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتہ ہونے کا ثبوت دے۔ یعنی کبھی کوئی غلطی نہ کرے اور نہ کبھی کوئی برا خیال اس کے دل میں آئے۔ اس قسم کی پارسائی فرشتوں سے مطلوب ہے نہ کہ انسان سے۔ انسان سے اس کے رب کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ تنبیہ کے بعد غلطی پر اصرار نہ کرے۔

انسان کو جن جذبات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور جس قسم کی دنیا میں اس کو رکھا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں غلط خیالات آئیں گے۔ وہ غلط باتیں سوچے گا اور عملاً بھی غلط کام کر گزرے گا۔ مگر اس قسم کی کسی غلطی کو وقتی غلطی ہونا چاہئے نہ کہ مستقل۔ جب بھی آدمی کا ضمیر ٹوکے یا کوئی خارجی آواز اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرے تو اس وقت اس کو ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے سیدھے طریقہ پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے اور فوراً اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ جانا چاہئے۔

انسان کا کمال غلطی کر کے دوبارہ پلٹ آنے میں ہے نہ کہ سرے سے غلطی نہ کرنے میں۔ غلطی ہو جانا جرم نہیں ہے۔ بلکہ غلطی پر قائم رہنا جرم ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت ان متقیوں کے لئے ہے جن کا حال یہ ہو کہ جب وہ کوئی برائی کر بیٹھیں یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر ڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے ہوئے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے (آل عمران ۱۳۵)

جب آدمی عقل کھودے

پندرھویں صدی قبل مسیح تک مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی جو مصر کے باہر سے آکر مصر کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ یوسف علیہ السلام اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد مصر میں قومی انقلاب ہوا۔ عمالقہ کی حکومت ختم ہو گئی اور ایک ملکی خاندان نے مصر کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور اپنا لقب فرعون اختیار کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سابق حکمراں قوم (بنی اسرائیل) سے تعلق رکھتے تھے اور فراعنہ میں سے ایک فرعون کے پاس خدا کا پیغام لے کر بھیجے گئے۔

فرعون اپنے زمانہ میں بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ حضرت موسیٰ جب اس کے دربار میں آکر کھڑے ہوئے تو فرعون نے ان کو حقیر سمجھا۔ دبے ہوئے فرقہ کا ایک فرد جس کے پاس نہ شاندار کپڑے تھے اور نہ پر شکوہ سواری، نہ اس کے آس پاس دنیوی اہمیت کی اور کوئی چیز موجود تھی، اچانک بادشاہ کے دربار میں آکر کہتا ہے کہ میں تمھارے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری ہنس پڑے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی بات کو مذاق سمجھا۔ ان کے لئے ناقابل فہم تھا کہ اتنی معمولی حیثیت کا آدمی خدا کا نمائندہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کے پیغام کو اس کے دلائل کے اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ اِس اعتبار سے دیکھا کہ اس کا پیش کرنے والا کیسا ہے۔ اور جب انھیں نظر آیا کہ پیش کرنے والا ایک معمولی آدمی ہے تو انھوں نے ان کی بات کو، دلائل کی عظمت کے باوجود، حقیر سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔

حضرت موسیٰ کی بات ملک میں پھیلنے لگی اور بہت سے لوگ اس کے وزن کو محسوس کرنے لگے۔ اس وقت فرعون نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس کی باتوں پر دھیان دے رہے ہو۔ یہ شخص تو عجیب الجھی ہوئی باتیں کرتا ہے۔ ابھی تک یہ واضح نہ ہو سکا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ دوسری طرف میرا معاملہ ہے کہ میں صاف اور سمجھ میں آنے والی بات کہتا ہوں۔ میرے برسرِحق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خدا نے مجھ کو بڑائی عطا کی ہے۔ اس ملک کا اقتصادی نظام میرے حکم کے تحت چل رہا ہے۔ "موسیٰ اگر خدا کے نمائندے ہیں تو کیوں نہ ان پر سونے کے کنگن اتارے گئے۔ یا فرشتوں کا دستہ ان کے ساتھ ہوتا" فرعون کی یہ باتیں اس حد تک کارگر ہوئیں کہ اس نے اپنی قوم کی عقل کھو دی اور قوم نے اس کا کہنا مان لیا، وہ پہلے ہی سے فاسق لوگ تھے (زخرف ۵۴)

جب بھی حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو اس کی زد سب سے پہلے ان لوگوں پر پڑتی ہے جو کسی چلتے ہوئے مذہب کے بل پر عوامی قیادت حاصل کئے ہوں، ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ داعی کی باتوں سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں تو وہ کچھ دلفریب باتیں کہہ کر لوگوں کے ذہن کو اس سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ داعی کے کھلے ہوئے دلائل کے مقابلہ میں ان کی پُرفریب باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ تاہم اکثر لوگ چونکہ حق اور ناحق کے معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتے وہ گہرائی کے ساتھ دونوں باتوں کا موازنہ نہیں کرتے اور قائدین کی خوش نما باتوں میں آکر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور حق کے داعی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

متحدہ محاذ کی سیاست

یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور ہر صبح شام ایک نئی حکومت کے منتظر تھے جس کی ایک روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی ۔ دوسری طرف ہاشمی (یا عباسی) خاندان کے کچھ لوگ بنی امیہ کے کھنڈر پر اپنی شاہی عمارت اٹھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال نے ایک طرف عوام اور دوسری طرف عباسی حوصلہ مندوں کے لئے ایک مشترک نقطہ فراہم کردیا ——— بنی امیہ کا خاتمہ۔ اگرچہ مظلوم عوام کے لئے اس کا محرک کچھ اور تھا اور عباسی حوصلہ مندوں کے لئے کچھ اور۔ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳۲ھ میں خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہوگیا اور سفاح تخت نشین ہوا، جو عباسیوں کا پہلا خلیفہ تھا۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا۔ ۱۳۶ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ بنوامیہ کے آخری زمانہ میں جو لوگ ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے ان میں محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ امام حسن ابن علی کی اولاد سے تھے۔

بنوعباس جو نسلی وجوہ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے اور اموی سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں مذکورہ بالا دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک کا علم ہوا تو وہ ان سے مل گئے۔ حتیٰ کہ خود المنصور (جو بعد کو خلیفہ ہوا) نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اموی سلطنت ختم ہوئی اور عباسی سلطنت اس کی جگہ قائم ہوگئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مظالم اور زیادہ بڑھ گئے، حتیٰ کہ شاعر کو کہنا پڑا:

فمهلا یابنی العباس مهلا　　لقد کویت بغدرکما الصدور

اے بنی عباس اپنا ظلم چھوڑ دو تمھاری غداری سے سینے داغدار ہو چکے ہیں۔

چنانچہ نفس ذکیہ اور ان کے بھائی دونوں روپوش ہوگئے اور جو "انقلابی تحریک" پہلے وہ بنی امیہ کے خلاف چلا رہے تھے اس کو اب بنوعباس کے خلاف چلانے لگے۔ یہاں تک کہ موقع پاکر انھوں نے خروج (سلطنت سے بغاوت) کا اعلان کردیا اور مدینہ میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد ان کا جو انجام ہوا وہ یہ کہ نفس ذکیہ ۱۴۵ھ میں مارے گئے اور ان اور ان کا سر منصور کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہی منصور جس نے ان کے ہاتھ پر نوجوانی کی عمر میں بیعت کی تھی

عباسی سلطنت کے قیام سے پہلے نفس ذکیہ کی تحریک اور عباسی تحریک دونوں کا مشترک دشمن ایک تھا یعنی بنوامیہ۔ مگر جب عباسی تحریک نے بنوامیہ کی تحریک کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور عباسی سلطنت قائم ہوگئی تو اب صورت حال بدل گئی۔ اب عباسی سلطنت کے لئے نفس ذکیہ دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ موجودہ عباسی سلطنت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہی المنصور جو "انقلاب" سے پہلے نفس ذکیہ کا حلیف تھا، اب ان کا دشمن بن گیا۔ اس نے ان کی تحریک کو ختم کرنے میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ دو مہینے تک لباس نہیں بدلا اور بستر پر نہیں سویا۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک اس نے اس تحریک کو ختم نہ کرلیا۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک ہزار سال پہلے پیش آچکا تھا جو بتا رہا تھا کہ مختلف محرکات رکھنے والے لوگ جب کسی مقصد کے لئے متحدہ محاذ بناتے ہیں تو اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو حاصل ہوتا ہے جو زیادہ زور آور اور ہوشیار ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور لوگ بار بار اسی ناکام تجربہ کو دہراتے رہے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) نے مصر میں احیائے ملت کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے قوم پرستوں کی ایک انجمن الحزب الوطنی کے نام سے قائم کی جس کے ممبروں کی تعداد کافی وسیع تھی۔ اس میں شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے اور احسان بے جیسے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مصر میں جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ وہاں کی با اثر جماعت جمعیت ماسونیہ نے ان کو اپنا صدر نامزد کیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جمال الدین افغانی کی انجمن کا ایک خفیہ رکن توفیق پاشا مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا۔ اگرچہ اس کامیابی میں فرانس اور برطانیہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کے "قوم پرست" ساتھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں نظر آیا کہ ان کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ یہ محض سراب تھا۔ توفیق پاشا نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین افغانی اور ان کے مخصوص خادم ابوتراب کو مصر سے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ توفیق پاشا، سید جمال الدین افغانی کی خفیہ مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ امپیریلزم کے شدید مخالف ہیں۔ چوں کہ توفیق پاشا کو انھیں امپیریلیسٹ طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی حمایت سے کام کرنا تھا، اس لئے اس نے مصر میں ان کی موجودگی کو حکومت کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ اس نے فوج اور پولس کی کڑی نگرانی میں جمال الدین افغانی اور ان کے خادم کو سوئز بھیج دیا اور وہاں انھیں بجبر کشتی پر سوار کر کے روانہ کر دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ صرف نصف صدی بعد اسی حصہ میں ٹھیک اسی غلطی کو دوبارہ اس سے زیادہ بری شکل میں دہرایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فوجی افسروں نے ملک میں حکومت قائم کر لی تو ایک صاحب مجھ سے ملے۔ "مولانا...... مصر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں" انھوں نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ جو مصر میں انقلاب ہوا ہے، بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی انقلاب ہے، مگر حقیقۃً اخوانی اس انقلاب کے ہیرو ہیں۔ اب مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت ہوگی، مولانا اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اخوانی لیڈروں کو نصیحت کریں اور اسلامی نظام کی تعمیر کے لئے انھیں مفید مشورے دیں"

یہ واقعہ ہے کہ مصر میں جو فوجی افسر انقلاب لائے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کے اخوان المسلمین سے تعلقات تھے۔ وہ اخوانی تحریک کی تائید کرتے تھے۔ حتیٰ کہ خود جمال عبدالناصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخوانیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ صدر سادات کا بیان ہے کہ فوجی افسروں کی "انقلابی کونسل" نے ان کو مامور کیا تھا کہ وہ اخوانیوں سے رابطہ قائم کریں اور انقلابی جدوجہد کے سلسلہ میں ان کی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ جس رات کو شاہ فاروق

کی حکومت کا تختہ الٹ گیا ہے۔ اخوانی رضا کار قاہرہ کی سڑکوں پر پہرہ دینے میں مشغول تھے۔ وہ ان خفیہ باتوں کے بھی راز دار تھے جن میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔

"جب اخوان المسلمین اور فوجی افسروں کے اشتراک سے مصر میں انقلاب آیا تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ فوجی افسروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اخوانیوں کو ختم کر دیا" یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ جواب بالکل سادہ ہے۔ یہ "اشتراک" اسی قسم کی ایک غلطی تھی جس کا نمونہ اوپر کی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

شاہ فاروق کی فوج کے کچھ جونیر افسر فاروق کی قبر کے اوپر اپنی حکمرانی کا تخت بچھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں شبہ تھا کہ وہ تنہا اپنے اس خواب کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف اخوان المسلمین مصر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی اس تمنا کو کس طرح واقعہ بنائیں۔ دونوں کی راہ کی رکاوٹ بظاہر صرف ایک چیز تھی، شاہ فاروق کی حکومت۔ اس صورت حال نے دونوں گروہوں کے لئے ایک مشترک نقطۂ اتحاد فراہم کر دیا۔ باہم ملاقاتیں اور دوستیاں شروع ہوگئیں۔ خفیہ مجالس میں شاہ کے خلاف اسکیمیں بننے لگیں۔ دونوں خوش ہو گئے کہ مقصد کے حصول کا قریبی موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر جب حکومت بدلی تو فطری طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ ہوشیار اور عملی طور پر حکومت سے قریب تر تھے اور اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے جن کو اسلامی یگانگت سے زیادہ ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے شوق نے فریق ثانی سے قریب کیا تھا۔ انقلاب کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان حوصلوں کی تکمیل میں پہلے جہاں شاہ فاروق کی شخصیت حائل تھی وہاں اب یہ "قدیم دوست" آکر کھڑے ہو گئے ہیں یا کم از کم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ حل بہت آسان تھا۔ پہلے کے فوجی افسر اب ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ انھوں نے اپنے قدیم دوستوں کو اس سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے شاہ فاروق کی معزولی کے وقت کیا تھا۔

اسی اتحادی سیاست کو مزید بدتر شکل میں پاکستان میں دہرایا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا اور صدر ایوب کی "ڈکٹیٹر شپ" ملک میں قائم ہو گئی۔ یہ صورت حال ملک کے بہت سے لوگوں کے لئے پریشان کن تھی۔ ان میں ایک طبقہ "اسلام پسند" حضرات کا تھا، یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے علم بردار تھے اور صدر ایوب اور ان کی "بنیادی جمہوریت" ان کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ دوسرا گروہ سیکولر اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں کا تھا۔ ان کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ "بنیادی جمہوریت" کے ہوتے ہوئے وہ ملک کے اقتدار پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کو ختم کیا جائے۔ دونوں گروہ آخری منزل کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تاہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ "صدر ایوب" کی ذات دونوں کے لئے یکساں رکاوٹ ہے۔ اشتراک کی اس منفی بنیاد نے دونوں کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا کر دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ملک میں وہ طوفان مچایا کہ خود ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ یہ متحدہ محاذ جو بڑے بڑے دعووں کے ساتھ بنایا گیا تھا جب اپنے آخری انجام کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا سارا فائدہ سیکولرزم اور سوشلزم کے علم برداروں

کے حصہ میں آیا ہے اور اسلام پسند گروہ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ساری طاقت خرچ کرکے سیاست کے صحرا میں ملوما مدحورا بنے رہیں۔

اب اسی نادان سیاست کو ہندوستان کے کچھ مسلم قائدین نے اس ملک میں درآمد کیا ہے۔ وہ معاہداتی سیاست کے نعرے لگا رہے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر وہ ایک سیاسی پارٹی سے مل کر دوسری پارٹی کو شکست دیتے ہیں۔ مگر قوم کے بے شمار وسائل کو خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں جو آخری چیز آئی ہے وہ صرف یہ کہ الکشن کے بعد جب لوگ اسمبلیوں پر قبضہ کرلیں اور وزارتیں بنالیں تو ہمارے لیڈر اسٹیج پر نمودار ہوکر یا پریس کانفرنس کرکے یہ "انکشاف" کریں کہ جیتنے والوں نے ہم سے فلاں فلاں وعدے کئے تھے جو پورے نہیں کئے گئے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن میں معاہداتی سیاست کے رہنماؤں نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ریاستوں میں حکمراں کانگرس کو شکست دی۔ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اندرا گاندھی کی شکست کے بعد ایک مسلم رہنما نے کہا "آج ہم نے ظلم کا بیڑا غرق کردیا"۔ مگر ان فتوحات کے باوجود اصل صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی غلطی کو ہم کب تک دہراتے رہیں گے۔ اصل سیاست یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو طاقتور اور مستحکم بنایا جائے۔ سیاسی اشتراک یا متحدہ محاذ ہمیشہ اس فریق کے لئے مفید ہوتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فیصلہ کن پوزیشن کا حامل ہو، اندرونی کمزوری اور انتشار کو درست کرنے سے پہلے متحدہ محاذ کی طرف دوڑنا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (اگست ۱۹۷۲)

اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جہاں تک جزئی امور میں تعاون کا تعلق ہے۔ اس قسم کا تعاون ہر ایک سے لیا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ کافر و مشرک سے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر میں عبداللہ بن اُریقط کو رہنما بنایا جو کہ مشرک تھا۔ صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ مشرک تھے۔ امام زہری نے روایت کیا ہے:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم استعان بناس من الیہود فی حربہ فاسھم لھم (رواہ سعید فی سننہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض یہودیوں سے جنگ کے موقع پر مدد لی تو ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا۔

مگر یہ جزئی اور انفرادی تعاون کی مثالیں ہیں۔ کلی جدوجہد کے سلسلہ میں کبھی اغیار پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر وہ جدوجہد جو "غیر صالح حکمراں" کو ہٹا کر اس کی جگہ "صالح حکمراں" کو لانے کے لئے کی جائے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد تمام تر جماعت صالحہ کی اپنی طاقت پر ہونا چاہئے۔ کوئی جماعت صالح اگر اپنے بل پر انقلاب لانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کا غیر سیاسی دائرۂ عمل میں کام کرنے پر قانع رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر صالح عناصر کو لے کر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ یہ غیر صالح عناصر اپنے مزاج کی بنا پر ایسا کبھی نہیں کرسکتے کہ "غیر صالح حکمراں" کو بے دخل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور خالی شدہ تخت کو تمام تر جماعت صالحہ کے حوالے کردیں۔ وہ لازماً یہ چاہیں گے کہ تخت پر خود قبضہ کریں۔ اس وقت "متحدہ محاذ" کے اندر باہمی کشمکش شروع ہوگی جو یقینی طور پر غیر صالح عناصر کے غلبہ پر ختم ہوگی۔ ساری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے۔

سب سے بڑی ضمانت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ والے لوگ اللہ کے محبوب ہیں (التوبہ ۳۶) ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ غم (الاعراف ۳۵) ان کے لئے خدا آسانی پیدا کرتا ہے (اللیل ۵) ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے (آل عمران ۱۷۲) ان کے لئے زمین و آسمان کی برکتیں کھول دی جاتی ہیں (الاعراف ۹۶) ان کو اللہ کی خصوصی مدد ملتی ہے (آل عمران ۱۲۵) ان کے لئے اللہ گنجائش اور کشادگی پیدا کرتا ہے (الطلاق ۲) ان کے معاملات میں آسانی پیدا کی جاتی ہے (الطلاق ۴) وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں (النور ۵۲) انجام کار صرف ان کے لئے ہے (القصص ۸۳) وغیرہ۔

تقویٰ اہل ایمان کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مخالفوں اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ تقویٰ سے یہ عظیم فائدے کس طرح حاصل ہوتے ہیں، اس کے لئے مندرجہ ذیل روایت پر غور کیجئے:

ان عمر بن الخطاب سأل أُبَيَّ بن کعب عن التقویٰ۔ فقال له اما سلکت طریقاً ذا شوك۔ قال بلیٰ۔ قال فما عملتَ۔ قال شمرت و اجتہدت۔ قال فذالك التقویٰ۔

تفسیر ابن کثیر (۴۰/۱)

حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جہاں کانٹے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دامن سمیٹ لئے اور خوب بچ بچ کر چلا۔ انھوں نے کہا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

ابن المعتز نے تقویٰ کے اسی مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها وکبیرها ذاك التقیٰ   واصنع کماش فوق ارض الشوك یحذر ما یریٰ

تقویٰ یہ ہے کہ تم چھوٹے اور بڑے گناہوں کو چھوڑ دو، اور کانٹے دار زمین پر چلنے والا جس طرح بچ بچ کر چلتا ہے، اسی طرح تم بھی کرو۔

تقویٰ (و ق ی) کا اصل مفہوم بچاؤ ہے۔ یعنی اذیت اور ضرر والی چیزوں سے بچ کر رہنا (مفردات راغب اصفہانی) نجات اور کامیابی کو تقویٰ کے عمل سے وابستہ کر کے اللہ تعالیٰ نے زندگی

کا اہم ترین راز بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کو حاصل کرنے کی سب سے ضروری شرط ناکامی کے اسباب سے بچنا ہے۔ اس دنیا میں فائدہ اپنے آپ آرہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی ان نقصان والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو آتے ہوئے فائدے کو اس کی طرف آنے میں مانع بن جائیں۔

گویا فائدہ اور کامیابی کا معاملہ عین وہی ہے جو سورج کا معاملہ ہے۔ سورج کی روشنی اپنے آپ ہر آدمی کی طرف بے پناہ مقداریں آرہی ہے۔ آدمی کے ذمہ جو کام ہے، وہ صرف یہ کہ وہ اپنے اور سورج کی روشنی کے درمیان کسی چیز کو آڑ یا رکاوٹ نہ بننے دے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے بھی آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے جو آنے والی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہوں۔ آدمی نے اگر اس کا اہتمام کرلیا تو کامیابی اس کی طرف آکر رہے گی۔ وہ کسی حال میں رکنے والی نہیں۔

اس تقویٰ کا ایک پہلو یہ ہے کہ نفس اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اور ان سے دور رہتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ مثلاً خدا کی یاد سے غافل ہونا۔ آخرت کی پکڑ سے نہ ڈرنا، خدائی حدوں کو توڑنا، اخلاق اور معاملات میں من مانی کارروائی کرنا۔ مخلوقات کی پرستش میں مبتلا ہونا، اس قسم کی تمام چیزیں انسان کو گھاٹے میں ڈالنے والی ہیں۔ وہ آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔ جو ایسا کرے گا وہی جنت میں پہنچے گا۔

یہ تقویٰ جو اہل ایمان کے لئے آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہی ان کی دنیا کی کامیابی کا ضامن بھی ہے۔ جو متقیانہ روش ان کی آخرت کو سنوارتی ہے، وہی ان کی دنیا کو سنوارنے کا بھی یقینی ذریعہ ہے۔

اس دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں اور شریر لوگ بھی۔ یہ شریر لوگ بدکلامی کریں گے۔ وہ طرح طرح سے تکلیف پہنچائیں گے۔ وہ اشتعال انگیز کارروائیاں کریں گے۔ وہ اسلام کے خلاف سازشیں کریں گے۔ وہ ایسے کام کریں گے جن سے اہل ایمان کے جذبات میں برہمی پیدا ہو جائے۔ مگر ایسے تمام مواقع پر اہل ایمان کو ہمیشہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہنا ہے۔ برے انسان ان کی راہ میں کانٹے بچھائیں گے، مگر انہیں ان کانٹوں سے بچ کر اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز کانٹوں سے بچنا ہے نہ کہ کانٹوں سے الجھنا۔

امتحان کی قیمت

تین عورتیں انسانی تاریخ کی معیاری عورتیں ہیں ـــــــــ آسیہ، مریم اور خدیجہ۔ یہ وہ نیک بندیاں ہیں جنھوں نے کبھی کوئی برائی نہیں کی۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تینوں کو دنیا میں بے پناہ دکھ جھیلنا پڑا۔ حضرت آسیہ کا یہ انجام ہوا کہ مصر کے فرعون نے مخالف سمتوں سے ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوایا اور اس کے بعد انھیں سولی پر چڑھا دیا۔ حضرت مریم کو فلسطین کے یہودیوں نے ذلیل کیا اور ان پر زنا کا الزام لگایا۔ حضرت خدیجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ تین سال تک عرب کے گرم پتھروں کے درمیان اس طرح رہیں کہ ان کا رنگ کالا پڑ جائے۔ درخت کی جڑیں اور پتیاں کھانے کی وجہ سے جانوروں کی طرح مینگنیاں کریں اور آخر کار شدید تکلیف میں اس دنیا سے چلی جائیں۔

یقیناً خدا کے علم میں تھا کہ یہ تینوں خواتین جنتی ہیں۔ وہ ان کو اچھے حالات میں رکھ سکتا تھا جس طرح وہ انھیں آخرت میں اچھے حالات میں رکھے گا۔ اس کے باوجود خدا نے گوارا کیا کہ یہ پاکیزہ ترین نسوانی روحیں انسانی بھیڑیوں کے قبضہ میں آئیں اور وہ ان کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کریں جو انھوں نے کیا۔ اس کی واحد وجہ خدا کی سنتِ امتحان ہے۔ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ ظالموں کا ظالم ہونا ثابت کرے اور ان کے معاشرہ کو اس بات کا مجرم ٹھہرائے کہ انھوں نے کھلے ہوئے فساد کو دیکھا پھر بھی فسادیوں کو روکنے کے لئے نہیں اٹھے۔ انھوں نے بے گناہ زندگیوں پر گنہ گاروں کو شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے پایا مگر وہ خاموش رہے۔

ایسا واقعہ کسی بے داغ انسان ہی کے ذریعہ ظہور میں آسکتا ہے۔ جس طرح چیزوں کو ہمیشہ صحیح ترین باٹ سے تولا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کے ظلم و فساد کو ایسے انسانوں ہی کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے جو خود بے داغ ہوں۔ جو انتہائی بے ضرر ہوں اس کے باوجود لوگ ان کے ساتھ شیطانی حرکتیں کریں جن کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے پھر بھی لوگ ان کو اپنی بد باطنی کا نشانہ بنائیں۔

زیادہ تر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کا معاملہ ملا جلا ہوتا ہے۔ وہ مظلوم ہوتے ہیں تو اسی کے ساتھ وہ ظالم بھی ہوتے ہیں۔ انھیں کسی سے برائی پہنچی ہے تو انھوں نے خود بھی اس کو برائی پہنچائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ خدا کی ترازو نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر آپ دوسرے کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائی کریں اور اس کے نتیجہ میں دوسرا شخص آپ کے خلاف فساد کرنے لگے تو آپ کا واقعہ دوسرے شخص کے ظلم کو ناپنے کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر آپ کسی سے چھین جھپٹ کریں اور اس کے بعد وہ آپ سے مار پیٹ کرنے پر اتر آئے تو آپ کبھی وہ آدمی نہیں بن سکتے جس کے ذریعہ خدا دوسرے شخص کے ظلم کو ناپے اور اس کو اس کی بدکرداری کی سزا دے۔

ترازو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو درست بناتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ٹھہرتا ہے کہ وہ نادرست چیزوں کو ناپے اور تولے۔ اگر ترازو میں بھی کچھ فرق ہو جیسے دوسری چیزوں میں فرق ہوتا ہے تو ایسا ترازو ترازو بننے کے لائق نہیں۔ یہی معاملہ انسان کی اخلاقی پیمائش کا بھی ہے۔ انسانوں کی اخلاقی حالت کو ناپنے کے لئے ایسے انسان درکار ہیں جو یک طرفہ طور پر اپنے کو دوسروں کے لئے بے ضرر بنالیں۔ جو اپنے صابرانہ انداز کی وجہ سے اس بات کو ناممکن بنادیں کہ کوئی شخص ردعمل کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ ان کی زندگی اتنی بے داغ ہو کہ ان کے خلاف کیا ہوا ہر ظلم سراسر یک طرفہ ہو، ان کے خلاف برپا ہوا ہر فساد محض ایک فریق کی شرارت کا نتیجہ ہو۔

فرعون کے ظلم اور گھمنڈ کو ثابت شدہ بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت آسیہ جیسی معصوم خاتون اس کے عقد نکاح میں دی جائیں۔ وہ ان کی معصومیت کو پوری طرح دیکھے، اس کے باوجود بالکل بے بنیاد طور پر وہ ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ یہودیوں کی شیطنت کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مریم جیسی پاکیزہ روح درکار تھی جس کا معاملہ یہودیوں کے حوالے کیا جائے اور وہ اس کو ناحق ذلیل کریں اور اس پر زنا کا الزام لگائیں۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی سرکشی کو درجۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت خدیجہ جیسی بے داغ سیرت کی خاتون ان کے قبضہ میں دی جائیں اور وہ ان پر بلاسبب وحشیانہ سلوک کرکے انھیں موت کے کنارے پہنچا دیں۔

یہ مصیبت جو خدا کے کچھ بندوں کو جھیلنی پڑتی ہے یہ اس عمل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ ترازو اسی وقت ترازو بنتا ہے جب کہ وہ تول کا بوجھ اٹھائے۔ یہی معاملہ انسانوں کے درمیان اخلاقی ترازو بننے کا بھی ہے۔ یہاں بھی آدمی کو "بوجھ" اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان خدا کی ترازو بن سکے۔ ظالم کے ظلم کو تولنے کے لئے ایک آدمی کو مظلومیت کا دار سہنا پڑتا ہے۔ مفسد کا مفسد ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص اس کے فساد کا شکار ہو۔ دھوکا دینے والے کے لئے کوئی آدمی درکار ہوتا ہے جو دھوکا کھا کر اس کی دھوکہ بازی کو ثابت شدہ بنائے۔ مزید یہ کہ ایسے ہر واقعہ میں قصور تمام تر ایک طرف ہو اور بے قصوری تمام تر دوسری طرف۔

بے داغ انسانوں کے ساتھ ظلم کیا جانا دراصل خدا کی سنت امتحان کی قیمت ہے۔ بے داغ انسان گویا خدا کے صحیح ترین ترازو ہیں جن پر لوگوں کی بدکرداریوں کو تولا جاتا ہے۔ لوگوں کے ایمان و اخلاق کو تولنے کی یہی واحد صورت ہے۔ یقیناً یہ بڑا اندوہناک معاملہ ہے۔ مگر ان ستائی ہوئی پاکیزہ روحوں کو خدا کل کے دن اتنا زیادہ اجر دے گا کہ وہ آج کی تمام تکلیفوں کو بھول جائیں گے۔ وہ کہہ اٹھیں گے کہ خدایا، تیرا احسان ہے کہ تو نے ہم سے ایک بہت چھوٹی قیمت لے کر ہم کو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق بنا دیا۔

انصاف کا طریقہ

مکہ کے ابتدائی زمانہ میں جب قریش کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ مکہ کو چھوڑ کر حبش چلے جاؤ۔ حبش میں ایک بادشاہ ہے جس کے یہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ تم لوگ اس کے ملک میں چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی گنجائش پیدا کردے (ان بارض الحبشة ملكاً لايُظلم احد عنده فالحقوا ببلاده حتى يجعل الله لكم فرجاً ومخرجاً مما انتم فيه)

چنانچہ صحابہ ایک سو سے زیادہ تعداد میں اپنا وطن چھوڑ کر حبش چلے گیے۔ قریش مکہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے مشورہ کرکے اپنے دو آدمیوں، عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو حبش روانہ کیا۔ وہاں انھوں نے بادشاہ کے درباریوں کو تحفے دے کر اس پر راضی کرلیا کہ بادشاہ کے یہاں وہ لوگ ان کی سفارش کریں گے۔ اس کے بعد مکہ کا وفد حبش کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں داخل ہوا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے شہر کے کچھ نادان لوگ آبائی دین چھوڑ کر آپ کے ملک میں آگیے ہیں۔ اب ان کے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں نے ہم کو یہاں بھیجا ہے کہ ہم انھیں ان کے گھروں کی طرف واپس لے جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس کی اجازت دے دیں اور ان کو ہمارے سپرد کردیں۔ تمام درباریوں نے اس مطالبہ کی تائید کی۔

مکہ کا وفد یہ چاہتا تھا کہ صرف ان کے کہنے پر بادشاہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کردے اور خود مسلمانوں کو بلاکر ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کرے۔ جب انھوں نے بادشاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو بادشاہ بگڑ گیا۔ اس نے کہا، خدا کی قسم نہیں، میں ہرگز ان کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا جب تک ایسا نہ ہو کہ میں ان کو اپنے یہاں بلاؤں اور ان سے بات کروں اور دیکھوں کہ ان کا معاملہ کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ نجاشی کے امراء نے مکہ کے وفد کے مطالبہ کی تائید کی اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کو فوراً ان کے حوالے کردے۔ مگر نجاشی نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ میں اس معاملہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک میں ان کی بات سن نہ لوں اور یہ جان لوں کہ وہ لوگ کس چیز پر

ہیں (وذکر موسیٰ بن عقبۃ ان امراءہ اشاروا علیہ بان یردّھم الیھم۔ فقال لا واللّٰہ حتی اسمع کلامھم واعلم علیٰ ایّ شئٍ ھم علیہ ۸۰)

اس کے بعد شاہ نجاشی نے حکم دیا کہ مکہ کے جو مسلمان ہمارے ملک میں آئے ہیں، ان کو میرے دربار میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے۔ وہ لوگ دربار میں داخل ہوئے تو وہاں کے عام آداب کے خلاف انھوں نے بادشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ نجاشی ایک عیسائی بادشاہ تھا۔ اپنے سابقہ عقیدہ کے مطابق، وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا۔ مگر گفتگو کے دوران جب حضرت عیسیٰ کا ذکر ہوا تو صحابہ کے نمائندہ جعفر بن ابی طالب نے صاف کہہ دیا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، وہ خدا کے بیٹے نہ تھے۔ وغیرہ

نجاشی نے پوری بات معلوم کرنے کے بعد مکہ کے وفد کے ہدیہ اور تحفہ کو واپس کر دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم لوگ اپنے ملک کو لوٹ جاؤ، میں ان مسلمانوں کو ہرگز تمہارے سپرد کرنے والا نہیں۔ وہ میرے ملک میں جب تک چاہیں گے رہیں گے۔ (سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثانی، صفحہ ۲۲)

یہی انصاف کا صحیح طریقہ ہے۔ انصاف یک طرفہ کارروائی کا نام نہیں۔ انصاف دوطرفہ تحقیق کے بعد منصفانہ فیصلہ دینے کا نام ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی براہ راست تصدیق کے مطابق، نجاشی کا عمل بلاشبہ انصاف کا معیاری نمونہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آئے جو دو فریقوں سے تعلق رکھتا ہو تو ایسے موقع پر ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ کر دینا سراسر ظلم ہے۔ ایسا کرنا کسی بھی شخص کے لیے درست نہیں، خواہ وہ کتنے ہی بڑے منصب پر فائز ہو۔

شاہ نجاشی نے بعد کو اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے نجاشی کا نمونہ ایک عادل اور مسلم بادشاہ کا نمونہ ہے۔ نجاشی اس معاملہ میں نہ اہل مکہ کے تحفوں اور نذرانوں سے متاثر ہوا، نہ اس نے اپنے مصاحبوں اور قریبی لوگوں کے مشورہ اور سفارش کو مانا۔ حتیٰ کہ شاہ نجاشی نے اس کی پروا بھی نہیں کی کہ مسلمانوں نے خود اس کی بھی وہ تعظیم و تکریم نہیں کی جس کا وہ عادی تھا۔ اور اس طرح گویا وہ برسر دربار اس کی توہین کے مرتکب ہوئے۔ مزید یہ کہ انھوں نے بادشاہ اور ساری قوم کے مذہبی عقائد کی تردید کی اور اس کو غلط بتایا۔

ان سب ناموافق پہلوؤں کے باوجود نجاشی نے کسی بات کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس نے معاملہ کے صرف عدل و انصاف کے پہلو کو دیکھا، دوسرے تمام ذاتی یا غیر ذاتی پہلوؤں کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس نے دونوں فریقوں کی بات سن کر معاملہ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کی۔ اور پھر جو انصاف کا تقاضا تھا، اس کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دیا۔

یہ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ شاہ نجاشی کے اندر جوہر انسانیت پوری طرح موجود تھا۔ خدا نے جس فطرت پر اس کو پیدا کیا تھا، اس فطرت کو اس نے اپنی اصل حالت پر باقی رکھا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حق جب اس کے سامنے آیا تو اس کو سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اگرچہ بظاہر وہ اس کے تصورات کے خلاف تھا، مگر اس نے کسی تحفظ ذہنی کے بغیر اس کی صداقت کا اعتراف کیا۔ وہ فوراً اس کے آگے جھک گیا۔

اپنی ان خصوصیات کی بنا پر وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کی نظر کرے۔ اس کو ایمان کی توفیق دے کر اس کو آخرت کی ابدی نعمتوں کا مستحق بنائے۔ چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ شاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعائیں کیں۔

سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی عدل کے مطابق فیصلہ کرے، خواہ اس کے لیے اس کے اوپر کوئی دباؤ نہ ہو، خواہ عادلانہ فیصلہ کرنا اس کے نفس اور اس کے مفاد کے خلاف کیوں نہ ہو۔ یہی وہ بلند روحیں ہیں جن کو قیامت میں عرش خداوندی کے سایہ میں جگہ دی جائے گی۔

سورۂ نور کی روشنی میں

غزوہ بنی المصطلق ۶ھ میں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آرہے تھے۔ آپ کی زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ ان کی سواری کا اونٹ علیحدہ تھا۔ ایک مقام پر قافلہ رکا۔ رات کو کوچ سے پہلے حضرت عائشہ قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف چلی گئیں۔ وہاں ان کا ہار ٹوٹ کر گر گیا جس کو تلاش کرنے میں دیر لگی، ادھر کوچ کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ حضرت عائشہ اپنے ہودج میں ہیں۔ چنانچہ سب اونٹوں کے ساتھ ان کا اونٹ بھی ہانک دیا گیا۔ حضرت عائشہ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ انھوں نے رائے قائم کی کہ مجھ کو یہیں ٹھہرنا چاہیے۔ آگے جا کر جب میں نہ ملوں گی تو لوگ تلاش کرتے ہوئے یہیں آئیں گے۔ اس کے بعد ان کو نیند آئی اور وہ وہیں سو گئیں۔ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ قافلہ کی خبر گیری کے لیے پیچھے رہا کرتے تھے۔ وہ صبح کو اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ کوئی سو رہا ہے۔ قریب آکر پہچانا تو گھبراہٹ میں ان کی زبان سے نکلا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ سن کر حضرت عائشہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے چادر سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ حضرت صفوان نے خاموشی سے اپنا اونٹ ان کے قریب لا کر بٹھا دیا۔ حضرت عائشہ بھی خاموشی کے ساتھ اس پر سوار ہو گئیں۔ اب حضرت صفوان اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت قافلہ میں شامل ہو گئے۔ مدینہ میں یہ خبر پھیلی تو کچھ بد باطن لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ زوجۂ رسول ؐ پر جھوٹی تہمت لگائیں اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی تحریک کو بدنام کریں۔ حتیٰ کہ بعض سیدھے سادے مسلمان بھی اس الزام میں شریک ہو گئے۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابت، حضرت مسطح بن اثاثہ اور حضرت حمنہ بنت جحش۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک یہ خبر گرم رہی۔ یہاں تک کہ قرآن میں اس کی تردید نازل ہوئی اور اس کے بارے میں واضح احکام دیے گئے۔ یہاں چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

٭ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں، پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔ مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ جو لوگ یہ طوفان لائے ہیں وہ تمھیں میں سے ایک جماعت ہیں۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جس نے اس کا بڑا بوجھ اٹھایا اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔ وہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پھر جب وہ گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تم کو کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالاں کہ اللہ کے نزدیک وہ بہت بڑی بات ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں۔ اللہ پاک ہے، یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فحش کاری کا چرچا ہو ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (نور)

ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا حرام ہے۔ اور جب معاملہ مسلمان عورت کا ہو تو اس کی شناعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ پاک باز مسلم خاتون پر تہمت لگانا سو برس کے عمل کو ڈھا دیتا ہے (قذف المحصنة يهدم عمل مائة سنة) بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔ لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول وہ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو حق کے بغیر قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جہاد سے بھاگنا اور بھولی بھالی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا (وقذف المحصنات المومنات الغافلات)

اس میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں چند اشارے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک سادہ سے واقعہ کو بہانہ بنا کر جن لوگوں نے مذکورہ مہم چلائی ان کا مقصد رسول یا زوجہ رسول کو بدنام کرنے سے زیادہ دعوت اسلامی کو بدنام کرنا تھا۔ رسول کو اخلاقی حیثیت سے مشتبہ ثابت کرکے وہ دراصل رسول کی دعوت کو مشتبہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ہر زمانہ میں شیطان کا طریقہ ہے۔ مگر اس قسم کی کوشش خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ حق کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے وہ براہ راست خدا کی حمایت کے تحت اٹھتی ہے۔ اس کو مشتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا گویا خدا کے منصوبہ سے ٹکرانا ہے اور کون ہے جو خدا کے منصوبہ سے ٹکرا کر کامیاب ہو — حق کی دعوت کے لئے مقدر ہے کہ وہ لازماً قائم رہے، یہاں تک کہ وہ حق کو ناحق سے جدا کرنے میں آخری حد تک کامیاب ہو جائے۔

۲۔ امتحان کی اس دنیا میں ایک معصوم اور بے قصور آدمی کے ساتھ بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے جس کو غلط معنی پہنایا جاسکے اور اس طرح خدا سے بے خوف لوگوں کو موقع مل جائے کہ وہ اس کے ذریعہ اس کو بدنام کرسکیں۔ مگر جو اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں ان کو ایسے موقع پر ہمیشہ خوش گمانی کے تحت رائے قائم کرنا چاہئے۔ ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ محض سن کر بلا تحقیق اس کو صحیح مان لیں اور اس کو شہرت دینے میں لگ جائیں۔

۳۔ ایسے کسی الزام کو درست ماننے کے لئے ضروری ہے کہ چار معتبر آدمی اس کے حق میں گواہی دیں۔ اگر الزام لگانے والا چار گواہ نہ پیش کرسکے تو یقین کیا جائے گا کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور اس جرم میں اس کو ۸۰ کوڑے مارے جائیں گے۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو امید ہے کہ اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ مگر مسلمانوں کے معاملات میں گواہ بننے کے لئے پھر بھی وہ نا اہل رہے گا۔ اس کے بعد اس کی گواہی کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔

۴۔ کسی پاک دامن خاتون پر جھوٹی تہمت لگانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی سخت ترین سزا نہ صرف آخرت میں ملتی ہے بلکہ دنیا میں بھی ایسے آدمی کو اس کی سزا مل کر رہتی ہے۔ کسی کی عزت پر حملہ کرنا کمینہ پن کی بات ہے اور ایسا جرم جس کے ساتھ کمینہ پن شامل ہو وہ آدمی کو اللہ کی رحمت سے آخری حد تک محروم کر دیتا ہے۔ ایسے شخص سے جہنم اتنی قریب آجاتی ہے کہ وہ دنیا ہی میں اس کی آنچ سے جلنا شروع ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے پر حملہ سب سے پہلے اپنے آپ پر حملہ ہے۔

آدمی پہلے اپنے آپ کو قتل کرتا ہے، اس کے بعد ہی وہ دوسرے کے قتل کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے۔

۵۔ اسلامی ماحول خدا پرستی کا ماحول ہوتا ہے۔ اسلامی ماحول وہ ہے جہاں ہر آدمی اس احساس کے ساتھ اپنی زبان کھولے کہ اس کو اپنے بولے ہوئے الفاظ کا حساب اللہ کو دینا ہے۔ ایسے ماحول میں آدمی کو حد درجہ محتاط ہو کر رہنا چاہئے۔ ایسے ماحول میں جو لوگ غیر ذمہ دارانہ باتوں کو پھیلائیں وہ گویا اسلامی ماحول کی خدا پرستانہ فضا کو خراب کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک سخت ترین مجرم ہیں۔ دنیا میں اگر وہ اپنی برأت کے لئے الفاظ پالیں تو اس بنا پر ان کو ہرگز دھوکے میں نہ رہنا چاہئے کہ وہ خدا کے یہاں بھی اپنی برأت کے لئے الفاظ پالیں گے۔ آخرت حقیقتوں کے کھل جانے کا مقام ہے۔ وہاں صرف وہ شخص بری الذمہ ٹھہرے گا جو حقیقت کی سطح پر جئے۔ جو حقیقت سے انحراف کرے وہ آخرت میں اس طرح پہنچے گا کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

۶۔ اس قسم کے کسی واقعہ کا پیش آنا بظاہر ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ مگر اس میں خیر کا پہلو بھی چھپا ہوا ہے۔ اس قسم کے ایک واقعہ کے درمیان یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون ذمہ دار ہے اور کون غیر ذمہ دار۔ کون اپنے سینہ میں دوسرے بھائیوں کی خیر خواہی لئے ہوئے ہے اور کون ہے جس کے دل میں دوسروں کے لئے حسد اور بغض بھرا ہوا ہے۔ کون اللہ کی جواب دہی کے احساس کے تحت بولتا ہے اور کون جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر کلام کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ ان واقعات کے ذریعہ بد باطن لوگوں کا بد باطن ہونا کھل جاتا ہے۔ دوسری طرف اہل حق کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ خدا کی توفیق سے صبر کی روش پر قائم رہیں اور اللہ کی مزید عنایتوں کے مستحق بنیں

۷۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حق کی دعوت جب بے آمیز شکل میں پیش کی جائے تو وہ لوگ کتنے زیادہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن پر اس دعوت کی زد پڑتی ہو۔ ان مخالفین میں ایک تو عام دنیا دار ہوتے ہیں۔ وہ بھی اگرچہ ایسی تحریک کے مخالف ہوتے ہیں۔ مگر ان کی مخالفت ایک دائرہ کے اندر رہتی ہے۔ وہ داعی کو ناکام بنانے کے لئے زور لگاتے ہیں مگر اس کو بے عزت کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غزوہ احد کے واقعات میں آتا ہے کہ مکہ سے کافروں کا جو لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا، وہ راستہ میں ابواء کے مقام پر پہنچا جہاں پیغمبر اسلام کی والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر تھی۔ قریش کے کچھ پُر جوش لوگوں نے چاہا کہ قبر کو کھودیں اور پیغمبر کی ماں کی بے حرمتی کریں۔ مگر خود قریش کے لوگوں نے ان کو برا بھلا کہا اور ان کو اس ارادہ سے روکا۔ وہ پیغمبر سے لڑنے جارہے تھے مگر ان کی بے حرمتی کے لئے کوئی پست طریقہ اختیار کرنا ان کو گوارہ نہ ہوا۔ مگر یہود جو اپنے کو حق کا اجارہ دار سمجھتے تھے ان کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے بعض چیزوں کو بہانہ بنا کر آپ پر رکیک حملے کئے اور آپ کو اخلاقی حیثیت سے گرانے کی کوشش کی۔ مذکورہ تہمت طرازی کے اصل ذمہ دار یہی لوگ تھے۔ جو لوگ اپنے کو حق کا واحد نمائندہ سمجھتے ہوں، جب وہ اپنی حیثیت پر زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں تو ان کا ردعمل بے حد شدید ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایسی تحریک کا زور توڑنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کے داعی کو بے عزت کرنے کی مہم بھی چلاتے ہیں۔ وہ اپنی مذہبی قیادت کو بچانے کے لئے ہر چیز کو اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں خواہ وہ کوئی ذلیل حرکت یا کوئی پست کارروائی کیوں نہ ہو۔ (۱۹ مارچ ۱۹۸۰)

الزام کافی نہیں

الزام لگانے کا نام ملزم ہونا نہیں۔ اگر کسی شخص کے واقعۃً ملزم ہونے کے لیے یہ بات کافی ہو کہ اس کے خلاف الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ہے تو پھر دنیا کا ہر شخص ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نظر آئے گا، حتی کہ خدا کے معصوم اور بے خطا پیغمبر بھی۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ آپ بلاشبہ پاک اور معصوم تھے۔ مگر آپ کے زمانہ کے لوگوں نے آپ پر بدترین الزامات لگائے۔ یہ الزامات صرف یہودیوں اور منافقوں نے نہیں لگائے۔ بلکہ آپ کے مخلص ساتھیوں تک کو آپ کے کردار کے بارہ میں بے جا شبہات لاحق ہوئے۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کا تعلق ایک انصاری مسلمان سے ہے۔ یہ بزرگ ایک بدری صحابی تھے۔ یعنی وہ بدر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر لڑے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی دین کے لیے سرفروشی پر شبہہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ مذکورہ انصاری صحابی اور زبیر بن العوام (مہاجر) کے درمیان ایک جھگڑا ہوا۔ یہ جھگڑا کھجور کے درختوں کی آبپاشی کے بارہ میں تھا۔ مدینہ میں پانی کا ایک گڑھا تھا جس سے آبپاشی کی جاتی تھی۔ اس کے پاس دونوں صاحبان کا کھجوروں کا باغ تھا۔ ایک بار اس امر پر جھگڑا ہو گیا کہ دونوں میں سے کون پہلے پانی لے۔ اس کا مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زبیر بن العوام پہلے اپنے باغ میں پانی لے جائیں اور اس کے بعد دوسرے صحابی اپنے باغ کی سینچائی کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا تھا وہ زرعی مصلحت اور جغرافی حالات کی بنا پر کیا تھا۔ یہ محض ایک اتفاقی بات تھی کہ زبیر بن العوام مہاجر تھے اور دوسرے صاحب انصاری۔ اور فیصلہ میں زبیر بن العوام کو اولیت حاصل ہو گئی۔ معاملہ کا انصاری فریق اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ زرعی اور جغرافی بنیاد پر فرمایا ہے۔ اس نے معاملہ کو مہاجر اور انصاری کی اصطلاح میں سوچا اور یہ رائے قائم کر لی کہ آپ نے رشتہ کی رعایت کرتے ہوئے اس کے حق

میں فیصلہ دے دیا ہے۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلہ کو سن کر مذکورہ انصاری نے کہا: یارسولَ اللّٰہ اَن کان ابن عمتك (اے خدا کے رسول کیا اس لیے کہ وہ آپ کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ انھوں نے کہا: انما قضیٰ لہ لانہ ابن عمتہ (رسول اللہ نے ان کے حق میں اس لیے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۱ ـ ۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطا تھے۔ آپ سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے یقینی ہے کہ یہ الزام بالکل غلط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا، وہ اخلاص کے تحت کیا اور عین درست کیا۔ اس کے باوجود ایک صحابی کو آپ کے بارے میں شبہ لاحق ہو گیا اور اس نے آپ کے اوپر جانب داری کا الزام لگا دیا

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ الزام کے الفاظ بول دینا کسی کے ملزم ثابت ہونے کے لیے کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی بلا ثبوت کسی پر الزام لگائے اور جو لوگ محض الزام کے الفاظ سن کر متعلقہ شخص کو ملزم سمجھ لیں، وہ دونوں سخت گنہ گار ہیں۔ وہ ایسے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کی خدا کے یہاں کوئی معافی نہیں، الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کرلے۔

یہ واقعہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی کے اوپر الزام لگانے کے معاملہ میں ہم کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔ جب معصوم پیغمبر کے بارے میں غلط فہمی کا امکان ہے تو عام انسان کے بارہ میں بدرجۂ اولیٰ غلط فہمی کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو ہم ایک شخص کی خطا سمجھ رہے ہیں، وہ اس کی خطا نہ ہو بلکہ خود سمجھنے والے کی غلط فہمی ہو۔ وہ اس کی اپنی نظر کا قصور ہو نہ کہ متعلقہ شخص کی نیت یا عمل کا قصور۔

اپنی پہچان

ہر انسان خدا کی ایک منصوبہ بندی ہے۔ ہر انسان کی پیدائش انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک خاموش عہد ہے۔ اسی عہد میں انسان کی ساری قیمت چھپی ہوئی ہے۔

ہر انسان کو خدا نے کچھ خاص صلاحیتیں دی ہیں اور ہر آدمی نے خاموش زبان میں یہ اقرار کیا ہے کہ وہ دنیا میں اس خاص کام کو انجام دے گا جس کے لئے اس کے خدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔ اور جس کے مطابق اسے خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ جو انسان ایسا کرے اس نے گویا خدا کے نقشۂ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کی۔ جو شخص ایسا نہ کرے وہ خدا کے نقشۂ تخلیق میں اپنی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

اس بات کو یہاں اصحاب رسول کی مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام میں ایک حضرت ابو ہریرہ تھے اور دوسرے خالد بن الولید۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ تک شمار کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت خالد کی روایات کی تعداد ایک سو سے بھی کم ہے۔ یہ فرق بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس فرق کی وجہ خدمت اسلام کے میدان کا فرق تھا نہ کہ خود اسلام کا۔

حضرت ابو ہریرہ بھی ایک مخلص مسلمان تھے اور حضرت خالد بھی ایک مخلص مسلمان۔ مگر فطری صلاحیت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق تھا۔ انھوں نے کامل شعور کے ساتھ اس فرق کو پہچانا اور اس پر عمل کیا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اپنے لئے خدمت اسلام کا ایک میدان منتخب کرلیا اور حضرت خالد نے اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دوسرا میدان۔

حضرت خالد کہتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ صلے اللہ کے خلاف کسی مہم میں نکلتا تو ہمیشہ یہ احساس لے کر واپس آتا کہ میں اپنے آپ کو وہاں لگائے ہوئے ہوں جہاں مجھ کو نہیں لگانا چاہئے (انی موضع فی غیر شئی) یہ احساس انھیں ستاتا رہا یہاں تک کہ وہ فتح مکہ سے کچھ پہلے مدینہ آئے اور اسلام قبول کرلیا۔

حضرت خالد فطری طور پر انتہائی بہادر آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی اس خصوصیت کو جانا اور اس کے موقع استعمال کا ادراک کیا۔ انھوں نے شعوری طور پر اس کو دریافت کیا کہ اسلامی خدمت

کے وسیع میدان میں وہ کیا خاص حصہ ادا کرسکتے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خداداد بہادرانہ صلاحیت کو شرک کے استیصال اور توحید کے قیام کے محاذ پر لگا دیں۔ چنانچہ وہ اسلامی فوج میں شامل ہوگئے۔

وہ ساری عمر اسی راہ میں سرگرم عمل رہے۔ وہ خدا سے اپنے لئے قوت اور استقامت کی دعا کرتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی درخواست کرتے کہ وہ آپ کے لئے اس کی دعا فرمائیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسلامی جہاد میں صرف کر دی۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جس کو خدا نے مشرکین کے خلاف نکالا ہے (سیف من سیوف اللہ سلہ اللّٰہ علی المشرکین)

دوسری مثال حضرت ابو ہریرہ کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کے اندر حضرت خالد والی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ البتہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر حافظہ کی قوت عام لوگوں سے زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کو دین کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لئے دعا فرمایئے کہ خدا مجھے وہ علم دے جس کو میں فراموش نہ کرسکوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین کہا اور حضرت ابو ہریرہ کے حق میں یادداشت کی دعا فرمائی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی غیر معمولی قوت حافظہ اسی پیغمبرانہ دعا کا نتیجہ ہے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھئے تو یہ دراصل خود حضرت ابو ہریرہ کی اپنی تڑپ کا اظہار تھا۔ یہ دوطرفہ واقعہ تھا نہ کہ محض یک طرفہ۔

حضرت ابو ہریرہ نے اپنی خداداد امتیازی صلاحیت کو پہچانا۔ اس کی حفاظت اور ترقی کی دعائیں کیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے لئے دعا کرائی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دعا کرانا دراصل خود اپنی دعا کا ایک تسلسل تھا۔ اس طرح دعاؤں کے سائے میں وہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے ممکن میدان میں ہمہ تن لگ گئے۔ وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے۔ آپ کی باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے۔ اس کو ذہن میں محفوظ رکھتے نیز حسب ضرورت اسے لکھ لیتے۔ اسی معرفت خویش کا یہ نتیجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اسلامی تاریخ میں وہ شخص قرار پائے جن کے ذریعہ اگلی نسلوں کو پیغمبر اسلام کی حدیثیں سب سے زیادہ تعداد میں پہنچی ہیں۔

ہر آدمی کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اپنے آپ کو جان کر وہ اپنے لئے بھی زیادہ مفید بن سکتا ہے اور دین کے لئے بھی۔

آیت فتنہ

حضرت امام حسن بن علی نے ۴۱ھ میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ خلافت سے دست برداری اختیار کرلی۔ اس وقت سے خلافت بنو امیہ کے خاندان میں چلی گئی۔ تاہم امیر معاویہ کی وفات (۶۰ھ) کے بعد بار بار خلافت کے دعویدار اٹھتے رہے اور بنو امیہ میں اور ان مدعیان خلافت میں جنگ جاری رہی۔

انھیں میں سے ایک عبد اللہ بن زبیر تھے۔ ان کا صدر مقام مکہ تھا۔ انھوں نے بنو امیہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ بنو امیہ کے عامل حجاج بن یوسف سے ان کی جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۷۲ھ میں وہ مکہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ فتنہ ابن زبیر کے زمانہ میں دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ برباد ہو رہے ہیں اور آپ عمر فاروق کے صاحبزادے ہیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ پھر کیا چیز آپ کو روک رہی ہے کہ آپ ان سے جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کے خون کو میرے لئے حرام کردیا ہے۔ آدمیوں نے کہا کیا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا، ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا۔ اور دین اللہ کے لئے ہوگیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لئے ہوجائے۔

دوسری روایت میں ہے کہ دو آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن، کیا وجہ ہے کہ آپ ایک سال حج کرتے ہیں اور ایک سال مقیم رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کس قدر زیادہ اس کی اہمیت دلائی ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، اور پانچ وقت کی نمازیں، رمضان کے مہینہ کا روزہ رکھنا، اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ آدمیوں نے کہا اے ابو عبد الرحمٰن کیا آپ نہیں سنتے جو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبد اللہ ابن عمر نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کیا۔ اس وقت اسلام کم تھا، پس آدمی اپنے دین کے معاملہ میں

فتنہ میں ڈالا جاتا تھا۔ لوگ اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہوگئی۔ پھر فتنہ باقی نہ رہا (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۸ - ۲۲۷)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ مسلمانوں کو سیاسی شکایت ہوگئی۔ وہ مدینہ میں گھس آئے اور آپ کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حضرت عثمان اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور باغیوں سے کہا کہ تم جو میرا محاصرہ کئے ہوئے ہو اور میرے قتل کے درپے ہو، کیا اپنے اس فعل کے حق میں تمہارے پاس قرآن کی کوئی دلیل ہے۔ ایک باغی آگے بڑھا اور اس نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے قرآن سے جہاد اور قتال والی آیتیں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔

باغیوں کے نزدیک اپنے عمل کے لئے ان آیتوں کا حوالہ درست تھا۔ کیوں کہ اپنے خیال میں وہ ایک بگڑی ہوئی حکومت کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور جہاد کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ مگر حضرت عثمان نے ان کے اس استدلال کو تسلیم نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں۔ یہ میرے اور میرے ساتھیوں (صحابہ) کے حق میں اتری ہیں۔

حضرت عثمان کا جن لوگوں نے محاصرہ کر رکھا تھا وہ سب مسلمان تھے۔ ان کے پاس اپنے محاصرہ کو برحق ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیتیں بھی تھیں۔ مگر صحابہ نے اس معاملہ میں ان سے اتفاق نہیں کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ انھوں نے قرآنی آیات کی تفسیر اور تشریح میں غلطی کی (اخطأوا فی التاویل) یعنی جن آیتوں کا تعلق کافروں اور مشرکوں سے ہے۔ ان کو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

"خوارج" سب کے سب مومن و مسلم تھے۔ وہ دیندار اور عبادت گزار بھی تھے۔ وہ ہر بات میں قرآن کی آیتیں پیش کرتے تھے۔ مگر خلیفہ چہارم حضرت علی کے خلاف ان کی جنگ کو امت نے کبھی صحیح نہیں قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے خوارج کی لڑائیوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ قرآن کی وہ آیتیں جو کافروں اور مشرکوں سے جنگ کے بارہ میں اتری ہیں ان کو انھوں نے مسلمانوں کے اوپر منطبق کر دیا ہے۔ وہ قرآن کی تحریف کر رہے ہیں نہ کہ قرآن کی تفسیر۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ کی انقلابی اسلامی جماعتیں جو اپنے ملکوں میں مسلم حکمرانوں سے اصلاح سیاست کے نام پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔ اس قسم کی لڑائیوں کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمام منکرین اسلام درحقیقت مجرمین اسلام ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی باہمی جنگوں کو جہاد فی سبیل اللہ ثابت کرنے کے لئے اپنی ذہانت صرف کر رہے ہیں۔ اس قسم کے اعمال کے لئے قرآن کی آیتیں پیش کرنا بے عملی پر سرکشی کا اضافہ کرنا ہے۔

اقدام سے پہلے تحقیق ضروری ہے

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۲۴ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ۳۵ھ میں آپ کو شہید کر دیا گیا جب کہ آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ امام مسلم عائشہ رضی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مکان میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کی پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ابوبکر رضؓ آئے، آپ اسی حال میں لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ پھر عمر رضؓ آئے۔ آپ اب بھی اسی طرح لیٹے رہے اور باتیں کیں۔ اس کے بعد عثمانؓ آئے۔ اب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو ٹھیک کر لیا۔ جب تینوں چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ اے خدا کے رسول! ابوبکر آئے مگر آپ نہیں اٹھے۔ عمر آئے پھر بھی آپ اسی طرح رہے۔ مگر عثمان آئے تو آپ اٹھ گئے اور اپنے کپڑے کو درست کر لیا۔ آپنے فرمایا عثمان سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

امام ترمذی عبدالرحمٰن بن خبابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اس وقت مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا جب کہ آپ جیش عسرہ (تبوک) کی تیاری کے لئے لوگوں کو ابھار رہے تھے۔ عثمان بن عفان کھڑے ہوئے اور کہا: اے خدا کے رسول، ایک سو اونٹ مع کجادہ اور پالان کے میں خدا کے راستہ میں دیتا ہوں"۔ آپؐ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان دوبارہ کھڑے ہوئے اور کہا، "دو سو اونٹ معہ کجادہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں"۔ آپ نے پھر لوگوں کو ابھارا۔ عثمان بن عفان تیسری بار کھڑے ہوئے اور کہا، اے خدا کے رسول تین سو اونٹ مع کجادہ اور پالان کے اللہ کے راستہ میں"۔ راوی کہتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر پڑے۔ اور آپ کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا:

ما علی عثمانَ ما عمِل بعد هٰذه ما علی عثمان ما عمل بعد هٰذه	اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اس کے بعد عثمان جو بھی کریں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

امام ترمذی انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ حدیبیہ میں جب بیعت رضوان ہوئی، اس وقت عثمان بن عفان رسول اللہ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ جب تمام لوگ بیعت ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عثمان اس وقت اللہ اور اس کے رسول کے کام پر ہیں"۔ پھر آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور خود اپنے ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ پر عثمان کے لئے بیعت کی:

فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان خیرا من ایدیھم لانفسھم	پس عثمان کے لئے رسول اللہؐ کا ہاتھ لوگوں کے لئے ان کے اپنے ہاتھ سے بہتر تھا۔

امام ترمذی مرۃ بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا حال بیان کیا جو آپ کے بعد آئیں گے، اتنے میں ایک صاحب سامنے سے گزرے جو کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ھذا یومئذ علی الھدی (یہ شخص اس دن حق پر ہوگا)۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عثمان بن عفان ہیں۔ (ترمذی) حضرت عثمان نے اپنے مال سے مشکل وقتوں میں اتنی زیادہ اسلام کی مدد کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم انی قد رضیت عن عثمان فارضِ عنہ، اللھم انی قد رضیت عن عثمان فارض عنہ

اے اللہ! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا، اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا۔

ایک بار حضرت عثمان کے ایثار و قربانی سے آپ اتنا خوش ہوئے کہ دعا کا یہ کلمہ دن بھر آپ کی زبان سے نکلتا رہا۔

تاہم یہی عثمان بن عفان تھے جن کے خلاف ان کی خلافت کے بعد کے سالوں میں سارے ممالک اسلامی میں شورش برپا ہوگئی۔ اس شورش کے پیدا کرنے میں متعدد مخلص اور مقدس لوگ بھی شریک تھے۔ یہ شورش اتنی بڑھی کہ ہزاروں کی تعداد میں بلوائی مختلف ملکوں سے جمع ہوکر مدینہ میں گھس گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ آپ کے گھر میں پانی کا داخلہ روک دیا۔ آپ کے لئے مسجد نبوی میں جاکر نماز پڑھنا ناممکن بنا دیا۔ جب شدت بہت بڑھ گئی تو آپ اپنے مکان کی چھت پر چڑھے اور بلوائیوں کو خطاب کیا:

عن ثُمامۃ بن حَزْنٍ القشیری، قال شھدت الدار حین اشرف علیھم عثمان فقال: انشدکم اللہ والاسلام ھل تعلمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ ولیس بھا ماءٌ یستعذب غیر بئر رومۃ۔ فقال من یشتری بئر رومۃ یجعل دلوہ مع دلاء المسلمین بخیر لہ منھا فی الجنۃ۔ فاشتریتُھا من صلب مالی، وانتم الیوم تمنعوننی ان اشرب منھا۔ فقالوا اللّٰھم نعم۔ فقال انشدکم اللہ والاسلام ھل تعلمون ان المسجد ضاق باھلہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یشتری بقعۃ آل فلان فیزیدھا فی المسجد بخیر لہ منھا فی الجنۃ فاشتریتھا من صلب مالی، فانتم الیوم تمنعوننی ان اصلیّ فیھا رکعتین۔ فقالوا اللّٰھم نعم۔ ۔ قال اللہ اکبر، اشھدوا ورب الکعبۃ انی شھید، ثلاثا۔ (ترمذی۔ نسائی، دار قطنی)

ثمامہ بن حزن القشیری کہتے ہیں۔ عثمان بن عفان کے محاصرہ کے وقت میں ان کے گھر کے پاس موجود تھا۔ وہ مکان کے اوپر چڑھے اور لوگوں سے کہا۔ میں تم کو اللہ کی اور اسلام کی قسم دلاتا ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ آئے اور یہاں صرف ایک (یہودی کا) کنواں بئر رومہ تھا جس سے میٹھا پانی لیا جاسکے (وہ بہت مہنگی قیمت پر فروخت کرتا تھا) رسول اللہ نے کہا۔ کون بئر رومہ کو خریدتا ہے کہ وہ بھی اس سے پانی لے اور مسلمان بھی پانی لیں۔ جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے (۳۵ ہزار درہم) کے عوض اس کو خریدا۔ اور تم مجھ کو اس سے پانی پینے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے جواب دیا۔ خدایا ہاں۔ پھر عثمان بن عفان نے کہا۔ میں تم کو قسم دلاتا ہوں اللہ کی اور اسلام کی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مسجد نبوی تنگ پڑگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون فلاں زمین کو خرید کر مسجد میں اضافہ کرتا ہے، جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا۔ اور تم مجھ کو اس میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو۔ لوگوں نے کہا خدایا ہاں۔ عثمان بن عفان نے کہا اللہ اکبر۔ رب کعبہ کی قسم، تم لوگ گواہ رہو کہ میں شہید ہوں

ان سب کے باوجود لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کردیا۔ اور قتل کرنے والے اور ان کا ساتھ دینے والے سب کے سب نماز روزہ والے تھے۔ اور اپنے کو مکمل معنوں میں مسلمان سمجھتے تھے۔

خلیفہ سوم کے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہونے کی وجہ کیا تھی جس نے بالآخر ان کی جان لے لی۔ مورخین کے بیان کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے بارے میں بعض وجوہ سے عوام میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اسی بیچ میں یہ واقعہ ہوا کہ مصر کے عامل عبداللہ بن ابی سرح کی زیادتیوں سے اہل مصر کو شکایت ہوئی۔ لوگ مدینہ آئے اور مطالبہ کیا کہ اس کو معزول کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کر دیا۔ اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے لئے مصر کی امارت کا فرمان لکھ دیا۔ مصری اس فرمان کو لے کر اپنے ملک کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ محمد بن عبدالرحمٰن بھی تھے۔ راستہ میں انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان کا غلام خلیفہ کے اونٹ پر سوار ہو کر تیزی سے مصر کی طرف جا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ خلیفہ کی طرف سے ایک خط لے کر مصر کے حاکم (عبداللہ بن ابی سرح) کے پاس جا رہا ہے۔ انھوں نے زبردستی کر کے غلام سے خط چھین لیا۔ اس میں لکھا تھا کہ محمد اور ان کے ساتھی مصر پہنچیں تو ان کو قتل کر دیا جائے اور تا حکم ثانی عبداللہ بن ابی سرح مصر کا حاکم رہے۔

یہ خط حضرت عثمان کے چچا زاد بھائی مروان بن حکم نے لکھا تھا اور خلافت کی مہر لگا کر اس کو غلام کی معرفت مصر روانہ کر دیا تھا۔ مگر مصریوں نے اس کو خود خلیفہ سوم کی جانب سے سمجھا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے ساتھ غداری کی گئی ہے کہ ایک طرف تو عبداللہ بن ابی سرح کی معزولی کا حکم نامہ ہم کو دیا گیا اور دوسری طرف عبداللہ کو خفیہ خط روانہ کر دیا کہ ان سب لوگوں کو قتل کر دو اور تم اپنے عہدہ پر بحال رہو۔ چنانچہ وہ راستہ سے لوٹ آئے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ دوبارہ مدینہ میں داخل ہو گئے۔ ان کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ کسی کے سمجھانے بجھانے سے کم نہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا اور بالآخر انھیں قتل کر ڈالا۔ اسی لئے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی خبر ملے تو اس پر کارروائی کرنے سے پہلے خوب تحقیق کر لو:

یا یھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نٰدمین (حجرات ۶)	اے ایمان والو! کوئی شریر آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو خوب تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کسی قوم پر جا پڑو پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو قبیلۂ بنی المصطلق کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ قبیلہ کے لوگ ان کی آمد کو سن کر ان کے استقبال کے لئے نکلے۔ ولید کی اس قبیلہ سے زمانہ جاہلیت میں کچھ شکایت تھی، وہ سمجھے کہ یہ لوگ میرے قتل کے لئے نکلے ہیں، اس لئے وہ بستی میں داخل ہونے سے پہلے مدینہ واپس آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ قبیلہ کے لوگ میرے قتل کے درپے ہو گئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ارادہ کیا کہ ان کی سرکوبی کے لئے حضرت خالد کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ روانہ کریں۔ اسی درمیان میں قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار آگئے جو ام المومنین جویریہؓ کے والد بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے زکوٰۃ جمع کر رکھی تھی مگر ولید بن عقبہ ہمارے یہاں پہنچے ہی نہیں۔ ہم تو اسلام پر قائم ہیں اور اللہ کے حقوق ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (ابن کثیر) اس پر یہ حکم دیا گیا کہ جب کسی کے متعلق کوئی خبر ملے تو کارروائی کرنے سے پہلے پوری تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ خبر غلط ہو اور اس کی بنا پر تم غلط اقدام کر بیٹھو۔

سچائی کا زور

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جس نے لوگوں کے سامنے بآواز بلند قرآن پڑھا وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک روز جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم قریش نے ابھی تک اس قرآن کو بلند آواز سے نہیں سنا۔ کیا کوئی ہے جو قریش کے لوگوں کو قرآن سنائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا، میں سناؤں گا۔ عبداللہ بن مسعود دبلے اور کمزور جسم کے تھے۔ مکہ میں ان کا کوئی قبیلہ بھی نہ تھا جو ان کی حمایت کرے۔ وہ اس وقت لوگوں کی بکریاں چرانے تھے اور "ابن ام عبد" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ تمھارے بارے میں ہمیں ڈر ہے۔ اس کام کے لئے ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا مکہ میں قبیلہ ہو اور قریش جب اس پر حملہ کریں تو اس کا قبیلہ قریش کو رد کے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: مجھے جانے دو، کیونکہ اللہ میری مدد کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود روانہ ہوئے اور اس مقام پر پہنچے جہاں قریش کے لوگ جمع تھے۔ وہ ان کے پاس کھڑے ہوگئے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد بلند آواز سے سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ قریش نے آپس میں پوچھنا شروع کیا کہ یہ "ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے" کسی نے کہا کہ یہ اس کلام کا کوئی حصہ ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اترا ہے۔ یہ سن کر وہ اٹھے اور عبداللہ بن مسعود کے منھ پر مارنا شروع کیا۔ تاہم وہ برابر پڑھتے رہے۔ اس کے بعد جب عبداللہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر مار کا نشان ظاہر ہو چکا تھا۔ لوگوں نے دیکھ کر کہا: تمھارے بارے میں ہم کو اسی کا اندیشہ تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: خدا کے دشمن آج مجھ کو جتنا کمزور معلوم ہوئے اتنا کمزور مجھے کبھی معلوم نہیں ہوئے تھے اور اگر تم چاہو تو کل پھر میں اسی طرح جاکر ان کو قرآن سناؤں گا (ما اعداء اللہ اھون علیّ منھم الآن ولئن شئتم لاُغادِیَنَّھم بمثلھا غداً، سیرۃ ابن ہشام، جزء اول، صفحہ ۳۳۷)

ایک کمزور اور بے سہارا آدمی کے اندر یہ قوت کہاں سے آئی کہ وہ کسی مادی تحفظ کے بغیر دشمنوں کے مجمع میں گھس گیا اور ان کو بلند آواز سے وہ کلام سنانے لگا جس کا سننا ان کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اس قوت کا راز سچائی پر یقین ہے۔ عبداللہ بن مسعود کو کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور قریش باطل پر۔ قریش نے جب عبداللہ بن مسعود کو مارنا شروع کیا تو ان کا یقین اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ ان کے دل نے کہا کہ قریش کے پاس دلیل کی زبان میں ان کے جواب کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ان کی جارحیت صرف اس بات کا ثبوت

تھی کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنے کو بالکل بے بس پا رہے ہیں، عبداللہ بن مسعود سچائی کے زور سے زور آور تھے، اور یقیناً سچائی کا زور سب سے بڑا زور ہوتا ہے۔

دنیا کی رزم گاہ میں بہادر بننے کا راز یہ نہیں ہے کہ آدمی پر مشکلات نہ گزریں۔ مشکلات تو اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آتی ہیں۔ بہادری کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی کے پاس کوئی ایسا یقین ہو جو اپنے مقصد کے مقابلہ میں مشکلات کو اس کے لئے حقیر بنا دے۔ دکھوں کی اس دنیا میں مشکلات کو وہی شخص جھیلتا ہے جس کو مشکلات سے بڑی کوئی چیز مل گئی ہو۔

مومن کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا حق ہوتا ہے جس کی عظمت اور صداقت پر اسے ادنیٰ شبہ نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی آخرت میں اس کی کامیابیوں میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہوگی۔ یہ یقین اس کے لئے حق کے اعلان کو ایک ایسی لذت بنا دیتا ہے جس کا سرور کبھی ختم نہ ہو۔ مخالفین کی جارحیت صرف اس کے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ وہ سراسر حق پر ہے اور اس کے مخالفین سراسر باطل پر۔ جارحیت در اصل سچائی کے میدان میں اپنی شکست کا اعلان ہے۔ مخالفین کی جارحیت ایمان و اسلام کے داعی کے لئے اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کے مخالفین دلیل کے میدان میں اپنی بازی ہار چکے ہیں۔ کیوں کہ جس کے پاس دلیل کی طاقت ہو وہ کبھی جارحیت کی طاقت استعمال نہیں کرتا۔

سچائی ایک اعلیٰ ترین ذہنی یافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی کی طاقت کا خزانہ آدمی کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری تمام طاقتیں خارجی طاقتیں ہیں، ان کا خزانہ آدمی کے اپنے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ دوسری طاقتوں کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں نازک حالات میں خود اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جاتی ہیں، اس بنا پر وہ نازک مواقع پر آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر سچائی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ سچائی وہ اتھاہ طاقت ہے جس کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ سچائی جب ایک بار کسی کو مل جائے تو وہ اس کی جان کے ساتھ ساتھ باقی رہتی ہے، وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ سچائی کی طاقت آخر وقت تک آدمی کا سہارا بنی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کے ساتھ کوئی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

مومن کو جو سچائی ملتی ہے وہ خود خدا ہوتا ہے۔ مومن خدا کو سب سے بڑی حقیقت کے طور پر پالیتا ہے۔ پھر جو سب سے بڑی ہستی کو پا لے وہ اس کے بعد کسی چھوٹی چیز سے کیوں ڈرے گا۔ اس کے بعد تو کوئی چیز پانے کے لئے باقی ہی نہیں رہتی۔

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے
مگر اس کو وہی لوگ جانتے ہیں
جو بڑے دل والے ہوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ) کے بعد ۲۰ سال تک فتوحات اسلام کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کے فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کی شہادت (۳۵ھ) کے ساتھ جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ شخص جس نے اس بند دروازہ کو دوبارہ کھولا، وہ حضرت امام حسنؓ تھے۔ ۴۱ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر اس واپسی نے اسلامی تاریخ میں اقدام وعمل کے نئے امکانات کھول دیئے۔

حسن بن علی بن ابی طالب شعبان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد حضرت علیؓ کی شہادت ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں ہوئی تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس وقت صرف عراق اور ایران حضرت علیؓ کے زیر خلافت رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں امیر معاویہ کی حکومت قائم تھی۔ حضرت علیؓ کے زیر خلافت علاقہ میں بھی بہت سے لوگ درپردہ آپ کے مخالف تھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد لوگوں نے امام حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

حضرت حسن نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خلافت کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندر چونکہ اقتدار کی ہوس نہ تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ موجودہ حالات میں ان کا خلافت پر اصرار کرنا صرف ملت کے انتشار میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایک بار اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسین سے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ نبوت وخلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں"

اسی نزاکت کی وجہ سے آپ نے بیعت کے وقت لوگوں سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کروگے"۔

حضرت علیؓ کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن کو خلیفہ بنایا۔ دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے لئے حضرت علی کا اس دنیا سے جانا گویا راستہ صاف ہونے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے حضرت علی کی شہادت کی خبر ملتے ہی اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ بقیہ اسلامی علاقوں (عراق وایران) کو بھی اپنے ماتحت کرکے اپنی حکومت کو مکمل کر لیں۔ امیر معاویہ تجدید بیعت سے فارغ ہونے کے بعد ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر دمشق سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ میں داخلہ سے پہلے انھوں نے امام حسن کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے صلح کر لیں اور مجھ کو خلیفہ وقت تسلیم کر لیں۔ امام حسن کے پاس بھی اس وقت ساٹھ ہزار کا لشکر تھا جو لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ مگر امام حسن نے مسلمانوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ اپنے حق خلافت سے از خود دست بردار ہو گئے اور صرف چھ ماہ خلیفہ رہ کر امیر معاویہ کے ہاتھ کوفہ کی مسجد میں بیعت کر لی۔

امام حسن کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور و غل کیا۔ آپ کو عارالمسلمین (مسلمانوں کے لئے ننگ) کا خطاب دیا، کہا کہ آپ کافر ہو گئے ہیں۔ آپ کے کپڑے نوچے، حتیٰ کہ آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ بن ابوسفیان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا۔ اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔"

ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا اور سلسکھ جو اسلامی تاریخ میں صفین و جمل کے بعد تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی پیچھے ہٹنے ہی کا نام آگے بڑھنا ہوتا ہے اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

حضرت حسنؓ کا یہ عمل کسی قسم کی پسپائی یا فرار نہ تھا۔ یہ انتہائی مکمل سیاست تھی اور عین وہی چیز تھی جس کا نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی سے قائم فرمایا ہے۔

اجتماعی زندگی کا معاملہ انتہائی نازک معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اقدام اور مقابلہ کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتا ہو تو وہ کبھی اجتماعی اصلاح کے میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی مختلف الخیال قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں ناقابل قیاس حد تک مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس لئے اجتماعی زندگی میں طریق عمل کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ ان طاقتوں کو سمجھا جائے جو بالمقابل محاذ میں مصروف کار ہیں اور اپنی اور دوسروں کی حقیقی صورت حال کا موازنہ کر کے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ یہ کام بیک وقت نہایت گہری نگاہ کا طالب ہے اور اسی کے ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ذہن کا بھی۔ اجتماعی مقابلہ میں کبھی اپنے آپ کو مکمل طور پر نظریاتی تبلیغ کے دائرہ میں محدود رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال مکہ کے ابتدائی بارہ سال ہیں۔ کبھی حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے چیلنج کو میدان جنگ میں قبول کیا جائے۔ اس کی ایک مثال غزوۂ بدر ہے۔ کبھی دوررس نتائج کو پانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ فریق ثانی سے براہ راست تصادم کرنے سے بچا جائے خواہ اس کی قیمت یہی کیوں نہ ہو کہ فریق ثانی کے یک طرفہ مطالبات مان لینے پڑیں۔ اس کی ایک مثال معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں یہ سیاست کا صبر ہے۔ جو شخص سیاست میں صابرانہ طریق کار کا ثبوت نہ رکھتا ہو اس سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو سیاست کے میدان میں داخل نہ کرے۔

کامیاب اقدام وہی کر سکتا ہے جو کامیاب پسپائی کا راز جانتا ہو۔ پیچھے ہٹنا بزدلی نہیں حکمت عملی ہے۔ اقتدار سے نہ ٹکرانا ظلم کو برداشت کرنا نہیں بلکہ ظلم کو جڑ سے مٹانے کی طاقت فراہم کرنا ہے۔ سیاست کو ترک کرنا سیاسی خودکشی نہیں بلکہ معاشرہ کے دیگر عوامل کو بروئے کار آنے کا موقع دینا ہے۔ احتجاج سے گریز کرنا مسئلہ سے صرف نظر کرنا نہیں بلکہ اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کی راہ میں لگانا ہے۔ جو شخص فوری ردعمل کے تحت سیاست کے میدان میں کود پڑتا ہے اس سے زیادہ سیاست سے ناواقف اور کوئی نہیں۔

خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا

حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴۰۰-۱۵۲۰ ق م) کی آمد سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے یہ واقعہ ہوا کہ فلسطین اور شام کے علاقے کے کچھ عرب، جن کو "عمالیق" کہا جاتا تھا، مصر میں داخل ہوئے اور وہاں کے مقامی حکمرانوں کے آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مصر کی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام (۱۷۹۶-۱۹۰۶ ق م) جب نوجوانی کی عمر میں فلسطین سے مصر پہنچے تو اس وقت مصر پر اُن کے انھیں ہم قوموں کی حکومت تھی۔ ایک عورت کی پیدا کردہ بعض ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کو مصر میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے اور آپ کے اندر غیر معمولی انتظامی صلاحیت تھی۔ مصری حکمرانوں کو نسلی قربت کی وجہ سے آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ آپ کے زمانہ کے عرب بادشاہ اپوفیس نے آپ کے دین کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی حکومت کا تمام کاروبار آپ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اپنے والد حضرت یعقوب (اسرائیل) اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا۔ یہ لوگ تقریباً چار سو سال تک مصر کی حکومت پر چھائے رہے۔ مصر کے آئینی حکمراں اگرچہ اب بھی مشرک عمالیق تھے مگر حکومت پر عملاً بنی اسرائیل ہی کا قبضہ تھا۔

بنی اسرائیل ابتداءً جب مصر آئے تو ان کو یہاں کی انتہائی زرخیز زمینوں میں بسایا گیا اور حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب ان کے لئے مخصوص رہے۔ مگر یہ اکثریت کے اوپر اقلیت کی حکومت تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق یعقوب (اسرائیل) کا گھرانا جو ملک مصر منتقل ہوا، ان کی تعداد حضرت یوسف کو ملا کر ۶۸ تھی۔ توالد و تناسل نیز تبلیغ کے ذریعے دور قدیم کے ان "مسلمانوں" کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ پانچ سو برس بعد جب حضرت موسیٰ نے مردم شماری کرائی تو صرف ان کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس زمانے کی مصری آبادی کے قطعی اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، تاہم تخمینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی اس زمانے کی آبادی میں بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً دس فی صد ہوگی۔

حضرت یوسف نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی۔ آپ کے تین چار سو سال بعد مصر میں عرب حکمرانوں کے خلاف ردعمل ہوا لمبے خون خرابے کے بعد بالآخر قبطی غالب آئے۔ "بیرونی حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا اور مصر پر ایک قبطی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جس کے حکمرانوں نے "فرعون" کا لقب اختیار کیا۔

قبطی حکومت کے قیام کے بعد اگرچہ ڈھائی لاکھ عربوں کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ تاہم بنی اسرائیل اب بھی وہاں رکھے گئے تاکہ نئے حکمرانوں کے لئے بیگار کا کام دے سکیں۔ بائبل کے الفاظ میں: "مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ اور ان کی ساری خدمت جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" خروج ۱: ۱۳-۱۴

حضرت موسیٰؑ تشریف لائے تو بنی اسرائیل اسی دورِ مشقت سے گزر رہے تھے۔ آپ نے قبطی فرعونی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب حیثیت اختیار کرنے کے بجائے خود ان کے اوپر اقدام کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے دعوت دینی شروع کی کہ دینِ خداوندی کو اختیار کرو، ورنہ تم سب کے سب تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ یہ چیز فرعون کے غصہ میں صرف اضافہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے لئے مصر کی زندگی آپ کے آنے کے بعد تلخ تر ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس میں مزید یہ اضافہ ہوا کہ شاہی حکم کے تحت بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کیا جانے لگا تاکہ ان کی نسل دھیرے دھیرے مصر سے ختم ہو جائے۔ قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران ۱۸۹۶ میں ایک کتبہ ملا ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون منفتاح فخر کے ساتھ کہتا ہے "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"

اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی: "آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں" (اعراف۔ ۱۲۹)

اس انتہائی نازک مرحلہ میں بنی اسرائیل کو جو جواب دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یونس۔ ۸۷	اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کو مصر میں ٹھہراؤ اور اپنے گھروں کو مرکزِ عمل بناؤ[1] اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو

اس آیت میں جو پروگرام دیا گیا ہے، اس کو حسب ذیل طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جہاں ہو، وہاں جمے رہو۔ اپنے اندر خوف وانتشار کو جگہ مت دو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حضرت مسیحؑ نے ان لفظوں میں کہا تھا: جب تک عالمِ بالا سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو (لوقا ۲۴ : ۴۹)

۲۔ اپنے گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالو، یعنی باہمی اتحاد، اندرونی استحکام، آپس کے صبر و نصیحت اور ذاتی ذرائع پر انحصار، یہ وہ چیزیں ہیں جن پر تمھیں موجودہ حالت میں اپنی توجہات کو مرتکز رکھنا چاہیے۔

۳۔ نماز قائم کرو۔ یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرو، اس کی یاد، اس سے مانگنا، اس کے آگے اپنے آپ کو بالکل جھکا دینا، ان صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرو۔

۴۔ یہی وہ طریق عمل ہے جس میں تمھارے لئے دنیا و آخرت کی تمام خوش خبریاں چھپی ہوئی ہیں۔ پوری یکسوئی کے ساتھ ان کی تکمیل میں لگ جاؤ۔ اس سہ نکاتی پروگرام کو مختصر طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں ___ استقامت، داخلی تعمیر، تعلق باللہ۔ اس پروگرام پر عمل کرنے کا بالآخر جو نتیجہ نکلا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

اور جو لوگ کمزور کر دیئے گئے تھے ہم نے ان کو زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے۔ اور تمھارے رب کا بہترین کلمہ بنی اسرائیل کے لئے پورا ہو کر رہا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو اس کی صنعتوں اور اس کے فارموں کے ساتھ مٹا کر رکھ دیا۔ اعراف۔ ۱۳۷

[1] تبوآ لقومکما بمصر بیوتا کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے: ساکن کنید قوم خود را بشہر مصر در خانہا قبلہ کا لفظ قَبِلَ کا اسم نوع ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے "مرکزِ توجہ"۔ کہتے ہیں قبلت الماشیۃ الوادی: جانور وادی کی طرف متوجہ ہوئے

ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھا گیا

جنگ قادسیہ (۱۴ ھ) میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایرانی لشکر سے ان کا ایک مشہور پہلوان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اسلامی لشکر سے عاصم بن عمرو اس کے مقابلہ کے لئے باہر آئے۔ ابھی ایک دو وار ہی ہوئے تھے کہ ایرانی شہ سوار بھاگا۔ عاصم بن عمرو نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے لشکر کی صف اول کے قریب تک جا چکا تھا کہ عاصم بن عمرو پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دم کو پکڑ کر اس کو روک لیا۔ سوار کو اس کے اوپر سے اٹھایا اور زبردستی اپنے گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا اور اس کے بعد گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے لشکر میں آ گئے۔

اس قسم کے بہادر لوگ صفین و جمل (۳۶ ھ) کی باہمی لڑائیوں میں ۹۰ ہزار کی تعداد میں کٹ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت و قوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے اٹھا تھا ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا۔ صرف آسٹریلیا اور امریکہ ممکن طور پر اس سے مستثنیٰ رہ جاتے جو وسیع سمندروں کے دوسری طرف قدیم زمانہ میں ناقابل عبور تھے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلاب کے رخ کو باہر کے بجائے خود اپنی طرف موڑ دیا۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ یہ ایک خاندانی جھگڑا تھا جس نے بڑھ کر قومی جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر ساری اسلامی تاریخ پر چھا گیا۔

۲۰۷ء میں سیل عرم سے یمن میں عام تباہی آئی۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں کا رخ کیا۔ ان میں سے قبیلہ خزاعہ مکہ آیا اور حضرت اسمٰعیل (۱۹۳۷-۲۰۷۴ ق م) کی اولاد کو بے دخل کر کے مکہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی باشندے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک قبیلہ خزاعہ مکہ پر قابض رہا۔ قصی بن کلاب پہلا شخص ہے جس نے قریش کی بکھری ہوئی طاقت کو دوبارہ منظم کیا اور ۴۴۰ء میں لڑ بھڑ کر خزاعہ سے مکہ کی سرداری چھین لی۔

قصی نے خانہ کعبہ کی مرمت کی۔ رفادہ، سقایہ، حجابہ اور قیادہ کے عہدے قائم کئے۔ قومی نشان کے طور پر لوا بنایا۔ قومی اسمبلی قائم کی جس کو دار الندوہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر قصی کو تمام قبائل قریش کی سرداری حاصل ہو گئی۔

قصی کے بعد قریش کی سرداری ان کی اولاد میں جاری رہی۔ تاہم تیسری نسل میں قصی کے خاندان میں سرداری پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ قصی کا پوتا ہاشم نہایت لائق اور شاندار شخصیت کا آدمی تھا۔ اس نے تجارت کر کے نہ صرف اپنے مال میں اضافہ کیا بلکہ قریش کو بھی بین اقوامی تاجر کے مقام پر پہنچا دیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شاہ غسان، شاہ حبش، امرائے یمن اور عراق و فارس کی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کئے اور خصوصی مراعات حاصل کیں وہ قیصر روم سے یہ پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قریش کا تجارتی مال شام و فلسطین میں بغیر کسی ٹیکس کے

داخل ہوتا رہے گا۔ اب قریش کے تجارتی قافلے گرمی کے زمانہ میں شام کی طرف جانے لگے، کیونکہ وہ ٹھنڈا اور شاداب علاقہ تھا اور جاڑے میں یمن کی طرف سفر کرنے لگے جو کہ گرم علاقہ ہے۔ (قریش - ۲) ہاشم کے حسن تدبر سے قریش کی اقتصادیات نے بہت تیزی سے ترقی کی اور نتیجۃً سارے قبیلہ میں ان کی عظمت قائم ہوگئی۔

ہاشم کی اس عزت و ترقی نے خاندان کی دوسری شاخ کے اندر ان کے خلاف منافست پیدا کر دی۔ ہاشم کے بھائی عبد شمس اور ان سے زیادہ ان کے بیٹے امیہ کو ہاشم کی سرداری ناپسند تھی۔ امیہ نے اس کو اپنے چچا سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے حتیٰ کہ اسی رنج و غم میں وہ ایک بار مکہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور دس سال تک وہاں پڑے رہے۔

ہاشم کے بعد دوبارہ ان کے بیٹے عبدالمطلب اپنی وجاہت و صلاحیت کی بنا پر قریش کے سردار ہوگئے اور امیہ کی اولاد اس سے محروم رہی۔ اس طرح سرداری قصی کی ہاشمی شاخ میں چلتی رہی اور اس کی اموی شاخ کو حاصل نہ ہو سکی۔

سنہ ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار اصحاب کے ساتھ فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے ایک موقع پر اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ابوسفیان کو لے کر راستہ میں کسی گھاٹی پر بیٹھ جائیں تاکہ ابوسفیان، جو بدر کے بعد قریش کے سب سے بڑے لیڈر تھے، اسلامی فوج کو گزرتے ہوئے دیکھیں۔ حضرت عباس نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ ابوسفیان کو لے کر ایک تنگ پہاڑی راستہ کی طرف گئے اور وہاں بیٹھنے کے لئے کہا تو ابوسفیان کو اندیشہ ہوا۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

غدراً یا بنی هاشم　　بنی ہاشم! کیا غداری کا ارادہ ہے۔

اس کے بعد جب دس ہزار کی تعداد میں مسلح فوج سامنے سے گزری، تو ابوسفیان پر ہیبت طاری ہوگئی۔ انھوں نے کہا:

لقد اصبح ملك ابن اخيك الغداة عظيما　　تمہارے بھتیجے کی حکومت آج بہت عظیم ہوگئی۔

خاندان عبد مناف کی ان دو شاخوں میں یہ چپقلش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں یمن کا ایک شخص کچھ سودا لے کر مکہ آیا، ایک شخص نے اس کا سودا خریدنے کے لئے لیا اور پھر اس کو نہ قیمت دی اور نہ سودا واپس کیا وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر چیخنے لگا۔ یہ واقعہ عرب آن کے انتہائی خلاف تھا، چنانچہ بنو ہاشم کے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھے۔ انھوں نے آپس میں عہد کیا کہ مکہ میں اگر کسی مسافر او راجنبی کو ستایا گیا تو وہ اس کی پوری حمایت کریں گے۔ بنو ہاشم کے ساتھ اس معاہدہ میں بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم بھی شریک ہوگئے۔ مگر عبد شمس کا خاندان بنو ہاشم کے خلاف اپنی جلن کی وجہ سے معاہدہ میں شریک نہیں ہوا۔

اس طرح کے واقعات جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، وہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان اسی خاندانی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

قصی بن کلاب کے خاندان کی دو شاخوں میں سرداری کی منافست جاری رہی، اکثر چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ہاشم کے خاندان میں پیغمبر پیدا ہوگئے۔ اب اموی خاندان کی جلن اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

پہلے انھوں نے نبوت کی مخالفت کر کے بنی ہاشم کو زیر کرنا چاہا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام مخالفین کو شکست دے کر مکہ پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ نبوت کی مخالفت کرنا فضول ہے۔ ابوسفیانؓ ان کے لڑکے معاویہ اور دوسرے امویوں نے اسلام قبول کر لیا تاہم یہ احساس لوگوں کے اندر باقی رہا کہ نبوت کے بعد سیاسی اقتدار بنی ہاشم کے ہاتھ میں نہ جانے دیں گے۔

حضرت عمرؓ اپنے بعد علیؓ بن ابی طالب کو خلافت کے لئے موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر غالباً اسی اندیشہ کی بنا پر وہ آنجناب کو نامزد نہ کر سکے۔ حضرت عثمانؓ جو خاندان امیہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو بنوامیہ کے لئے یہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد قصاص کے مسئلہ نے ان کو فوری طور پر ایک کامیاب سیاسی حربہ دے دیا۔ اس جذباتی نعرہ پر انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ خلیفہ چہارم کو منصب خلافت سے ہٹادیں۔ تاہم معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ نے اپنی گورنری سے فائدہ اٹھا کر مملکت اسلامی کے نصف سے زیادہ حصہ کو سیاسی طور پر کاٹ لیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے نام پر عوام میں ایسی آگ بھڑکائی کہ کچھ لوگوں نے مجنونانہ طور پر حضرت علی کو قتل کر دیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین جس میں ۹۰ ہزار مسلمان کٹ گئے اور دس سال کے لئے اسلام کی توسیع کا سیلاب رک گیا، وہ دراصل امویوں اور ہاشمیوں کی اسی خاندانی لڑائی کا شاخسانہ تھا جس نے پوری ملت مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حسن بن علی اس راز کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین بن علی کو بھی مشورہ دیا کہ خلافت کے معاملہ سے بالکل الگ ہو جائیں کیونکہ لوگ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ نبوت اور خلافت دونوں کو علوی خاندان میں جمع ہونا برداشت کریں۔ مگر حضرت حسین کی رائے یہ تھی کہ حق کے لئے جان دے دینا باطل کے آگے سر جھکانے سے زیادہ بہتر ہے۔ انھوں نے خلافت کی راہ میں اپنی جان دے دی۔ یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے۔

اس کے بعد اموی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر بنوامیہ کو بنوہاشم کے خلاف جو بغض وعناد تھا، وہ ان کے انتظام ملکی میں ظاہر ہوتا رہا حتیٰ کہ ان کا ذہن یہ بن گیا کہ ہاشم کی اولاد کا خاتمہ کر دو تاکہ مستقبل میں کوئی خلافت کا دعوے دار باقی نہ رہے۔ ان وجوہ سے وہ فضا پیدا نہ ہو سکی جس میں بنوہاشم اپنی سیاسی حق تلفی کو بھول جاتے۔ اندر اندر ان کے دل میں مخالفت کی آگ سلگتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ کے خاتمہ نے یہ دوسرا انقلاب دیکھا کہ بنو عباس نے ایرانیوں کی مدد سے بنوامیہ کا خاتمہ کر دیا۔

بنوامیہ کا فتنہ انتہائی شدید تھا۔ مگر وہ تمام تر سیاسی تھا۔ اس لئے سیاست کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر بنوہاشم سے یہ جوابی غلطی ہوئی کہ خلافت کو اپنا حق ثابت کرنے کے لئے انھوں نے خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اس غلطی نے ایک سیاسی قضیہ کو مذہبی حیثیت دے دی اور اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ دوسرے سیاسی

جھگڑوں کی طرح یہ جھگڑا صرف وقتی نقصان پہنچائے اور بعد کی نسلوں کے لئے محض تاریخ کا موضوع بن کر رہ جائے۔

سیاست کو مذہب بنانے کی اس غلطی نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وضع حدیث کا فتنہ سب سے پہلے اسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ بے شمار حدیثیں دونوں طرف سے گھڑی گئیں ایک طرف بنو ہاشم نے حضرت علی کی فضیلت میں یہ حدیث نکالی:

انا مدینۃ العلم و علی بابہا — میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں

دوسری طرف فریق ثانی نے ایک روایت گھڑی اور کہا کہ پوری حدیث دراصل اس طرح ہے:

انا مدینۃ العلم و ابوبکر اساسہا و عمر حیطانہا و عثمان سقفہا و علی بابہا

میں علم کا شہر ہوں، ابوبکر اس کی بنیاد ہیں، عمر اس کی دیوار ہیں، عثمان اس کی چھت ہیں، علی اس کا دروازہ ہیں

اس قسم کی چیزوں سے اسلام کو جو علمی نقصان پہنچا، اس کی تلافی اب ممکن نہیں۔ تاہم یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی رحمت خاص سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان جھگڑوں اور ان کے پیدا کردہ فتنوں میں دین حق گم ہو جاتا اور اللہ کے بندے قیامت تک کے لئے بے آمیز سچائی کو جاننے سے محروم ہو جاتے

تاریخ کی تمام کامیابیاں باہمی اتفاق کا نتیجہ ہیں اور تاریخ کی تمام ناکامیاں باہمی اختلاف کا نتیجہ۔ انسان، خواہ ذاتی طور پر نیک اور مخلص کیوں نہ ہوں، ان میں ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے، حتیٰ کہ بعض اوقات بلا وجہ بھی، دو افراد یا دو گروہوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اتحاد کی واحد صورت یہ ہے کہ اختلاف کو برداشت کیا جائے۔ کیونکہ اختلاف سے خالی انسانی معاشرہ اس زمین پر ممکن ہی نہیں۔ وہی لوگ کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں جو ذاتی اعتبارات پر قومی اعتبارات کو ترجیح دے سکیں۔ جو اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا چکے ہوں کہ اختلافی باتوں کو نظر انداز کر کے عملی اتحاد پر قائم رہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں بنتی۔ کسی دشمن کی سازش یا عداوت ان کو نقصان پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔ ان کا ہر حال میں متحد رہنا ایک ایسی طاقت بن جاتا ہے جو ہر امکانی صورت حال سے نمٹنے کی یقینی ضمانت ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ ذاتی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہ جانتے ہوں، جو ذاتی اختلافات کو اجتماعی مفاد پر قربان نہ کر سکیں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ ان کی کوششیں یا تو محدود ہو کر رہ جاتی ہیں یا خود اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے وسائل اور مواقع کو اپنے اندرونی جھگڑوں میں برباد کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر ہمیشہ ایسے کمزور گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے ان کا دشمن ان کے اندر گھس آئے اور ان کے بارے میں اپنے خطرناک منصوبوں کو پورا کر سکے ——— یہ اختلافی سیاست اس وقت اور زیادہ مہلک ہو جاتی ہے جب کہ اس کو عقیدہ بنا لیا جائے۔ سیاسی اختلاف کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جب اس کو اعتقادی اختلاف کا درجہ دے دیا جائے تو اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں تک کہ خدا خود ظاہر ہو کر فیصلہ فرما دے۔

حیوانیت کی سطح پر

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ حکومت (۹۷۳-۱۰۱۳ ق م) میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایلات (Elath) کے مقام پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ انھوں نے قانون سبت کی خلاف ورزی کی۔ ان کی شریعت میں سبت (سنیچر) کے دن معاشی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ مگر وہ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں کثرت سے دریا میں آتی تھیں اور بقیہ دنوں میں پانی کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ یہود نے یہ شرعی تدبیر کی کہ دریا کے کنارے گڑھے بنائے۔ وہ دریا کا پانی کاٹ کر گڑھے میں ملا دیتے۔ سنیچر کے دن جب مچھلیاں گڑھے میں آجاتیں تو وہ نکلنے کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے دن اتوار کو وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔

یہ تدبیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ ان پر یہ بات صادق نہ آئے کہ وہ سبت کے دن شکار کرتے ہیں۔ دین کے نام پر یہ بے دینی اللہ کو اتنی زیادہ ناپسند ہوئی کہ ان پر اللہ کی لعنت ہوئی۔ وہ بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰) ــــــ عملاً یہی حالت اگرچہ پوری قوم یہود کی تھی۔ تاہم ایک خاص مقام کے یہودیوں کے باطن کو غالباً ظاہری طور پر بھی مجسم کر دیا گیا تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو (بقرہ ٦٦)

بندر اور سور بنانے سے کیا مراد ہے، اس بارہ میں مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ اکثریت نے ظاہر الفاظ پر قیاس کرتے ہوئے یہ مراد لیا ہے کہ مذکورہ گروہ حقیقی معنوں میں بندر اور سور بنا دئے گئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس سے کوئی واضح بات ثابت نہیں۔ حدیث میں صرف اتنا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ موجودہ بندر اور سور کیا قدیم مسخ شدہ اقوام کی نسلیں ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ حیوانات ہمیشہ سے اسی طرح ہیں (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی

مجاہد کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی صورت میں تبدیل نہیں کئے گئے بلکہ ان کے دل مسخ کر دئے گئے (قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ۔ وانما ھو مثل ضربہ اللہ : کمثل الحمار یحمل اسفارا) ابو العالیہ کا قول ہے کہ کونوا قردۃ خاسئین سے مراد یہ ہے کہ وہ پست اور حقیر بنا دئے گئے (یعنی اذلۃ صاغرین) یہی رائے قتادہ اور ربیع اور ابو مالک کی بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۰۶-۱۰۵) موجودہ زمانہ کے مفسرین میں شیخ رشید رضا نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (المنار)

سور کی خصوصیت کیا ہے۔ ستھری چیز کو چھوڑ کر، گندی چیز کو اپنی خوراک بنانا، اس کی ایک صورت وہ ہے جو کمائی اور لین دین میں ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی حلال ذرائع پر قانع نہ رہ کر حرام سے اپنا پیٹ

بھرنے لگتا ہے (مائدہ۔ ۶۴)۔ دوسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے :
اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں (اعراف ۱۴۶)

ایسے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ مثبت چیزوں کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں، ان کو اصلاح کے کاموں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے کاموں کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں جن کا نتیجہ نسلوں اور کھیتیوں کی ہلاکت ہو۔

ان کے سامنے تعمیری کام کے مواقع کھلے ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کو چھوڑ کر تخریب کے راستوں میں تیزی دکھاتے ہیں۔ ابنار نوع کے لئے نفع بخش بننے کا شوق ان میں نہیں ابھرتا۔ البتہ ان کو نقصان پہنچانے کے نعرہ پر وہ بآسانی جمع ہو جاتے ہیں۔ خاموش خدمت میں ان کے لئے اپیل نہیں ہوتی البتہ نمائشی ہنگاموں میں وہ خوب دل چسپی دکھاتے ہیں۔ حقیقی فائدہ کے منصوبوں میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ بے فائدہ مشغلوں میں وہ اپنا وقت اور مال خوب خرچ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلائیے تو وہ لبیک نہ کہیں گے البتہ زندہ یا مردہ شخصیتوں کی پوجا کے نام پر وہ جوق در جوق اکٹھا ہو جائیں گے۔

بے دینی کو دین کے نام پر کرنا بدترین جرم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے آدمی کے اندر سے صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بے حس انسان بن جاتا ہے۔ دین اور بے دینی دونوں اس کو یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آتی ہے جب کہ اس میں بندر اور سور کی اخلاقیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بندر کی خصوصیت کیا ہے۔ فساد اور بے حیائی۔ کسی مکان میں بندروں کا غول داخل ہو جائے تو وہ فوراً بے معنی اچھل کود اور توڑ پھوڑ شروع کر دے گا۔ ایسا ہی کچھ حال اس قوم کا ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتی۔ تاہم عملاً وہ خدا کی زمین پر اس طرح رہنے لگتی ہے جیسے اس زمین کا کوئی مالک نہیں ہے۔ جیسے نہ کبھی خدا سے اس کا سامنا ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب دینا ہے ——— بدنظمی، غیر ذمہ دارانہ زندگی، بے معنی کارروائیاں، آپس کی چھین جھپٹ، ایک دوسرے پر غرانا، ہمدردی اور انصاف کے بجائے ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنا لینا، یہ اس کی عام زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان مگر عملاً بندر صفت ہو جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی آبادی میں اس طرح رہنے لگتے ہیں جیسے بندر جنگلوں کی آبادی میں۔

کتنا فرق

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مدینہ میں نفاق نے سر اٹھایا اور عرب اور عجم میں ارتداد پھیل گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے عرب کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ اس وقت خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کہا کہ ان عربوں نے اپنی بکریوں اور اپنے اونٹوں کو روک دیا ہے۔ اور اپنے دین سے پھر گیے ہیں۔ اور عجم کے لوگ نہاوند میں جمع ہیں تاکہ ہم سے جنگ کریں۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ وہ شخص جس کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی تھی وہ وفات پاگیا۔ اے لوگو اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد لوگ سر جھکا کر خاموش ہو گیے اور دیر تک خاموش رہے۔ آخر حضرت عمر بن الخطاب گویا ہوئے اور انھوں نے کہا (فاطرقوا طویلاً ثم تکلم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، فقال) حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۴۳۲)

حضرت ابوبکر صدیق کے سوال کے بعد لوگ کیوں دیر تک خاموش رہے۔ اس کی وجہ ان کی سنجیدگی اور ان کا تقویٰ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے سوچتے تھے اور اس کے بعد بولتے تھے۔ وہ ہر قول اور ہر فعل سے پہلے اللہ سے ہدایت اور رہنمائی کی دعا کرتے تھے۔ جب خلیفۂ اول نے مذکورہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو اپنے مزاج کے مطابق سب کے سب سوچ میں غرق ہو گیے۔ ہر ایک دل ہی دل میں اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ہر ایک پر خاموشی طاری کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ خاموشی ایک عظیم گفتگو تھی، ان کا یہ سر جھکانا سب سے بڑا اقدام تھا۔ چنانچہ وہ جب بولے تو ان کا بول تمام بولوں پر بھاری ہو گیا۔ جب وہ اٹھے تو ان کا اٹھنا تمام دشمنوں کو پست کرنے کے ہم معنی بن گیا۔ کیوں کہ ان کا بول خدا کی رہنمائی کے تحت تھا، ان کے اقدام میں خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

اب دیکھیے کہ اس معاملہ میں موجودہ مسلمانوں، خاص طور پر ان کے رہنماؤں، کا کیا حال ہے اس کا منظر دیکھنا ہو تو مسلمانوں کی کسی ایسی مجلس میں شریک ہو کر دیکھ لیجیے جو اس نوعیت کے

ہنگامی مسئلہ پر اکٹھا ہوئی ہو۔ مثلاً فلسطین، فرقہ وارانہ فساد، بابری مسجد، سلمان رشدی۔ جیسے مسائل۔ آپ دیکھیں گے کہ موضوع کا ذکر چھڑتے ہی ہر آدمی لسانی جہاد کا شہنشاہ بن گیا ہے۔ ہر آدمی پر جوش طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بولے، اور آتشیں الفاظ کی پوری ڈکشنری کو بیک وقت اپنی زبان سے دہرا ڈالے۔

مگر یہ لفظی جوش دکھانے والے عمل کے وقت پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔ مارچ کے موضوع پر تقریروں کا دریا بہانے والے مارچ کی تاریخ آنے کے بعد خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ رہتے ہیں۔ بول میں آگے رہنے والے عمل میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بحث میں سب سے پہلے کھڑے ہونے والے اس وقت سر جھکا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں جب کہ عملی اقدام کا وقت سر پر آگیا ہو۔

جو برتن جتنا زیادہ خالی ہو، وہ اتنا ہی زیادہ آواز دیتا ہے۔ اسی طرح جو آدمی جتنا زیادہ بے عمل ہو اتنا ہی زیادہ وہ پُرشور الفاظ بولتا ہے۔ بولنے والے کرتے نہیں، اور کرنے والے بولتے نہیں۔ اور حقیقت کی دنیا میں کرنے کی قیمت ہے نہ کہ بڑے بڑے الفاظ ہوا میں بکھیرنے کی۔

الٹا نتیجہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز عرب کے شہر مکہ سے کیا۔ اس وقت مکہ میں قبیلہ قریش کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ وہ آپ کے سخت مخالف ہوگیے۔

اس ابتدائی زمانہ میں قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کارروائیاں کیں، ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ وہ ولید بن المغیرہ کے پاس جمع ہوئے جو ان کے درمیان اپنی دانشمندی اور اپنی تجربہ کاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ انھوں نے ولید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ محمد کے بارے میں ایسی باتیں لوگوں کے درمیان پھیلادیں کہ وہ ان سے متوحش ہوجائیں اور ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کے درمیان مشورہ ہوا کہ لوگوں کے سامنے محمدؐ کی تصویر کس طرح پیش کی جائے۔ کسی نے کہا کہ ہم یہ مشہور کریں کہ وہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو دیوانہ بتائیں۔ کسی نے یہ کہا کہ ہم ان کو شاعر کہیں۔ ولید نے اس قسم کی تمام رایوں کو رد کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہم کاہن اور دیوانہ اور شاعر کو جانتے ہیں۔ محمد کا کلام ان میں سے کسی کے کلام کے مشابہ نہیں۔ تم اس قسم کی جو بات بھی لوگوں سے کہوگے، اس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہو جائے گا (وَمَا انتُم بِقَائِلِين مِن هٰذا شيئاً الّا عُرِفَ أنّه باطل) صفحہ ۲۸۴

لوگوں نے ولید سے کہا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم محمدؐ کو کیا کہیں۔ اس نے کہا کہ سب سے قریب تر بات یہ ہے کہ ان کو جادوگر بتایا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا ساحرانہ کلام پیش کر رہے ہیں جس کے ذریعہ سے خاندان کے افراد میں جدائی ہوگئی ہے اور ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے کٹ گیا ہے۔

قریش کے لوگ اس رائے پر متفق ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گیے۔ اس کے بعد جب حج کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ زیارت کعبہ کے لیے مکہ آنے لگے تو قریش کے مخالفین مکہ کے چاروں طرف راستوں پر بیٹھ گیے۔ جو شخص ان کے پاس سے گزرتا اس کو روکتے اور بتاتے کہ دیکھو، یہ شخص (محمدؐ) جادوگر ہے۔ وہ ساحرانہ باتیں کرتا ہے۔ تم

اس سے بچ کر رہو۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے اس متفقہ رائے پر باقاعدہ عمل کیا۔ چنانچہ حج کے بعد جب یہ تمام آنے والے لوگ اپنی بستیوں کو واپس ہوئے تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ خبر بھی اپنے ساتھ لے گیے۔ اور جو لوگ زیارتِ کعبہ کے لیے مکہ نہیں آسکے تھے ان کو قریش کی بات بتانے لگے۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ عرب کے تمام شہروں میں پھیل گیا۔ (فانتشر ذکرہ فی بلاد العرب کلھا) سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، ۲۸۶۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر رفع ذکر (الانشراح ۴) کہا گیا ہے۔ جب حق کا ایک داعی حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن کے قیادتی مصالح یا معاشی مفادات اس سے ٹکرا رہے ہوں۔ وہ دعوت اور داعی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف بے بنیاد الزامات گڑھتے ہیں اور ان کو چاروں طرف پھیلاتے ہیں تاکہ داعی لوگوں کے درمیان بدنام ہو جائے۔ لوگ اس کی باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دیں۔

مگر لوگوں کی مخالفانہ کوششوں کا عملی نتیجہ برعکس صورت میں نکلتا ہے۔ داعی کو بدنام کرنے کی کوشش داعی کے پیغام کو پھیلانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بدنام کرنے کی کوشش عملاً لوگوں کے اندر تجسس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ وہ داعی اور دعوت کے بارہ میں مزید جاننے کے شائق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دعوت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک معقولیت پسند مخلوق ہے۔ وہ کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس کی عقل بھی اس کے حق میں گواہی دے رہی ہو۔ چنانچہ مخالفین جب اپنی بے بنیاد باتیں لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں تو خود اپنی اندرونی فطرت کے تقاضے کے تحت لوگ اس کا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں مزید تفصیلات جانیں اور پوری معلومات کی روشنی میں اپنی رائے قائم کریں۔

اس طرح داعی کے مخالفین اس بات کا ذریعہ بنتے ہیں کہ داعی جن لوگوں تک بذاتِ خود نہیں پہونچا تھا ان لوگوں تک بھی داعی کی بات پہونچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ داعیٔ حق کے خلاف پروپیگنڈا ہمیشہ داعی کے حق میں جاتا ہے۔ اس طرح زیادہ وسیع حلقہ میں داعی کی بات پہونچ

جاتی ہے۔ وہ خود تلاش کر کے داعی کے کلام تک پہونچتے ہیں اور اس کو سن کر یا پڑھ کر تفصیلی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی کی طلب ہوتی ہے وہ داعی کے دین کو اختیار کر کے اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

آدمی اگر صحیح معنوں میں حق کو لے کر اٹھے تو نہ صرف اس کا براہ راست عمل دعوت کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ مخالفین کا مخالفانہ عمل بھی بالواسطہ طور پر اس کی دعوت کی توسیع واشاعت کا ذریعہ بن جاتا ہے —— مخالف کی مخالفت سے نہ گھبرائیے، بلکہ اپنے آپ کو پوری طرح حق پر کھڑا کر لیجئے۔ اور اس کے بعد آپ کے مخالفین کا منفی شور وغل بھی آپ کے حق میں ایک مثبت سرمایہ بن جائے گا۔

مردہ لوگ

دینی دعوت کا کام کرنے کے دو میدان ہیں۔ ایک ہے بنو اسرائیل جیسے لوگوں میں کام کرنا، جس کا ایک نمونہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا ہے بنو اسماعیل جیسے لوگوں میں کام کرنا، جس کی روشن مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

بنو اسرائیل (یہود) نے حضرت مسیح کی بدترین مخالفت کی۔ انتہائی کھلے ہوئے معجزات اور انتہائی طاقتور دلائل کے باوجود انھوں نے حضرت مسیح کا اقرار نہیں کیا۔ اپنی تمام ممکن تدبیروں سے وہ حضرت مسیح کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے آخری مرحلہ میں کینہ پن کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے حضرت مسیح پر جھوٹے الزام لگائے۔ حضرت مسیح کے الفاظ میں وہ " ابن آدم کو رومی عدالت میں لے گئے " وہ خود حضرت مسیح کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ پر جھوٹے الزامات لگا کر رومی حکمرانوں کے ذریعہ آپ کو ہلاک کریں۔ اس معاملہ میں ظلم اور کینہ پن کی جتنی صورتیں ان کے بس میں تھیں وہ سب انھوں نے آخری حد تک کر ڈالیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیر سے آپ کو بچا لیا۔

بنو اسرائیل (یہود) اس وقت ایک انتہائی بے جان قوم بن چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم میں چند افراد سے زیادہ آپ کا ساتھ دینے والے نہ نکل سکے۔ پیغمبرانہ مشن کا ساتھ دینے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر اعلیٰ انسانیت زندہ ہو۔ وہ برتر مقصد کی خاطر جینے اور مرنے کا حوصلہ کر سکے۔ مگر مردہ قوم اس صلاحیت سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسرائیل کی بھیڑ میں سے چند افراد بھی نہیں نکلے جو حضرت مسیح کے پیغمبرانہ مشن کے حامل بن سکیں۔

انجیل بتاتی ہے کہ یہود میں سے جو لوگ حضرت مسیح کا ساتھ دینے والے نکلے ان میں سے خاص لوگوں کی تعداد بارہ تھی۔ یہودیوں کی سازش کے تحت جب رومی سپاہیوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو انجیل کے الفاظ میں " سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے " (متی، باب ۲۶) دوسری جگہ انجیل میں ہے " اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر ایک جوان اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیا۔ اسے لوگوں نے پکڑا مگر وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ گیا " (مرقس، باب ۱۴)

خدا کی سنّت

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ فرعون نے حق کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کے مقابلے میں سرکشی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور آرام دہ مکانات اور عیش کے سامان جن میں وہ خوش رہتے تھے چھوڑ دیئے۔ اللہ مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے اور ان چیزوں کا وارث اللہ نے دوسروں (بنی اسرائیل) کو بنا دیا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انھیں مہلت مل سکی۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو ذلّت کے عذاب سے نجات دی یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ سرکش اور حد سے نکل جانے والا تھا۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا والوں پر ترجیح دی۔ اللہ نے ایسا اپنے علم کی بنا پر کیا اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ (الدّخان ۲۵-۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا اتفاقی طور پر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے دوسری قوم کے اوپر غالب آگئی۔ یہ تمام تر خدا کے علم کے تحت ہوتا ہے۔ یہ خدا ہے جو خود اپنے فیصلہ کی بنا پر ایک کے لیے مغلوبیت کا اور دوسرے کے لیے غلبہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ فیصلہ اس استحقاق کی بنا پر ہوتا ہے جو کسی قوم نے علمِ الٰہی کے مطابق اپنے لیے ثابت کیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جب ایک قوم غالب اور دوسری قوم مغلوب ہو جائے تو دونوں کو چاہیے کہ اس واقعہ کو وہ خدا کی طرف منسوب کریں نہ کہ کسی اور کی طرف۔ اگر یہ ذہن ہو تو دونوں صحیح راستہ پر قائم رہیں گے۔ غالب قوم اپنے غلبہ پر خدا کا شکر ادا کرے گی نہ کہ وہ غلبہ کو اپنا کارنامہ سمجھ کر فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔

دوسری طرف مغلوب قوم اگر مغلوب ہونے کے بعد غالب قوم کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم شروع کر دے تو یہ اس کے لیے سراسر ایک غلط فعل ہوگا۔ کیوں کہ غالب قوم خدا کے علم اور فیصلہ سے غالب ہوئی ہے نہ کہ محض اپنی سازشوں یا جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے اس نے غلبہ پایا ہے۔ ایسی حالت میں مغلوب

قوم کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ان اندرونی خامیوں کو دور کرے جس کی وجہ سے وہ خدا کی نظر میں یہ استحقاق ثابت ہوئی ہے۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو نہ کہ مفروضہ ظالموں کی طرف۔ جب اصل کرنے والا خدا ہے تو دوسروں کے خلاف ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔

یہ بات سادہ معنوں میں محض توجیہہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے جس پر قوموں کا مستقبل بنتا ہے، یہی وہ بات ہے جس پر قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صحیح ذہن سے صحیح منصوبہ بندی وجود میں آتی ہے۔ اور اگر ذہن غلط ہو تو منصوبہ بندی بھی غلط ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی جدید تاریخ اس کی نہایت واضح اور عبرت ناک مثال پیش کرتی ہے۔

جدید دور میں مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں سے مغلوب ہو گیے۔ کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کے اوپر غیر مسلم قوموں کا غلبہ قائم ہو گیا اور کہیں بالواسطہ طور پر۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اکثر ملکوں میں غیر مسلم اقوام کا براہِ راست غلبہ بظاہر ختم ہو گیا ہے۔ تاہم ان کا بالواسطہ غلبہ بدستور مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔

اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے جواب میں ایک ہی کام کیا ہے۔ اور وہ ہے غیر مسلم اقوام کے خلاف چیخ پکار، یا ان سے ٹکراؤ۔ تاہم ایک صدی سے بھی زیادہ مدت کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی لفظی چیخ پکار فضا میں گم ہو گئی اور ان کی ٹکراؤ کی سیاست آخر کار صرف مزید بربادی پر ختم ہوئی۔ مسلمانوں کو ان کی پر شور کوششوں کا اتنا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا جتنا انھوں نے اپنے بچے ہوئے اثاثہ میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا تھا۔

اس کی واحد وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی غلط ذہن کی وجہ سے غلط منصوبہ بندی۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں غیر مسلم اقوام کے غلبہ کو صرف اس نظر سے دیکھا کہ یہ کچھ ظالم لوگ ہیں جو اپنی سازشوں اور جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اوپر غالب آگیے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کو خود غالب قوموں کا معاملہ سمجھا نہ کہ خدا کا معاملہ، جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری توجہ غالب اقوام کے خلاف جھوٹی چیخ پکار اور جھوٹی لڑائیوں میں صرف ہو گئی۔

اس کے برعکس اگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ذہن قرآن کی روشنی میں بنا ہوتا تو وہ سمجھتے کہ

جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کے علم اور خدا کے فیصلہ کے تحت ہوا ہے۔ یہ خود خدا ہے (نہ کہ کوئی قوم) جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مغلوب کرکے دوسری قوموں کو ان کے اوپر غالب کر دیا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن ہوتا تو وہ قوموں کی طرف دوڑنے کے بجائے خدا کی طرف دوڑتے۔ وہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی اندرونی اصلاح پر سارا زور لگا دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی نظر میں بے استحقاق ہونے کی وجہ سے مسلمان مغلوب کیے گئے تھے۔ اور خدا کی نظر میں استحقاق ثابت کرکے ہی وہ دوبارہ غالب حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ مگر مسلمان بروقت اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پست اور بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

اکابر قوم

قدیم مکہ کے لوگوں نے محمد بن عبد اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اس سے کم سمجھا کہ خدا انھیں اپنے پیغام کی پیغام بری کے لئے چنے۔ چنانچہ انھوں نے آپ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کا کلام اگر اترنا تھا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا (وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم، الزخرف ۳۱)

دو بڑے آدمیوں سے ان کی مراد مکہ کے ولید بن مغیرہ اور طائف کے عروہ بن مسعود ثقفی سے تھی۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۲۷) تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد طائف کا محاصرہ کیا۔ مگر محاصرہ فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکا۔ چنانچہ آپ محاصرہ ختم کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت مذکورہ عروہ بن مسعود کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حقیقت ڈال دی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچنے سے پہلے آپ سے جا ملے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ اپنی قوم میں واپس جائیں اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تم سے جنگ کریں گے۔ عروہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول میں ان کا سردار ہوں اور وہ مجھ کو اپنی آنکھ سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں (انا احب الیھم من ابصارھم وکان مطاعاً فیھم)

چنانچہ وہ طائف واپس آئے۔ انھوں نے طائف والوں کو جمع کیا اور ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ اس کے جواب میں لوگوں نے یہ کیا کہ ہر طرف سے ان کو تیروں سے مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک تیر ان کے نازک مقام پر لگا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ (مکاتیب الرسول، تالیف علی بن حسینعلی الاحمدی، صفحہ ۲۷)

قوم کے اکابر در اصل قوم کا ساتھ دینے کی وجہ سے اکابر بنتے ہیں۔ اگر وہ قوم کی خواہشوں کا ساتھ نہ دیں تو قوم انھیں رد کر دے بلکہ وہ انھیں ہلاک کر ڈالے۔ عروہ بن مسعود حق کا ساتھ دینے سے پہلے اکابر کا درجہ رکھتے تھے، حق کا ساتھ دیتے ہی وہ اصاغر میں شمار کئے جانے لگے۔

دے کر پانا

۱۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک عیسائی تاجر اپنے تجارتی گھوڑوں کو لے کر دریائے فرات کے پاس سے اسلامی سرحد میں داخل ہوا۔ زیاد بن حدیر نے اس سے محصول طلب کیا۔ اس نے محصول ادا کر دیا۔ واپسی میں وہ دوبارہ اسی راستہ سے گزرا تو زیاد نے اس کے غیر فروخت شدہ گھوڑوں سے دوبارہ محصول طلب کیا۔ تاجر کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس نے اپنے غیر فروخت شدہ گھوڑے اپنے غلاموں کی نگرانی میں وہیں چھوڑ دیئے اور خود چل کر مدینہ پہونچا تاکہ خلیفہ سے شکایت کرے۔ اس نے مدینہ پہونچ کر حضرت عمر فاروقؓ سے اپنا قصہ بیان کیا۔ اور کہا کہ مجھ سے میرے گھوڑوں پر دوبارہ محصول طلب کیا جا رہا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی بات سن کر مختصر طور پر صرف اتنا کہا کہ کفیت (اس کا انتظام کر دیا گیا ہے)

تاجر نے سمجھا کہ خلیفہ نے اس کی شکایت کو کچھ اہمیت نہ دی۔ وہ مایوسی کی حالت میں دریائے فرات کی چوکی پر واپس آیا اور زیاد کے مطالبہ کے مطابق محصول کی رقم ادا کرنے لگا۔ مگر زیاد نے اس سے دوبارہ رقم نہ لی اور کہا کہ خلیفہ کی طرف سے یہ حکم آگیا ہے کہ تم سے دوبارہ محصول نہ لیا جائے۔

عیسائی تاجر اس بات سے بے حد متاثر ہوا کہ خلیفہ نے اتنی تیز کارروائی کی کہ میرا انصاف مجھ سے پہلے یہاں پہونچ گیا۔ اس نے کہا کہ اے زیاد، میں مسیحیت کو چھوڑتا ہوں، اور میں اس آدمی کے دین کو اختیار کرتا ہوں جس نے تمہارے پاس یہ فرمان بھیجا ہے (یا زیاد انی بریٔ من النصرانیۃ وانی علی دین الرجل الذی کتب الیک ھذا الکتاب، کتاب الخراج)

۲۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ ایک بار ان کی زرہ چوری ہوگئی۔ حضرت علی کو معلوم ہوا کہ وہ فلاں یہودی کے پاس ہے۔ انھوں نے کوفہ کے قاضی شُریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ حضرت علیؓ نے اپنے دعویٰ کے حق میں دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے غلام قنبر کو، اور دوسرے اپنے لڑکے حسن کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں مقبول نہیں ہے اور صرف ایک گواہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ قاضی شریح نے مقدمہ خارج کر دیا۔ زرہ بدستور یہودی کے پاس باقی رہی۔

یہودی اس فیصلہ کو سُن کر بے حد متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ تو نبیوں جیسا معاملہ ہے کہ ایک قاضی وقت کے حاکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے (ھذہ احکام الانبیاء قاضیہ یقضی علیہ) اس کے بعد یہودی نے اسلام قبول کر لیا اور زرہ یہ کہہ کر حضرت علیؓ کو دے دی کہ یہ آپ ہی کی ہے، آپ کا دعویٰ بالکل درست تھا (کنز العمال)

۳۔ بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق کی جامع مسجد بنائی گئی۔ مسجد کے ایک طرف ایک قدیم گرجا تھا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ گرجا کا ایک حصہ مسجد میں شامل کر لیا جائے۔ مگر عیسائی اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ خلیفہ عبدالملک نے اس کے لیے عیسائیوں کو ایک معقول رقم کی پیش کش کی پھر بھی وہ راضی نہ ہوئے چنانچہ ابتدائی تعمیر میں مسجد کا ایک گوشہ ناقص رہا۔

اس کے بعد ولید بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو اس نے بھی مسجد کی تکمیل کے لیے عیسائیوں کو راضی کرنا چاہا مگر عیسائی دوبارہ راضی نہیں ہوئے۔ ولید بن عبدالملک نے اس زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اس کو مسجد میں شامل کر کے اس کی تعمیر مکمل کر دی۔ اس کے کئی سال بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ ان کے عدل و انصاف کی شہرت پھیلی تو عیسائیوں نے دوبارہ ان سے مل کر اپنی سابقہ شکایت کو پیش کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو سن کر حکم دے دیا کہ گرجا کی زمین کا جو حصہ مسجد میں شامل کیا گیا ہے اس کو توڑ کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

مسلمانوں کو یہ بات بے حد شاق گزری۔ انھوں نے کہا کیا ہم اپنی مسجد کو گرا دیں، حالاں کہ ہم نے اس میں اذانیں دی ہیں اور نمازیں ادا کی ہیں (نھدم مسجدنا اذنّا فیہ وصلّینا) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ خواہ کچھ ہو، یہ زمین اگر مسیحی عبادت خانہ کی تھی تو وہ مسیحیوں کو واپس کی جائے گی۔

مسیحیوں نے جب خلیفہ کے اس فیصلہ کو سنا تو وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اب ان کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا دعویٰ ثابت ہو گیا، ہم کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اب ہم اس زمین کو اپنی طرف سے بطور ہدیہ مسجد کو دیتے ہیں (تاریخ بلاذری)

اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ اور جو شخص صرف پانا چاہے، وہ کھوتا ہے۔ یہ اس دنیا کا اٹل قانون ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

ایک واقعہ

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ایک واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آیا ہے۔ ابوسعید خدری رض کہتے ہیں کہ مدینہ میں ابوموسیٰ اشعری رض ایک بار عمر فاروق رض سے ملنے کے لیے ان کے گھر آئے۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر انھوں نے کہا کہ آپ پر سلامتی ہو، یہ ابوموسیٰ الاشعری ہے (السلام علیکم ھذا ابوموسی الاشعری) اس طرح انھوں نے تین بار کہا۔ مگر انھیں اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

حضرت عمر غالباً کسی کام میں مشغول تھے۔ فوری طور پر جواب نہ دے سکے۔ بعد کو جب انھیں معلوم ہوا کہ ابوموسیٰ الاشعری رض واپس چلے گئے تو اگلے دن حضرت عمر نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تم واپس کیوں چلے گئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تین بار اجازت مانگے، اور پھر بھی اس کو صاحب مکان کی طرف سے اجازت نہ ملے تو اس کے بعد وہ واپس چلا جائے۔

حضرت عمر رض نے ابوموسیٰ الاشعری رض سے کہا کہ اس قولِ رسول پر تم گواہ پیش کرو، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا (والا اوجعنّك) راوی کہتے ہیں کہ میں انصار کی مجلسوں میں سے ایک مجلس میں تھا کہ وہاں ابوموسیٰ الاشعری رض آئے۔ وہ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں عمر رض کے یہاں گیا اور تین بار سلام کیا۔ مگر اجازت نہ ملی، اس لیے واپس ہو گیا۔ اس کے بعد عمر نے مجھ سے واپسی کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی کے یہاں ملنے کے لیے جاؤ تو تین مرتبہ سلام کرو۔ اگر تین بار کے بعد اجازت نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔

عمر رض نے کہا ہے کہ تم اس حدیثِ رسول پر گواہ لے آؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہتے ہوئے سنا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو ایک معلوم بات ہے، اور اس کو بہت سے لوگوں نے سنا ہے۔ پھر ابوسعید الخدری رض

اٹھ کر ان کے ساتھ روانہ ہوئے اور حضرت عمر کے پاس پہنچ کر اس قولِ رسول کی تصدیق کی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا کہ بازار کی مشغولیت نے مجھے اس مسئلہ سے غافل رکھا (شغلني الصفق بالاسواق) فتح الباری ۱۱/۳۲

حضرت ابی بن کعب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت عمر سے کہا کہ اے عمر، تم رسول اللہ ؐ کے اصحاب پر عذاب نہ بنو۔ انھوں نے جواب دیا کہ سبحان اللہ، میں نے تو ایک بات سنی۔ پھر میں نے چاہا کہ اس کی حقیقت معلوم کروں (لا تكن عذاباً على اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم - فقال عمر، سبحان الله، إنما سمعتُ شيئاً فأحببتُ أن أتثبت) فتح الباری ۱۱/۳۲

اس روایت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص کسی سے ملنے کے لیے جائے اور صاحب مکان اس وقت اس کو ملاقات کا وقت نہ دے تو اس پر جانے والے کے دل میں ملال نہیں آنا چاہیے۔ اسلامی مزاج کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کو کسی معقول عذر پر محمول کرے اور بخوشی وہاں سے واپس چلا جائے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی اگر غلط فہمی کی بنا پر کسی کے بارہ میں ایک غیر واقعی رائے قائم کرلے تو اس پر لازم ہے کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ معاملہ کی وضاحت کے بعد اپنی سابقہ رائے پر قائم رہنا مومن کا طریقہ نہیں۔

تیسری بات جو اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے شخص کے اوپر تنقید کرے، تو خواہ یہ تنقید کتنے ہی سخت الفاظ میں ہو، زیر تنقید شخص کو اسے برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ تنقید کو ٹھنڈے دل سے سنے اور کسی اشتعال کے بغیر اصل بات کا جواب دے کر ناقد کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

اعتراف

حضرت عمر فاروق ۱۳ھ سے ۲۳ھ تک خلیفہ رہے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک اعرابی مدینہ آیا۔ اس نے کہا کہ کون ہے جو مجھ کو وہ کلام پڑھائے جو محمدؐ پر اترا ہے۔ ایک شخص نے اعرابی کو سورہ التوبہ پڑھائی۔

یہ شخص عالم نہ تھا۔ اور اس وقت قرآن میں اعراب بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک آیت کو پڑھانے میں غلطی کر دی۔ اس نے ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولہ (لام کو زیر کے ساتھ) پڑھایا۔ اس طرح پڑھنے سے آیت کا مطلب یہ ہوگیا کہ اللہ مشرکین سے اور اپنے رسول سے بری ہے۔ اعرابی نے یہ سن کر کہا: کیا اللہ اپنے رسول سے بیزار ہوگیا۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے تو میں بھی اس سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کو اعرابی کے اس قول کی خبر ملی تو انھوں نے اعرابی کو بلایا۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے کہ میں خدا کے رسول سے بیزار ہوں۔ اعرابی نے جواب دیا کہ اے امیرالمومنین، میں مدینہ آیا۔ مجھ کو قرآن کا علم نہ تھا۔ میں نے کہا کہ کون ہے جو مجھ کو قرآن پڑھا دے۔ فلاں شخص نے مجھ کو سورہ التوبہ پڑھائی۔ اس کی ایک آیت اس نے مجھ کو اس طرح پڑھائی: ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولہ (لام کے زیر کے ساتھ) جب اس نے اس طرح پڑھایا تو میں نے کہا کہ کیا اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے تو میں بھی اس سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ معاملہ کو سمجھ گیے۔ انھوں نے کہا کہ اے اعرابی، یہ اس طرح نہیں ہے جس طرح فلاں آدمی نے تم کو پڑھایا۔ اعرابی نے پوچھا کہ اے امیرالمومنین، پھر وہ کس طرح ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس طرح ہے: ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولُہ (لام کے پیش کے ساتھ) اعرابی نے اس کو سنا تو فوراً کہا: اللہ مشرکین سے بیزار ہے تو میں بھی خدا کی قسم، مشرکین سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

غلطی کرنا برا نہیں — بلکہ غلطی پر قائم رہنا برا ہے۔ زندہ انسان وہ ہے جس کو اس کی غلطی بتائی جائے تو فوراً وہ رجوع کرلے، اور مردہ انسان وہ ہے جو غلطی بتانے کے بعد بھی رجوع کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنالے (البقرہ ۲۰۶)

غلطی کی اِصلاح

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ابتدائی مقابلہ میں ایرانی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں ایرانی گھبرا اٹھے۔

اس وقت رستم ایران کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ عربوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے کس ایرانی بہادر کو مقرر کیا جائے۔ سب نے بہمن جادویہ کا نام لیا۔ چنانچہ رستم نے بہمن جادویہ کو ۱۲ ہزار فوج ..۳ جنگی ہاتھی اور دوسرے ضروری سامان دے کر عربوں کی طرف روانہ کیا۔ بہمن جادویہ کو جو سامان دیئے گیے ان میں درفش کادیانی بھی تھا۔ جس کی نسبت ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ جس فوج کے ساتھ یہ جھنڈا ہو اس کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ یہ واقعہ ۱۳ھ (۶۳۵ء) کا ہے۔

بہمن جادویہ چلتا ہوا دریائے فرات کے کنارے مقام ناطف میں آکر مقیم ہوا۔ دوسری طرف ابو عبید بن مسعود ثقفی اسلامی لشکر کے ساتھ فرات کے دوسرے کنارے مقام مروحہ میں مقیم تھے۔ بہمن جادویہ نے ابوعبیدہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم دریا پار کر کے اِدھر آتے ہو یا ہم دریا پار کر کے تمہاری طرف آئیں۔ ابو عبید ثقفی نے جوشِ شجاعت میں یہ کہلا دیا کہ ہم دریا پار کر کے آتے ہیں۔

اسلامی لشکر نے ایک چھوٹے پل کے ذریعہ فرات کو پار کیا۔ جب وہ دوسری طرف پہونچے تو صورت حال یہ تھی کہ پیچھے کی طرف فرات کا چوڑا دریا تھا جو وسیع جنگی نقل و حرکت میں مانع تھا۔ دوسری طرف سامنے بہمن جادویہ کا مسلح لشکر تھا جس کے آگے جنگی ہاتھی صف باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان ہاتھیوں پر تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ لشکر اسلام پر بھرپور تیروں کی بارش کر سکیں۔

مسلمان اس وقت گھوڑوں پر تھے۔ ان کے گھوڑوں نے اس سے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکنے لگے۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے گھوڑے ان کے قابو سے باہر ہو رہے ہیں تو وہ گھوڑوں سے کود کر زمین پر آگیے اور پیادہ پا لڑنے لگے۔ مگر یہ طریقہ مزید خطرناک ثابت ہوا۔ ہاتھیوں نے جب آگے بڑھ کر مسلمانوں کی صفوں پر حملہ کیا اور انھیں کچلنا شروع کیا تو مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔

اس خونی معرکہ کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے کئی سردار اور خود ابوعبید

مسعود ثقفی کو ہاتھیوں نے اپنے پیروں کے نیچے کچل دیا۔ مسلمانوں نے پیچھے ہٹنا چاہا تو وہاں دریا ان کی راہ میں حائل تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ دریا میں غرق ہوگیے۔ مسلم فوجیوں کی تعداد اس وقت ۹ ہزار تھی۔ اس میں سے تقریباً ۶ ہزار افراد جنگ میں کام آگیے۔

مسلمانوں کی بچی کھچی فوج دریائے فرات کے دوسری طرف جمع ہوئی۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ ان کے شاعر اور خطیب اٹھتے اور اپنی شکست کو شہادت قرار دے کر اس کو گلوریفائی کرتے۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے پورے معاملہ پر نظر ثانی کی اور اس کا اعتراف کیا کہ دریا کے اُس پار میدانِ جنگ بناکر انھوں نے غلطی کی تھی۔

اب ایک طرف مسلمان مزید فوج جمع کرکے تیاری کرنے لگے، اور دوسری طرف ایرانیوں نے اپنے سردار مہران ہمدانی کو سالارِ جنگ بناکر بہت بڑی فوج کے ساتھ دوبارہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ مہران ہمدانی جب فرات کے کنارے پہونچا تو اس نے مسلم فوج کے سردار مثنیٰ کو دوبارہ یہ پیغام بھیجا کہ تم دریائے فرات کو پار کرکے ہماری طرف آتے ہو یا ہم دریائے فرات کو پار کرکے تمہاری طرف آئیں۔ مسلم سردار نے دوبارہ وہ غلطی نہیں کی جو پہلی بار ان سے ہوگئی تھی۔ انھوں نے کہلا دیا کہ تم ہی فرات کو عبور کرکے ہماری طرف آؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب دونوں فوجوں میں جب لڑائی ہوئی تو معاملہ برعکس تھا۔ ایرانی فوج کے پیچھے دریا تھا اور سامنے اسلامی لشکر۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے آگے ایرانی فوج تھی اور پیچھے کھلی ہوئی زمین۔ اس طرح میدانِ مقابلہ ایرانیوں کے خلاف اور مسلمانوں کے موافق ہوگیا۔ ایرانی فوج نے حسب سابق زبردست حملے کیے۔ انھوں نے اپنے ہاتھیوں کو بھی استعمال کیا مگر آخر کار انھیں شکست ہوئی۔ اسلام کے سپہ سالار مثنیٰ ابن حارثہ نے دریا کے اوپر لکڑی کے پل کو توڑ دیا تھا۔ چنانچہ ایرانی فوج جب پیچھے کی طرف بھاگی تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی تلوار سے بچنے کی کوشش میں دریا کی موجوں میں غرق ہو جائے۔ ابن خلدون کی روایت کے مطابق ایرانی لشکر کے تقریباً ایک لاکھ آدمی مقتول ہوئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں جو لوگ اس جنگ میں کام آئے ان کی تعداد صرف ایک سو تھی۔ یہ واقعہ رمضان ۱۳ھ میں پیش آیا۔

شکست کے بعد فتح کا یہ عظیم واقعہ اپنی غلطی کی اصلاح کا کرشمہ تھا۔

وہ بادشاہ ہو کر بھی اعتراف کرنا جانتے تھے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۸۰-۶۰۴ء) نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جمعہ کا خطبہ دیا اور کہا: **ایھا الناس ان المال مالنا والفی فیئنا . من شئنا اعطینا ومن شئنا منعنا** اے لوگو، ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مال غنیمت ہمارا مال ہے۔ ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔

کسی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوسرا جمعہ آیا تو انھوں نے پھر یہی بات دہرائی۔ مگر کوئی نہ بولا۔ پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو معاویہ نے پھر یہی بات کہی۔ اب ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا:

کلا ، انما المال مالنا والفی فیئنا ، من حال بیننا و بینه حکمناه الی الله باسیافنا . ہرگز نہیں۔ مال ہمارا ہے۔ مال غنیمت بھی ہمارا ہے۔ جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا، ہم اپنی تلوار کے ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔

یہ سن کر معاویہ منبر سے اتر آئے۔ اس شخص کو بلوایا۔ جب اسے معاویہ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا۔ لیکن معاویہ نے دروازے کھول دیئے۔ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص معاویہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ معاویہ نے کہا: اللہ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا (**ان هذا احیانی احیاه الله**) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میرے بعد کچھ امرا ایسے آئیں گے جو باتیں کہیں گے مگر ان کا جواب انہیں دیا جائے گا۔ ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔ میں نے ایک بات کہی تھی، کسی نے اس کی تردید نہ کی تو مجھے ڈر ہوا کہ میں ان امرائیں داخل

نہ ہو جاؤں۔ میں نے دوبارہ وہی بات کہی۔ پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انھیں لوگوں میں سے ہوں۔ پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے میری تردید کی۔ اللہ اسے زندہ رکھے۔ اس نے مجھے زندہ کر دیا۔ اب مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے ایسے امرا کے زمرہ سے نکال دے گا۔ پھر معاویہ نے اس شخص کو انعام دیا۔ (الذہبی: تاریخ الاسلام، جلد ۲، صفحہ ۳۲۱)

ایک اور واقعہ

ابن عبد البر نے استیعاب میں قتادہ کی روایت نقل کی ہے۔ عمر فاروقؓ کہیں جارہے تھے۔ راستہ میں ان کو ایک بوڑھی خاتون ملیں۔ آپ نے ان کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد وہ بولیں: "اے عمرؓ، ایک وقت تھا جب میں نے تم کو بازار عکاظ میں دیکھا تھا۔ اس وقت تم عمیر کہے جاتے تھے۔ لاٹھی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتے تھے۔ پھر زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ تم عمرؓ کہے جانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تم امیر المومنین کہے جاتے ہو۔ دیکھو رعیت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے، اس کے لئے دور کا آدمی بھی قریبی رشتہ داروں کی طرح ہوتا ہے اور جو موت سے ڈرتا ہے، اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دے گا جسے وہ بچانا چاہتا ہے"

جارود عبدی، جو اس وقت عمر فاروقؓ کے ساتھ تھے، یہ سن کر بولے: "اے عورت تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی، عمر فاروقؓ نے فرمایا: انھیں کہنے دو، جانتے ہو یہ کون ہیں۔ ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی۔ عمر کو تو بدرجہ اولیٰ سننا چاہئے۔ یہ خاتون قبیلۂ خزرج کی خولہ بنت ثعلبہ تھیں جن کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر ۵۸ کے شروع میں آیا ہے:

بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں۔۔۔۔"

گروہی عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے

بنو مضر اور بنو ربیعہ عرب کے دو حریف قبیلے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نسلاً قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ مسیلمہ، جس نے آپ کے مقابلہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو قبیلہ ربیعہ کا سردار طلحہ النمری مسیلمہ کے پاس آیا۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے مسیلمہ سے کہا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں۔ مگر ربیعہ کا کذاب مضر کے صادق سے مجھ کو زیادہ محبوب ہے" یہ کہہ کر مسیلمہ کے ساتھیوں میں شریک ہو گیا۔ (طبری، جلد ۳، صفحہ ۲۴۶)

مسیلمہ نے قرآن کے جواب میں جو کلام بنایا تھا، اس کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی عظمت کو خوب جانتا تھا۔ تاہم گروہی عصبیت کی بنا پر کچھ مسخرہ پن کے جملے وضع کر کے لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ مثلاً اس کا ایک کلام یہ تھا:

یا ضفدع نقی ، لاالشارب تمنعین ولا الماء تکدرین ، لنا نصف الارض ولقرلش نصف الارض ، ولکن قریشا قوم یعتدون (طبری ۳/۱۵۳)

اے مینڈک ٹرٹر کر لے، تو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے۔ زمین عرب آدھی ہم ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی۔ مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔

انسانوں کی ایک قسم یہ بھی ہے

عمر بن ربیعہ (۹۳۔ ۳۲ھ) ایک شاعر تھا جو زیادہ تر عشقیہ مضامین نظم کرتا تھا۔

حتیٰ کہ شریف خاندان کی عورتوں کا نام لے کر ان کے بارے میں عریاں اشعار کہنے لگا۔ اس کے خلاف شکایات حکومت تک پہنچیں۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کو دھلک میں جلاوطن کر دیا جو یمن اور حبشہ کے درمیان بحر احمر کا ایک جزیرہ تھا۔ وہ عین اس رات کو پیدا ہوا جس رات کو حضرت عمر فاروق نے انتقال فرمایا۔ لوگ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے: کتنا بڑا حق اٹھ گیا اور کیسا باطل اس کی جگہ آگیا۔ عمر بن ربیعہ کا ایک شعر یہ ہے:

الا لیت ام الفضل کانت قرینتی　　هنا او هنا فی جنة او جهنم

انسانی اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں

ام عبد اللہ بنت ابی خثمہ بیان کرتی ہیں کہ ہجرت حبشہ کے وقت وہ سفر کی تیاری کر رہی تھیں۔ عمر بن خطاب (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ادھر سے گزرے۔ اس وقت تک وہ مسلمانوں کے اوپر ظلم کرنے میں انتہائی سخت تھے۔ عمر نے کہا: انه للا نطلاق یاام عبدالله (اے ام عبد اللہ کیا روانگی ہو رہی ہے) ام عبد اللہ نے کہا: خدا کی قسم، ہاں، تم لوگ ہمارے اوپر مصیبت ڈال رہے ہو۔ ہم خدا کی زمین میں نکل جائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لئے کوئی گنجائش پیدا کر دے۔ عمر نے یہ سن کر کہا: خدا تمہارا ساتھ دے (صحبکم الله) یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت طاری ہو گئی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد ام عبد اللہ کے شوہر آئے جو کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ ام عبد اللہ نے ان سے عمر کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ ان کے شوہر نے کہا:

لایسلم هذا حتی یسلم حمار الخطاب　　یہ شخص اسلام قبول کرنے والا نہیں، یہاں تک کہ خطاب کا گدھا بھی مسلمان ہو جائے۔

مگر یہی عمر بن الخطاب اس کے تھوڑے دنوں بعد مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی نئی تاریخ بنائی۔۔۔انسان اکثر اندازہ کرنے میں غلطی کرتا ہے۔اگرچہ ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست ہے۔

سیاست کے لئے جوش و خروش
دعوت کے لئے سرد مہری

ضیاء الدین احمد برنی، مولانا محمد علی جوہر کے رفیق خاص تھے۔وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مولانا محمد علی جوہر کو بہت پریشان رکھا۔ وہ ترکوں کی پے درپے ہزیموں سے بے حد مغموم تھے۔ انھوں نے ان کے مصائب کو ہلکا کرنے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبّی مشن روانہ کیا۔ پہلی جنگ بلقان (۱۹۱۸) کے بعد جب فاتحین میں تقسیم غنیمت پر جھگڑا ہوا،اور دوسری جنگ بلقان برپا ہوئی تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خبر جب رائٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی تو اس وقت رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر مولانا کی ترک دوستی کا اندازہ کیجئے کہ انھوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ یہ خبر دوسری صبح کو اخبارات کے ذریعہ لوگوں تک پہنچے۔ چند رفقا کار کو لے کر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور راستے بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ روح افزا خبر پہنچاتے رہے۔ ناوقت ہونے کے باوجود جامع مسجد میں ہزارہا آدمیوں کا اجتماع ہو گیا۔ مولانا نے وہاں درد انگیز تقریر کر کے اس خبر کی اہمیت کو واضح کیا۔وہ رات بھی کیسی ہیجان انگیز تھی۔

"مولانا محمد علی (۱۹۷۶) مرتبہ سید نظر ترنی، صفحہ ۸۹"

ہماری جدید تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو بتاتے ہیں کہ سیاسی اور جذباتی امور کے لئے مسلمانوں میں کس قدر جوش وخروش پیدا ہو گیا تھا۔ مگر خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کے لئے ان میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوئی "رائٹر" کی سیاسی خبریں انھیں بے چین کر دیتی تھیں۔ مگر قرآن کی اخروی خبروں نے انھیں بے قرار نہیں کیا کہ اس کے لئے وہ اپنے گھروں سے نکل پڑتے اور ساری قوموں کو بتاتے کہ اے لوگو، تم مرنے والے ہو اور مرنے کے بعد تم کو خدا کے یہاں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

موجودہ زمانے میں بے شمار قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کی بربادی کی واحد وجہ یہی ہے کہ انہوں نے پیغام بری کا وہ کام نہ کیا جو خدا نے ان کے اوپر فرض کیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو خادم اپنی اصل ڈیوٹی سے ہٹ جائے وہ خواہ کسی اور کام میں کتنی ہی جانفشانی دکھائے، بہر حال وہ سزا کا مستحق ہو گا نہ کہ انعام کا۔

یہ تھا مشرکین عرب کا کردار

ا۔ نبی ﷺ کی بعثت (۶۱۰) ہوئی تو ایران کی ساسانی سلطنت اور روم کی بازنطینی سلطنت کے درمیان تصادم جاری تھا۔ اس دو طرفہ جنگ میں تقریباً بیس سال گزر گئے۔ ابتداءً ایرانیوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ ۶۱۵ تک رومی سلطنت کے تقریباً تمام شمالی مقبوضات اردن، شام فلسطین، عرق، مصر، سب ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔

یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب کہ مکہ میں اسلام اور غیر اسلام کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ یہ کشمکش اتنی شدید ہو چکی تھی کہ ۶۱۵ میں مکہ کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو اپنا وطن چھوڑ کر پڑوسی ملک حبش چلا جانا پڑا۔ ایسے حالات میں اہل کتاب رومیوں کے مقابلہ میں بت پرست ایرانیوں کی فتح۔ مکہ والوں کے لئے گفتگو کا خصوصی موضوع بن گئی۔

مشرکین نے مسلمانوں سے کہا کہ جس طرح پڑوس کے ملکوں میں بت پرست لوگ آسمانی کتاب کے حاملین پر غالب آئے ہیں، اسی طرح ہم بھی تمہارے اوپر غالب آجائیں گے۔ عین اس وقت قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ اتری اور اعلان کیا گیا کہ چند سالوں کے بعد دوبارہ انقلاب آئے گا اور رومی سلطنت ایرانیوں کے اوپر غالب آجائے گی۔

سورہ روم کی یہ آیتیں مکہ والوں کے لئے مذاق کا نیا موضوع بن گئیں۔ ابی بن خلف نے حضرت ابو بکر صدیق سے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا تو آؤ مجھ سے شرط کر لو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ شرط رکھی کہ رومی اگر تین سال کے اندر غالب آگئے تو میں دس اونٹ تمھیں دوں گا۔ اور اگر اس کے خلاف ہوا تو تم دس اونٹ مجھے دینا۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں بضع سنین کا لفظ ہے اور عربی میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے۔ اس لئے دس کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر ایک سو کر دو۔ حضرت ابو بکر نے دوبارہ آکر ابی بن خلف سے یہ بات کہی۔ وہ راضی ہو گیا۔ کہ دس سال کے اندر دونوں میں سے جس کی بات غلط ثابت ہو گی وہ دوسرے فریق کو سو اونٹ دے گا۔

قرآن کی پیشین گوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ نو سال بعد قیصر روم نے ۶۲۴ میں ایرانیوں کو نینوئی (عراق کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی اور اپنے تمام چھینے ہوئے علاقے ایرانیوں سے واپس لے لئے۔

اس مدت میں مکہ کی کش مکش اس نوبت کو پہنچ چکی تھی کہ نبی ﷺ اور آپ کے تمام ساتھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان کشمکش اس شدید نوبت کو پہنچی کہ ۶۲۴ میں جنگ بدر واقع ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور مشرکین مکہ

کے اکثر بڑے بڑے سر دار مارے گئے۔

اس سخت ترین ہیجانی فضا میں رومیوں کے غلبہ کی خبر آتی ہے۔ بدر کی شکست نے مکہ والوں کی دشمنی کو جنون کی حد تک پہنچادیا تھا۔ مگر حضرت ابو بکر نے جب ابی بن خلف کے پاس پیغام بھیجا کہ ہماری بات پوری ہو گئی، اس لئے شرط کے مطابق مجھے ایک سو اونٹ ادا کر دو، تو مکہ میں کسی نے مخالفت نہ کی، اور ابی بن خلف نے کسی قسم کی تکرار کے بغیر پورے ایک سو اونٹ ابو بکر صدیق کے پاس بھیج دیئے۔ جب یہ اونٹ مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ نے حضرت ابو بکر کو حکم دیا کہ ان کو صدقہ کر دو۔

سخت ترین دشمنی کے باوجود مشرکین عرب اس بات سے ناواقف تھے کہ شرط کے مطابق اپنے حریف کو ایک سو اونٹ نہ دینے کے فرضی بہانے تلاش کریں۔ یا ان کی تعداد میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔ وہ ایک ہی بات جانتے تھے: جو بات طے ہو گئی ہے اس کو پورا کرنا ہے۔ خواہ وہ اپنے دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ۔

۲۔ صلح حدیبیہ کے بعد ذی الحجہ ۶ ھ میں آپ نے ارادہ فرمایا کہ امرا اور سلاطین کے نام دعوتی خطوط بھیجے جائیں۔ اس سلسلے میں تقریباً ایک ماہ ضروری تیاری میں صرف ہوا۔ اور محرم ۷ ھ میں آپ نے ۸ بادشاہوں کے نام اپنے سفیروں کے ذریعہ خطوط روانہ کئے۔ انھیں میں سے ایک خط ہرقل قیصر روم کے نام تھا جس کی سلطنت اس وقت شام سے لے کر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پاس دحیہ کلبی خط لے کر گئے۔ ہرقل کو اس زمانہ میں ایران کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی اور اپنی نذر کے مطابق پیدل چل کر فلسطین آیا ہوا تھا۔ ہرقل کی خدمت میں آپ کا خط پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس علاقہ میں عرب کا کوئی شخص آیا ہو تو اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ اتفاق سے ابو سفیان (جو اس وقت

تک ایمان نہیں لائے تھے اور ابو جہل کے بعد مشرکین مکہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے) اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ بغرض تجارت شام آئے ہوئے تھے۔ ان کو ڈھونڈ کر لایا گیا۔ قیصر نے کہا، تمہارے یہاں جس آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، میں اس کی بات تم سے سوال کروں گا۔ تم اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دو۔

اس موقع پر ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس وقت محمد ﷺ ابوسفیان کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ وہ آپ کو مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ مگر ساری گفتگو میں ابوسفیان نے ایک بھی غلط بات نہیں کی: چند سوال و جواب یہ تھے:

ہرقل: محمد کا نسب کیسا ہے

ابوسفیان: شریف و عظیم

ہرقل: کیا اس شخص پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: ان کے ماننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

ہرقل: وہ کس بات کی تعلیم دیتے ہیں۔

ابوسفیان: وہ توحید اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں

ابوسفیان: نہیں۔

ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کسی سوال کے جواب میں غلط بیانی نہیں کی اور نہ

طعن کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے ساتھی مجھے جھوٹا کہیں گے۔ صرف آخری سوال کے جواب میں وہ اتنا اضافہ کرسکے "امسال ہمارے اور ان کے درمیان ایک معاہدہ (حدیبیہ) ہوا ہے، دیکھئے اس میں وہ کیا کرتے ہیں"

اس سوال وجواب کے وقت ابو سفیان اور ان کے ساتھی مشرک تھے اور سب کو نبی ﷺ کے ساتھ سخت ترین دشمنی تھی۔ مگر ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کے بارہ میں کوئی غلط بیان دیں یا آپ کو مطعون کرنے کی کوشش کریں۔

۳۔ نبوت کے دسویں سال آپ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ اب خاندانی رسم کے مطابق عبدالعزیٰ (ابولہب) بنی ہاشم کا سردار منتخب ہوا جو اس وقت خاندان کا سب سے بزرگ آدمی تھا۔ ابولہب آپ کے خاندان میں آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ شعب ابی طالب کے مقاطعہ کے زمانہ میں سارے خاندان بنی ہاشم نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ صرف ایک ابولہب تھا جو آپ سے الگ رہا۔ اب جب کہ ابولہب کو خاندان کے سردار کا مقام بھی مل گیا، اس نے آپ کو خاندان سے خارج کر دیا۔

خاندان سے خارج کیا جانا قدیم عرب میں بدترین سزا تھی۔ اس کے بعد آدمی بالکل تنہا ہو جاتا تھا۔ جب کہ قبائلی نظام میں خاندانی پناہ کے سوا کوئی پناہ نہ تھی جس کے تحت آدمی محفوظ طور پر اپنی زندگی گزار سکے۔ چنانچہ اس کے بعد مکہ میں لوگوں کی مخالفتیں بہت بڑھ گئیں۔ اس سے پہلے زیادہ تر زبانی طنز و تشنیع کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اب جارحانہ قسم کی سختیاں شروع ہو گئیں یہ حالات دیکھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ عرب کے دوسرے بڑے شہر طائف جائیں اور وہاں کے لوگوں سے پناہ کی درخواست کریں

آپ مکہ سے پیدل چل کر طائف پہنچے جو مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل پر

واقع تھا۔ امید کے خلاف وہاں کے لوگوں نے بہت برا برتاؤ کیا۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو پناہ دینے پر تیار نہ ہوئے بلکہ آپ کو پتھر مار مار کر بستی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کو وہاں کے لوگوں سے کہنا پڑا کہ دیکھو یہ خبریں مکہ نہ پہنچنے پائیں۔ ایک طرف اپنے وطن مکہ میں زمین کا تنگ ہو جانا، دوسرے طائف والوں کا وحشیانہ سلوک، ان واقعات نے آپ پر شدت سے اثر کیا۔ طائف سے واپسی پر آپ نے اپنے رب سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

اللھم الیك اشکو ضعف قوتی وقلة حیلتی و ھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین
خدایا میں تجھی سے اپنی قوت کی کمی اور اپنی بے سر و سامانی اور لوگوں کی نظر میں حقیر ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔

طائف سے واپسی کے بعد کوئی دوسری جگہ نہ تھی جہاں آپ جائیں۔ چونکہ مکہ سے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینے کا کام طائف جیسے بڑے شہر کا کوئی سردار ہی کر سکتا تھا۔ مجبوراً آپ نے دوبارہ مکہ کا رخ کیا اور شہر کے باہر غار حرا میں اپنے خادم زید بن حارثہ کے ساتھ مقیم ہوئے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کریں۔ چند روز کے غور و فکر کے بعد آپ نے مکہ کے ایک سردار مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ میں غار حرا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم مجھ کو اپنی پناہ میں لے لو۔ تاکہ مکہ میں آ کر رہ سکوں مطعم ایک کافر تھا اور بدر سے پہلے کفر ہی کی حالت میں انتقال ہوا۔ نبی ﷺ اس وقت اس کے قومی دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر جب آپ نے اس سے حفاظت طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لینے سے انکار کر دے۔ اس کے چھ جوان لڑکے تھے۔ اس نے تمام لڑکوں کو حکم دیا کہ تم تلوار لے کر جاؤ اور محمد کو اپنی حفاظت میں مکہ لے آؤ۔ چنانچہ اس کے یہ لڑکے

غار حرا پہنچے اوران کی تلواروں کے سایہ میں آپ دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔ مکہ میں آکر آپ نے سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا، جب آپ طواف میں مشغول تھے تو مطعم بن عدی نے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"میں نے محمد کو پناہ دی ہے، خبردار کوئی انھیں تکلیف نہ پہنچائے"

مطعم بن عدی ایک کافر و مشرک تھا۔ نیز آپ کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا مگر جب آپ نے اس سے پناہ طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہو گیا کہ آپ کو پناہ دینے سے انکار کردے۔ یہ تھا کردار ان لوگوں کا جو مشرک و کافر کہے جاتے ہیں۔

عرب کے مشرکین نے پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن کی شدید مخالفت کی لڑائیاں لڑیں۔ آپ کو اپنے وطن سے نکالا۔ مگر انھوں نے کبھی آپ کے خلاف کوئی ذلیل حرکت نہیں کی۔ آپ کو اپنے مخالفین کی طرف سے ذلیل اور رکیک حرکتوں کا تجربہ صرف ہجرت کے بعد ہوا جب کہ آپ کا سابقہ یہود کے ساتھ پیش آیا جو کتاب الٰہی کے حامل تھے، جو اپنے کو نبیوں کا وارث کہتے تھے، جو گویا اس وقت کے "مسلمان" تھے۔

ایک واقعہ

طبقات ابن سعد (جلد ۱، صفحہ ۱۴۳) میں زہری سے منقول ہے کہ ایک یہودی نے کہا کہ تورات میں پیغمبر آخر الزماں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ سب میں نے آپ کے اندر دیکھ لئے تھے۔ صرف ایک وصف باقی تھا۔ اور وہ تھا حلم و بردباری۔ چنانچہ اس کے تجربہ کے لئے میں نے آپ کو ۳۰ دینار قرض دیئے۔ اس کے بعد میں خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب مدت پوری ہونے میں صرف ایک دن باقی تھا، میں آپ کے یہاں پہنچا اور سختی سے تقاضا کیا۔ میں نے کہا میرا حق ادا کیجئے، اور میں جانتا ہوں کہ عبد المطلب کا خاندان تو

ہمیشہ کا ٹال مٹول کرنے والا ہے۔

اس وقت عمر فاروق آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی عضب ناک ہو گئے اور کہا اگر رسول اللہ کا خیال نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: **غفر الله لك يا ابا حفص ، نحن كنا الى غير هذا منك احوج تامرني بحسن القضاء وتامره بحسن الطلب**.اے ابو حفص، خدا تمہیں معاف کرے۔ ہم تم سے ایک اور سلوک کے زیادہ محتاج تھے۔ تم مجھ سے بہتر ادائیگی کے لئے کہتے اور اس کو نصیحت کرتے کہ بہتر طریقہ سے طلب کرو۔

حبش کی ہجرت

نبوت کے پانچویں سال مکہ میں مسلمانوں کے حالات بہت سخت ہو گئے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر قریش نے ان کی حوصلہ شکنی کے لئے ایک نئی تحریک شروع کی۔ انھوں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ کوئی شخص مسلمانوں سے کوئی چیز نہ خریدے، نہ ان کے ہاتھ بیچے، نہ ان کی لڑکی سے نکاح کرے، نہ اپنی لڑکی ان کے نکاح میں دے۔

قدیم مکہ میں اس قسم کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ زندگی کو مفلوج کر دینے کے ہم معنی تھا۔ نبی ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ حبش میں ایک انصاف پسند بادشاہ کی حکومت ہے تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ مسلمان چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر حبشہ جانا شروع کر دیئے۔ کیونکہ اجتماعی شکل میں گھر سے نکلنے میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش رکاوٹ ڈالیں گے۔ جدہ کے ساحل سے کرایہ کی کشتیوں میں سوار ہو کر ان لوگوں نے بحر قلزم پار کیا اور حبش میں اتر گئے۔ وہاں تجارت اور مزدوری کر کے گزر اوقات کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ

مجموعی طور پر تقریباً ایک سو آدمی مکہ سے نکل کر حبش گئے تھے۔

قریش کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر حبش چلے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے دو آدمی عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو مقرر کیا کہ وہ حبش جائیں اور بادشاہ کو آمادہ کریں کہ وہ مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دے۔

قریش کا یہ وفد تحفہ تحائف لے کر حبش پہنچا اور شاہ نجاشی کے سامنے اپنی درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تمہارا اس مسئلہ میں کیا جواب ہے۔ جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے بولے۔ "اے بادشاہ مکہ یا عرب کے کسی دوسرے مقام پر ہم نے کوئی چوری نہیں کی ہے، نہ کسی کو قتل کیا ہے اور نہ کوئی دوسرا ظلم کیا ہے" شاہ حبش نے قریش کے وفد سے پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: ان کا کہنا صحیح ہے۔ انھوں نے چوری اور قتل جیسا کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہمارا الزام صرف یہ ہے کہ انھوں نے باپ دادا کے دین کو بدل ڈالا ہے۔

عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں مسلمانوں کے علاوہ کئی یہودی قبیلے آباد تھے۔ آپ نے ان قبیلوں سے معاہدہ کیا۔ ان معاہدوں کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دیں گے۔ مگر انھوں نے اس کی خلاف ورزی کر کے غداری کے جرم کا ارتکاب کیا چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔

غزوہ خندق میں بنو قریظہ نے اسی قسم کی غداری کی۔ قریش کی واپسی کے بعد مسلمانوں نے بنو قریظہ کو گھیر لیا جو اپنے قلعہ نما مکان میں محصور تھے۔ ۲۵ دن تک محاصرہ

جاری رہا۔ اس کے بعد جب بنو قریظہ نے دیکھا کہ ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں رہا ہے تو انھوں نے ثالث مقرر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس وقت قبیلہ اوس ان کا حلیف تھا، انھوں نے خود یہ شرط پیش کی کہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ (جو مسلمان ہو چکے تھے) کو ثالث مقرر کیا جائے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے منظور ہوگا۔ سعد بن معاذ نے تورات کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ بنو قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتیں باندی بنالی جائیں۔

یہودیوں میں ایک شخص زبیر بن باطا قرضی تھا۔ اس نے مدینہ کے ایک مسلمان ثابت بن قیس سے جنگ بعاث کے موقع پر احسان کیا تھا۔ مدینہ کے عربوں اور یہودیوں کی اس جنگ میں ثابت بن قیس گرفتار ہو گئے تھے۔ زبیر بن باطا نے ان کو آزاد کرایا۔ ثابت بن قیس نے چاہا کہ یہودی سردار کے اس قدیم احسان کا بدلہ ادا کریں۔ چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے ان کے کہنے پر زبیر بن باطا کو چھوڑ نے کا حکم دے دیا۔ ثابت بن قیس نے یہ خوش خبری یہودی کو پہنچائی تو اس نے کہا: میرے جیسا بوڑھا آدمی، جب اس کے پاس اس کے اہل وعیال اور اس کا مال ہی نہ ہوں تو وہ اکیلا زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ ثابت بن قیس نے دوبارہ رسول اللہ سے درخواست کی تو آپ نے اجازت دے دی کہ وہ اپنے اہل وعیال اور مال کو بھی لے سکتا ہے۔ مگر یہودی اس پر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اب اس نے پوچھا کہ بنو قریظہ کے دوسرے سرداروں مثلاً کعب بن اسد، حی ابن اخطب، عزال بن سموئل کا کیا حشر ہوا۔ بتایا گیا کہ وہ قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ تھا:

فماعلم انهم قتلوا قال : انی اسالك یا ثابت بیدی عندك الا الحقتنی

بالقوم . فو الله ما في العيش بعد هولاء من خير ، فما انا بصابر لله فتلة دلو ناضح حتى القى الا حبة فضربت عنقه بمشيئه.

محمد حسین ہیکل، حیات محمد، قاہرہ،۱۹۶۵، صفحہ ۳۴۰۔ جب اس نے جانا کہ اس کے تمام یہودی سردار قتل کردیے گئے، تو اس نے کہا، اے ثابت، مجھے بھی میرے لوگوں تک پہنچادو۔ خدا کی قسم ان کے بعد اب زندگی میں کوئی بھلائی نہیں۔ کنویں کے اندر ڈول ڈالنے کی مدت کے بقدر بھی صبر نہیں، یہاں تک کہ میں اپنے دوستوں سے مل جاؤں۔ پس اس کی مرضی کے مطابق اس کی گردن ماردی گئی۔

اس غزوہ میں جو یہودی عورتیں باندی بنائی گئی تھیں، ان میں ریحانہ نامی ایک عورت رسول اللہ کے حصہ میں آئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم اسلام قبول کرلو میں تمہارے ساتھ شادی کرلوں گا۔ تم عزت سے میرے ساتھ رہنا۔ مگر وہ یہودیت ترک کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ وہ آپ کی خدمت میں باندی کی حیثیت سے رہی اور اسی حال میں مرگئی۔

ان کے پاس اپنی ہر غیر خدا پرستانہ روش کے لئے خدا کی کتاب میں دلیل موجود تھی

مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی حضرت مسیح کے منتظر تھے۔ وہ دعا کرتے تھے کہ "خدایا مسیح کو جلد بھیج" مگر جب مسیح ایک غیر یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تو انھوں نے ان کو ماننے سے انکار کردیا۔ حتی کہ اپنے خیال سے آپ کو دار پر چڑھادیا۔ اور آپ کا نام بیل زبوب (شیطان) رکھا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ وہی "شک" تھا جو مصریوں کو حضرت

یوسفؑ کی نبوت ماننے میں رکاوٹ بنا تھا۔ حضرت مسیح اپنے دنیوی شان و شوکت لے کر ظاہر نہیں ہوئے۔ عام انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان تھے۔ یہودیوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں جیسا ایک انسان وہ عظیم انسان ہو سکتا ہے جس کی پیشین گوئی ان کی مقدس کتابوں میں کی گئی تھی۔

یہودیوں نے حضرت مسیح کے انکار کا ایک نہایت آسان راستہ نکالا۔ ان کی کتابوں میں بعد کے دور کے لئے دو پیغمبروں کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ ایک مسیح، دوسرے "وہ نبی" انھوں نے یہ کیا کہ حضرت مسیح کو اس معیار سے جانچنا شروع کیا جو "وہ نبی" کے لئے بتایا گیا تھا۔ چونکہ کہ یہ معیار حضرت مسیح پر راست نہیں آسکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ "جھوٹے مسیح" ہیں اگر وہ سچے مسیح ہوتے تو ضرور ہماری آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیاں ان پر صادق آتیں۔

انھوں نے کہا کہ مسیح کا ظہور، تورات کی نص کے مطابق بعض نشانیوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جب تک یہ نشانیاں ظاہر نہ ہوں، جو کوئی بھی مسیح ہونے کا دعوے دار ہوگا وہ جھوٹا ہوگا۔ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ مسیح ایک غیر معروف مقام سے ظاہر ہوگا۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ اس آدمی کا گھر ناصرہ میں ہے اور ناصرہ فلسطین کا ایک مشہور و معروف شہر ہے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ ایک لوہے کے عصا کے ساتھ حکومت کرے گا۔ یعنی وہ تلوار سے کام لے گا۔ مگر اس مدعی مسیح کے پاس لکڑی کا ڈنڈا تک نہیں ہے۔ تیسری شرط یا نشانی یہ ہے کہ وہ داؤد کے تخت پر بیٹھ کر داؤد کی بادشاہت کو قائم کرے گا۔ جب کہ اس مسیح کا حال یہ ہے اس کے پاس بیٹھنے کے لئے ایک چٹائی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شرط یہ ہے کہ وہ تورات کی شریعت کو پھر سے قائم کرے گا۔ مگر اس شخص نے

اس شریعت کو منسوخ کر دیا۔ ایک نشانی مسیح کی یہ ہے کہ اس کے عہد میں عدل وانصاف اس قدر ترقی پائے گا کہ نیکی اور ہمدردی انسان تو انسان حیوان میں بھی پائی جائے گی۔ جب کہ مسیح کے زمانہ میں یہ حال ہے کہ ہر طرف ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ اسی طرح ایک نشانی یہ ہے کہ مسیح کے وقت خداپرست اتنے کامیاب ہوں گے کہ تمام دنیا کی قوموں پر فتح پائیں گے۔ مگر ہم نہایت ذلت اور غلامی کی حالت میں رومیوں کے ماتحت ہیں۔ پھر یہ شخص وہ مسیح کیسے ہو سکتا ہے جس کی تورات میں پیشین گوئی ہے۔

یہ جتنے معیار یہودیوں نے پیش کئے، وہ سب تورات میں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر وہ "وہ نبی" کے ہیں نہ کہ مسیح کے۔ یہودیوں نے وہ نبی کے معیار کو مسیح کے انکار کے لئے استعمال کیا۔ مگر جب وہ نبی عرب کے ایک غیر معروف شہر میں محمد بن عبداللہ کی صورت میں پیدا ہوئے اور خدا نے آپ پر وہ تمام نشانیاں مکمل طور پر پوری کر دیں جو تورات میں لکھی ہوئی تھیں تو انھوں نے آپ کی نبوت کا انکار کرنے کے لئے ایک اور وجہ تلاش کر لی۔ انھوں نے کہا: اب تک تمام انبیاء اسرائیل کے خاندان میں آئے، پھر اسمٰعیل کے خاندان میں کیسے کوئی نبی پیدا ہو سکتا ہے۔

یہود نے حضرت مسیح کے انکار کے لئے یہ کیا کہ پیغمبر آخرالزماں کی علامتوں کو آپ پر چسپاں کیا جو ظاہر ہے کہ آنجناب پر چسپاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر آخرالزماں کا ظہور ہوا تو آپ کو ان علامتوں سے جانچا جو ان کی کتاب میں حضرت مسیح کے لئے بتائی گئی تھیں۔ اس طرح انھوں نے دونوں نبیوں کا انکار کر دیا۔ اور دونوں مواقع پر ان کے پاس یہ کہنے کے لئے کافی الفاظ موجود تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں کتاب اللہ کی روشنی میں کر رہے ہیں۔ ہم نے خدا کی کتاب سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی موقف اختیار نہیں کیا ہے۔

نبی ﷺ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص سامنے سے گزرا۔ اس کا عمدہ لباس اور اس کا شان دار جسم بتا رہا تھا کہ یہ بستی کا صاحب حیثیت آدمی ہے۔ آپ نے حاضرین سے کہا: اس شخص کے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔ کسی نے جواب دیا، یارسول اللہ، یہ یہاں کے شریف لوگوں میں سے ہے۔ خدا کی قسم وہ اس قابل ہے کہ اگر کسی گھر میں نکاح کا پیغام دے تو قبول کیا جائے۔ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔

آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور شخص سامنے سے گزرا۔ آپ نے دوبارہ حاضرین سے پوچھا، اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کسی نے کہا، یارسول اللہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ کہیں نکاح کا پیغام دے تو قبول نہ کیا جائے، کہیں سفارش کرے تو اس کی سفارش سنی نہ جائے۔ بات کرے تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: "پہلی قسم کے آدمیوں سے اگر ساری زمین بھر جائے تو خدا کی نظر میں ایسا شخص ان سے بہتر ہو گا"

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عوامی بھیڑ میں سچائی دب کر رہ جاتی ہے

حضرت مسیح کو اللہ نے بہت سے معجزے دیئے تھے۔ وہ مٹی کے پرندہ پر پھونک مارتے اور وہ سچ مچ پرندہ بن کر اڑنے لگتا۔ وہ اندھے اور کوڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور وہ فوراً اچھے ہو جاتے اور دیکھنے لگتے، وہ مرے ہوئے انسان سے کہتے کہ اٹھ، اور وہ دوبارہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بتا دیتے کہ کس کے پیٹ میں کیا ہے اور کس کے گھر میں کن چیزوں کا ذخیرہ

ہے (آل عمران ۴۹)

یہ حیران کن باتیں آپ کے استادہ الٰہی ہونے کا ثبوت تھیں۔ مگر یہود نے ان کو آپ کے انکار کا بہانہ بنالیا۔ انھوں نے کہا: "یہ کوئی معلم دین یا قانون ساز نہیں، بلکہ شعبدہ باز ہے اور گلیل کے سادہ مزاج باشندوں میں اس نے شہرت و مقبولیت حاصل کرلی" تاہم فلسطین کے مشرک رومیوں کا تاثر دوسرا تھا۔ مشرک قوموں کا عام مزاج یہ رہا ہے کہ جس کے اندر کوئی غیر معمولی بات دیکھتی ہیں اس کو خدا سمجھ لیتی ہیں۔ برناباحواری کی انجیل میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے معجزوں کو دیکھ کر اس زمانہ کے مشرک رومی سپاہیوں نے آپ کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت مسیح کے بعد جب سینٹ پال آپ کے مذہب میں داخل ہوا تو اس کو مسیحیت کے پھیلانے کے لئے سب سے آسان نسخہ یہ سمجھ میں آیا کہ عوامی ذہن کی رعایت سے مسیحیت کی ایک ایسی تعبیر پیش کی جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول ہو۔ حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق آپ کے ابتدائی پیرو موسوی شریعت پر عمل کرتے تھے۔ سینٹ پال نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی، شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس زمانہ کے رومیوں اور یونانیوں کے مذہب متھرا پرستی (mithrism) کے عقائد کو صرف الفاظ بدل کر مسیحیت میں داخل کرلیا اور کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے اور صلیب پر جان دے کر وہ اولاد آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ ہوگئے ہیں ،اب صرف ان پر ایمان لانا ہی نجات کے لئے کافی ہے۔

حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے سینٹ پال کی اس خود ساختہ مسیحیت کی سخت مخالفت کی، مگر سینٹ پال نے اپنے گھڑی ہوئی مسیحیت میں اس وقت کے عوام کے لئے جو

اعتقادی کشش اور سہولت رکھ دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت سے مسیحی دین میں داخل ہونے لگے۔ حتی کہ جدید مسیحیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس عوامی ریلے میں سچے مسیحی جو تعداد میں بہت کم تھے۔ دب کر رہ گئے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو حضرت مسیح کو بندہ اور رسول مانتے تھے اور آپ کی الوہیت کے عقیدہ کو غلط قرار دیتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز میں جب مشرقی رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲-۳۳۷) بعض سیاسی محرکات کے تحت عیسائی بن گیا تو سینٹ پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کو سیاسی اقتدار کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی ۳۲۵ء میں نقیہ (Nicaea) کی کونسل میں ۳۱۸ مسیحی نمائندے جمع کیے گئے تاکہ مسیحیت کا سرکاری عقیدہ متعین کریں۔ اس میں ۳۱۳ نمائندوں نے سرکاری تشریح کی حمایت کی بقیہ اس کے خلاف رہے۔ پادری اے ریس (Arius) اس کو چیلنج کرنے کے لئے اٹھا تو قسطنطین نے یہ کہہ کر اس کو خاموش کر دیا کہ "اگر تم اس کو نہیں مانتے تو دوسری چیز ہمارے پاس تلوار ہے"

قسطنطین کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد ساری رومی سلطنت میں مسیحی مذہب پھیل گیا۔ یہ تمام مسیحی اسی نئے مسیحی مذہب پر ایمان لائے تھے جو اولاً سینٹ پال اور اس کے بعد ترتولین (۱۵۰-۲۳۰) وغیرہ نے وضع کیا تھا۔ اس عوامی طوفان میں سچے مسیحیوں کے لئے زندہ رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ اولاً خاموش اور اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ختم ہو گئے۔

اسلام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ خود اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کی ذمہ لیا ہے (جب کہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کے حاملین کے اوپر تھی، اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں کہ وہ کبھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے یا مٹ کر ختم ہو جائے۔ مگر

حفاظت کا یہ وعدہ متن اسلام کے لئے ہے، گروہ اسلام کے لئے نہیں ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ اسلام پر بھی ایسا زمانہ آئے کہ کتابی حیثیت سے تو متن اسلام (قرآن) مکمل طور پر محفوظ ہو۔ مگر عملاً ایسا ہو کہ آسمانی مذہب کے بجائے "بزرگوں کا مذہب" اس طرح رائج ہو جائے کہ عملاً وہی قرآن کی جگہ لے لے۔ جیسا کہ دوسری قوموں میں ہوا ہے۔ قرآن کی تلاوت تو خوب ہو رہی ہو مگر دین کو بزرگوں سے لیا جانے لگے حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کی یہ خود ساختہ شکل عوام میں اس قدر مقبول ہوا کہ اسلام کے سچے پیرو اس کے طوفان میں دب کر رہ جائیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط ہے، بہت سے لوگ اس لئے اس کے ساتھ لگ جائیں کہ عوامی پھیلاؤ کی وجہ سے دنیوی فائدے اس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ علماء اس کے خلاف بولنے سے اس لئے ڈریں کہ ان کے مدرسوں کے چندے بند ہو جائیں گے۔ قائدین اس لئے اس سے قطع تعلق نہ کریں کہ انھیں اندیشہ ہو کہ ان کے استقبال کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ بہت سے کتاب اللہ کا علم رکھنے والے اس کو کتاب اللہ کے موافق نہ پائیں مگر اس لئے اس کے گروہ میں شامل رہیں کہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر اس کے پھیلے ہوئے حلقہ سے وہ بہت سے مفادات حاصل کر سکتے ہیں۔

عوامی مقبولیت کبھی سچائی کی سند نہیں رہی ہے۔ بلکہ کسی تحریک کا زیادہ پھیلاؤ اکثر یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی غلطی تو شامل نہیں، کیونکہ حق کو ماننے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور اس کو پانے والے بھی کم۔

سرسری مطالعہ سے جو رائے قائم کی جاتی ہے وہ تحقیق کے بعد اکثر غلط ثابت ہوتی ہے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۰۵-۶۸۰ء) ایک ممتاز صحابی تھے۔ ان کے بارہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی۔ مگر حضرت معاویہ نے اس کو نصف کر دیا، اور باقی خود لینی شروع کر دی"

معاہد کی دیت کے بارے میں نبی ﷺ سے مختلف اقوال مروی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے (**دية ذمي دية مسلم، السنن الكبرى للبيهقي، جلد ٨، صفحه ٢٠**) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی (**عقل الكافر نصف دية المسلم) نيل الاوطار جلد ٧، صفحه ٦٤**) اس بنا پر عہد صحابہ سے یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہئے، اور کچھ لوگ مسلمان اور معاہد کی دیت میں فرق نہیں کرتے۔ حضرت معاویہ نے دراصل دو رایوں میں سے ایک رائے کو ترجیح دی ہے نہ کہ خود کوئی نئی رائے پیدا کی ہے۔

"باقی خود لینی شروع کر دی" کے الزام کی حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام زہری کا مقولہ ان لفظوں میں نقل کیا ہے: معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے معاہد کی دیت کو کم کر کے نصف کر دیا اور نصف اپنے واسطے لے لی (**واخذ**

النصف لیفسه) یہ عبارت سرسری نظر میں مغالطہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ اس کا اجمال ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے معاملہ کو تفصیلی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کا بیان اس کو واضح کر دیتا ہے کہ یہاں اپنی ذات سے مراد حکومتی خزانہ ہے۔ بیہقی نے اپنی سنن میں امام زہری کا مقولہ ابن جریج کی سند سے تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے وہاں الفاظ یہ ہیں

فلما کان معاویة اعطی اهل المقتول النصف والقی النصف فی بیت المال. جب معاویہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کر دی۔

اس میں آپ کے لئے سبق ہے

ابتدائی اسلامی دور کے شعراء میں تین سب سے زیادہ مشہور ہیں: جریر فرزدق اور اخطل۔ جریر (م ۱۱۰ھ) اور فرزدق (۱۱۰ھ) دونوں ایک دوسرے کی ہجو کیا کرتے تھے۔ مثلاً فرزدق نے کہا:

احلامنا تزن الجبال رزانة　　　وتخالنا جنا اذا مانجهل

ہماری عقلیں پہاڑوں کے برابر وزنی ہیں اور جب ہم بگاڑ پر مائل ہو جائیں تو تم ہم کو جن خیال کروگے۔ جریر نے جواب دیا:

ابلغ بنی وقبان ان حلومهم　　　خفت فلايزنون حبة خردل

بنی وقبان کو بتادو کہ ان کی عقلیں ہلکی ہو گئیں اور وہ رائی کے برابر بھی وزنی نہیں

یہ ایک سادہ سی مثال ہے۔ ورنہ انکی ہجویات خاص طور پر فرزدق کی، اتنی زیادہ عریاں ہیں کہ ان کو نقل بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جریر کے سلسلہ میں یہ قصہ مشہور ہے کہ اس کی ماں نے ایام حمل میں خواب دیکھا

کہ اس کے اندر سے ایک رسی نکلی اور لوگوں کے اوپر کودنے لگی اور ایک ایک کا گلا گھونٹنے لگی۔ جب اس نے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی تو بتانے والوں نے بتایا کہ تجھ سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو لوگوں کی ہجو کیا کرے گا اور ان کے لئے ایک آفت کا باعث ہوگا۔ اسی لئے لڑکے کا نام جریر رکھا گیا جس کے معنی عربی زبان میں رسی کے ہوتے ہیں۔

دو معاصر شعراء کے درمیان ہجو گوئی کیسے شروع ہوئی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جریر بن عطیہ یمامہ میں پیدا ہوا۔ طبیعت کے رجحان اور ماحول کے اثر سے شعر و شاعری شروع کردی۔ اس کو معلوم ہوا کہ بصرہ میں شاعروں کی بڑی قدر ہے۔ وہ وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھ کہ فرزدق اپنی شاعری کی بدولت بہت بلند مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ فرزدق کی خوش حالی اور اس کی قدر و منزلت نے اس کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ دونوں تمیمی تھے۔ تاہم جریر دل ہی دل میں اس سے حسد کرنے لگا۔ مربد کا بازار جریر اور فرزدق کے فخریہ قصائد اور ہجویہ نظموں کا اکھاڑا بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی بحر میں قصائد لکھتے جو "نقائض" کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاہم جب عمر کا بالکل آخری حصہ آیا تو دونوں مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہوگئے۔

آدمی جب کسی مشغلہ کو اختیار کرتا ہے تو خواہ اس کا محرک جو بھی ہو دھیرے دھیرے وہ اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور اس کے اقوال و افعال اسی کے سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جریر اس کی ایک مثال ہے۔

جریر ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دربار میں پہنچا۔ وہاں عدی بن رقاع عاملی بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیفہ نے جریر سے پوچھا: "ان کو پہچانتے ہو" جریر نے کہا: "اے امیر المومنین نہیں" خلیفہ نے بتایا کہ یہ عاملہ خاندان کے فرد ہیں۔ یہ سن کر برجستہ

جریر کی زبان سے نکلا: "وہی عاملہ جس کے بارہ میں اللہ فرماتا ہے: عاملة ناصبة تصلی نارا حامية (بہت سے چہرے اس دن خستہ ہوں گے، بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، غاشیہ۔۴)اس کے بعد ایک بیہودہ شعر پڑھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جریر اور عدی کے درمیان دشمنی شروع ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہجویہ نظمیں لکھیں

لطیفہ

ابن الرمی(۲۸۴۔۲۲۱ھ)ایک شاعر تھا وہ لوگوں کی ہجو کیا کرتا تھا۔ خلیفہ معتضد باللہ کے وزیر ابوالحسین قاسم بن عبداللہ کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ اس کی ہجو کر کے اس کو عوام میں ذلیل نہ کرے۔ یہ وزیر بڑا بے رحم تھا۔اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ اس کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔ایک بار جب ابن الرومی وزیر کے دستر خوان پر کھانا کھا رہا تھا، وزیر نے چپکے سے اس کے کھانے میں زہر ڈال دیا۔ابن الرمی زہر آلو کھانے کے کچھ لقمے کھا چکا تو اس کو احساس ہوا۔وہ فوراً کھانے سے اٹھ گیا۔اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ ہے۔

وزیر: ابن الرومی کہاں جا رہے ہو۔

ابن الرومی: جہاں تم مجھ کو بھیجنا چاہتے ہو۔

وزیر: دیکھو وہاں پہنچ کر میرے والد کو میرا سلام پہنچا دینا۔

ابن الرومی: لیکن جہنم سے میرا گزر نہیں ہوگا۔

دوسرا باب

لوگ اگر تاریخ سے سبق لیں تو وہ ماضی کی
غلطیوں کو حال میں دہرانے سے بچ جائیں۔

فطرت پر

اریقت دماء من بطنین من قریش۔ فجمع ابو سفیان کبارھم وقال۔ ھل لکم یا معشر قریش فی الحق اوما ھو افضل منہ۔ فقال القوم۔ وھل من شیئ افضل من الحق۔ فقال ابو سفیان۔ نعم انہ العفو۔ فقام القوم و تصالحوا۔

قبیلہ قریش کے دو خاندانوں میں خون بہانے کا واقعہ ہوا۔ ابوسفیان نے ان کے بڑوں کو جمع کیا اور کہا کہ اے قریش کے لوگو، تم خون کا بدلہ لینا چاہتے ہو یا وہ جو اس سے بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا، کیا کوئی چیز ہے جو اس سے بھی بہتر ہو۔ ابوسفیان نے کہا ہاں۔ اس سے بہتر چیز معافی ہے۔ پس لوگ اٹھے اور آپس میں صلح کر لی۔

یہ واقعہ اس انسان کے مزاج کو بتاتا ہے جو اپنی فطرت پر قائم ہو۔ قدیم عرب کے لوگ اسی فطری حالت پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت نے بھرپور طور پر اسلام کو قبول کر لیا، اور جب ایک بار اسلام کو قبول کر لیا تو پھر اس سے انحراف کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

جو آدمی اپنی فطرت پر قائم ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جب کوئی سیدھی اور صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتا ہے۔ وہ ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے جو لوگوں کے لیے سچائی کو ماننے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

فطرت پر قائم رہنے والا آدمی ضد، انتقام، انانیت، بے اعتراضی جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ایک وسیع القلب اور وسیع الظرف انسان ہوتا ہے۔ وہ دُہرے انداز سے سوچنا نہیں جانتا۔ وہ نفرت اور بدگمانی کے تحت فیصلہ نہیں کرتا بلکہ جو فیصلہ کرتا ہے خالی الذہن ہو کر کرتا ہے۔ وہ اس بیماری سے خالی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لے اور پھر کسی حال میں اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے انسان کے شر سے بچنے کی واحد تدبیر اعراض ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اس کی زد میں آنے سے بچانا۔

فطرت پر قائم رہنا خدا کے نقشہ پر قائم رہنا ہے۔ اور جو آدمی فطرت پر قائم ہو اس کو کمالِ انسانیت کی منزل تک پہنچنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔

دو کردار

بنو عباس نے بنو امیہ سے اقتدار چھینا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اموی خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ کوئی تخت کا دعویدار باقی نہ رہے۔ تاہم ان کا ایک نوجوان (عبدالرحمٰن الداخل) ان کی پکڑ سے بچ گیا۔ وہ دمشق سے بھاگ کر اسپین پہونچا۔ وہاں اس نے بنو امیہ کی مشہور سلطنت قائم کی۔

بنو عباس کا دارالسلطنت بغداد تھا اور اسپین کی اموی حکومت کا دارالسلطنت قرطبہ۔ مذکورہ تاریخی پس منظر کی وجہ سے دونوں میں مسلسل رقابت رہتی تھی۔ فرانس اس سمندر پار اموی سلطنت کا پڑوسی تھا۔ بغداد نے یہ کیا کہ اس نے فرانس کے عیسائی حکمراں کی خدمت میں قیمتی تحفے روانہ کیے اور اس کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اسپین کی اموی حکومت کے خلاف کارروائی کرکے بغداد کے انتقامی جذبات کی تسکین کرے۔

دوسری طرف بغداد کی عباسی سلطنت کا پڑوسی قسطنطنیہ تھا۔ سابق رومی شہنشاہیت کا وارث قیصر اپنی سلطنت کا بڑا حصہ کھو کر اس وقت قسطنطنیہ میں اپنا مرکز قائم کیے ہوئے تھا۔ قیصر نے سوچا کہ بغداد جس طرح اسپین پر حملہ کرنے کے لیے فرانس کے عیسائی حکمراں کی مدد کر رہا ہے، اسی طرح اگر میں بغداد کے خلاف مہم شروع کروں تو قرطبہ کی طرف سے مجھے مدد حاصل ہوگی۔

اس امید کے تحت قیصر قسطنطنیہ نے ۲۰۹ھ میں اپنا ایک سفیر قرطبہ کے اموی حکمراں عبدالرحمٰن الثانی کے پاس بھیجا۔ بظاہر عبدالرحمٰن الثانی کو قیصر کے سفیر کا زبردست خیر مقدم کرنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ وہ اس کے دشمن کے خلاف چڑھائی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس طرح وہ بغداد کے خلاف اپنے انتقامی جذبات کی تسکین حاصل کرسکتا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ قیصر کے سفیر نے عبدالرحمٰن الثانی سے کہا کہ اگر آپ قیصر سے دوستی کریں تو اس کے تعاون سے آپ اپنی آبائی سلطنت (شام، عراق، عرب، وغیرہ) عباسیوں سے واپس لے سکتے ہیں۔ مگر عبدالرحمٰن الثانی نے قسطنطنیہ کے سفیر کو رسمی باتیں کرکے لوٹا دیا۔

انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے دشمن کے دشمن کو دوست بنانا ایک سطحی فعل ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو اس قسم کے جذبات سے اوپر اٹھ جائے۔ جو اصول کی بنا پر لوگوں سے معاملہ کرے نہ کہ دوستی اور دشمنی کی بنا پر۔

حالات کے نتیجہ میں

امام مالک سے پوچھا گیا کہ جبری طور پر کسی سے طلاق لی جائے تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جبری طلاق طلاق نہیں ہے۔ یہ خلیفہ منصور کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اس کا جو گورنر تھا اس نے امام مالک کو ایسا فتویٰ دینے سے روکا۔ مگر امام مالک نہ مانے۔ اس کے بعد گورنر نے حکم دیا کہ امام مالک کو نوے کوڑے مارے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ان کی پیٹھ ننگی کر کے اس پر ۹۰ کوڑے مارے گئے (مرآۃ الجنان)

کوڑے کی مار سے اگر چہ امام مالک کی پیٹھ خون آلود ہوگئی تھی۔ لیکن گورنر نے دیکھا کہ اب بھی امام مالک کے اندر کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جائے اور چہرہ پر سیاہی لگا کر مدینہ کے راستوں میں گھمایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اونٹ پر بٹھا کر ان کو مدینہ کے راستوں میں گھمایا گیا۔ امام مالک کا حال یہ تھا کہ اس وقت بھی وہ کہتے جاتے تھے: جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں مالک بن انس ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ زبردستی کی طلاق کچھ نہیں ہے (من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس، اقول ان طلاق المکرہ لیس بشیئ)

ایک خالص غیر سیاسی فتوے پر وقت کے سیاسی حاکم نے اتنا شدید ردعمل کیوں ظاہر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ اگر چہ بذات خود غیر سیاسی تھا۔ مگر وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کے اندر سیاسی اہمیت پیدا ہوگئی تھی۔

اس زمانہ میں عملاً نسلی بادشاہت چل پڑی تھی۔ تاہم اسلام کے اثر سے حکمراں اس کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ وہ لوگوں سے بیعت لیں اور عوام کو یہ تاثر دیں کہ وہ عوامی رائے سے خلیفہ بنے ہیں نہ کہ محض شاہی خاندان سے تعلق کی وجہ سے۔ مگر عوام ان حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ خلفاء جبری طور پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ اس پس منظر میں امام مالک کا فتویٰ بہت معنی خیز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبری طلاق جس طرح بے اعتبار ہے اسی طرح جبری بیعت بھی بے اعتبار ہے۔ گورنر کو اندیشہ ہوا کہ امام مالک کے فتوے کی وجہ سے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی نگاہ میں غیر معتبر نہ ہو جائے۔ اسی لئے اس نے اس کا اتنا سخت نوٹس لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خالص غیر سیاسی مسئلہ بھی مخصوص حالات کے نتیجہ میں سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں مشرک بادشاہوں کا دعوت توحید کے خلاف شدید ردعمل بھی اسی قسم کے حالات کا نتیجہ تھا۔

تعصّب کی حد

جاراللہ زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ معتزلہ سے عام مسلمانوں کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ ان کی کتابوں کے دشمن ہوگئے۔ فرقہ معتزلہ میں کثرت سے علمار تھے اور انھوں نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں مگر ان کی تمام کتابیں جلادی گئیں۔ اس میں صرف ایک استثنار ہے اور وہ زمخشری کا ہے۔ زمخشری اگرچہ معروف معتزلی تھا۔ تاہم اس کی دو کتابیں المفصل (نحو) اور الکشاف (تفسیر قرآن) آج بھی موجود ہیں اور علمائے اہل سنت کے درمیان بدستور مقبول ہیں۔ اور علمی مرجع کے طور پر کام دیتی ہیں۔

اسی طرح ابن منظور (۶۳۰-۷۱۱ھ) ایک شیعہ تھا۔ شیعی گروہ اور اہل سنّت کے درمیان ایک ہزار سال سے زبردست اختلافات موجود ہیں۔ آج تک ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شیعہ علمار کی کتابیں صرف شیعہ فرقہ کے درمیان رائج ہیں۔ سنّی علمار ان کو دیکھتے ہیں تو تردید کے لئے نہ کہ استفادہ کے لئے۔ مگر یہاں بھی بعض استثنار ہیں۔ مثلاً ابن منظور کی کتاب لسان العرب (لغت) کو علمار اہل سنّت کے درمیان خصوصی مقام حاصل ہے اور اہل علم عام طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

زمخشری کا اعتزال اور ابن منظور کی شیعیت ان کی کتابوں کو علمار اہل سنّت کے درمیان مقبول بنانے میں حارج نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بعض اہم موضوعات پر ایسی قیمتی کتابیں لکھیں جن کے مثل اس خاص موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہ تھی۔ ان کی مقبولیت ان کے امتیازی عمل کی قیمت ہے۔ بعض آدمی کا کام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات ان کو قبول کرنے میں حارج نہیں ہوتے۔

زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے لئے جن لوگوں کو صرف "تعصّب" کا لفظ معلوم ہے انھیں ایک اور حقیقت کی خبر نہیں۔ وہ یہ کہ تعصب کے عمل کی بھی ایک حد ہے۔ ایک حد کے بعد تعصب غیر موثر ہوجاتا ہے یہ حد ہے "امتیاز"۔

اگر آپ اپنی کارکردگی کو عام معیار سے بڑھا کر امتیاز کے درجہ میں پہنچا دیں تو تعصّب کی دیواریں اپنے آپ گر جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا دشمن بھی آپ کا اتنا ہی قدر داں بن جاتا ہے جتنا آپ کا دوست۔

حکومتی منصب

سفیان بن سعید بن مسروق الثوری ۹۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۶۱ھ میں بصرہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی کتابوں میں الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر بہت مشہور ہیں (الاعلام ۳/۱۰۴)

المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں القعقاع بن حکیم کے حوالہ سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ المہدی کے پاس تھا۔ اس وقت سفیان الثوری وہاں لائے گئے۔ جب وہ آئے تو خلیفہ کو انھوں نے عام انداز کا سلام کیا، دربار خلافت والا سلام نہیں کیا۔

المھدی کا وزیر الربیع اس کے پاس تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ المہدی نے سفیان ثوری کو دیکھ کر کہا کہ تم ہم سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم تمہارے اوپر قابو نہیں پا سکتے۔ مگر اب تم ہمارے اختیار میں ہو کیا تم اس سے نہیں ڈرتے کہ ہم تمہارے اوپر جو فیصلہ چاہیں کریں۔ سفیان ثوری نے کہا کہ اگر تم میرے معاملہ میں کوئی غلط فیصلہ کروگے تو قادر مطلق خدا تمہارے اوپر فیصلہ کرے گا اور وہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دے گا۔ وزیر ربیع نے کہا کہ اے امیر المومنین کیا اس جاہل کے لئے سزاوار ہے کہ وہ آپ سے اس طرح خطاب کرے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔

المہدی نے ربیع سے کہا کہ چپ رہو، تمہارا برا ہو۔ وہ اور اس قسم کے لوگ یہی تو چاہتے ہیں کہ ہم انھیں قتل کر دیں اور ان کو سعید ثابت کر کے اپنے کو شقی بنالیں۔ کاغذ لاؤ اور ان کے لئے لکھو کہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وزیر ربیع نے اس کو لکھ کر انھیں دیدیا۔ سفیان ثوری کاغذ لے کر باہر نکلے۔ اس کو دجلہ میں پھینک دیا اور بھاگ گئے۔ اس کے بعد ان کو ہر شہر میں تلاش کیا گیا لیکن وہ نہیں ملے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔

سفیان الثوری نے جب کوفہ کے قاضی کا عہدہ قبول نہیں کیا تو اس کے بعد خلیفہ نے کوفہ کے ایک اور عالم کو یہ عہدہ دے دیا۔ ان کا نام شریک بن عبداللہ بن الحارث النخعی (۱۷۷) تھا۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو ایک عربی شاعر نے اس پر یہ شعر کہا کہ سفیان

بچ گئے اور اپنے دین کے ساتھ بھاگ گئے۔ اور شریک درہم کے پیچھے دوڑ پڑے :

نحرّز سفیان وفـرّ بـدیـنـه　　وأمسى شُريكٌ مُرصداً للدراهم

شریک النخعی الکوفی بھی سفیان ثوری ہی کی طرح ایک بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ ان کے متعلق صاحب تذکرۃ الحفاظ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں میں نہایت عادل تھے (وکان عادلاً فی قضائہ) ان کے عادل ہونے کا ایک واقعاتی ثبوت یہ ہے کہ خلیفہ المنصور العباسی نے ان کو ۱۵۳ھ میں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مگر ان کے غیر مصالحانہ رویہ کی وجہ سے اس نے انھیں معزول کر دیا۔ اس کے بعد المہدی نے دوبارہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا۔ مگر اس کے بعد موسیٰ الہادی کو دوبارہ انھیں معزول کرنا پڑا۔ (الاعلام ۳/۱۶۳)

اس حقیقت کے باوجود شاعر نے مذکورہ شعر کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانہ میں تقویٰ کا ایک غلط معیار رائج ہو گیا۔ وہ یہ کہ جو شخص عہدہ قبول نہ کرے وہ متقی ہے اور جو شخص عہدہ قبول کر لے وہ غیر متقی۔ حالاں کہ اسلام میں اعمال کا مدار نیت پر ہے نہ کہ محض ظاہر پر۔ یہ سراسر ایک اضافی چیز ہے کہ کس نے حکومتی عہدہ قبول کیا اور کس نے قبول نہیں کیا۔ دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ عہدہ قبول کرنے کے بعد وہ اپنی نیت اور اپنے کردار کے اعتبار سے کیسا رہا۔

اہل علم اور اہل خیر کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں۔ اس کی ایک انتہائی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ آپ خدا کے پیغمبر تھے اور آپ نے مصر کے مشرک بادشاہ کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ قبول فرمایا۔ مگر بعد کے زمانہ میں علماء اسلام غیر ضروری طور پر حکومتی عہدوں کو برا سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہا گیا کہ یہ حضرت یوسف کے لئے خاص تھا۔ اب ہمارے لئے وہ جائز نہیں (ان هٰذا كان ليوسف خاصة، وهٰذا اليوم غير جائز) الجامع لاحکام القرآن ۹/۲۱۵

لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا عین جائز ہے اور اس میں اسلام اور ملت کے لئے کثیر فائدے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو اور کسی بھی قسم کا دنیوی مفاد مقصود نہ ہو۔ اسلام میں ساری اہمیت صرف نیت یا اسپرٹ کی ہے، ظاہر کی اہمیت تمام تر اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔

کتنا فرق

ہمارے اخبارات و رسائل میں جو موضوعات بہت زیادہ رائج ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی شخصیت اپنی عمر پوری کر کے اگلی دنیا کی طرف جاتی ہے تو بڑے جذباتی قسم کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں

روشن چراغ بجھ گیا، آفتاب علم غروب ہو گیا، ملت کا چاند دنیا سے چلا گیا وغیرہ۔ اس قسم کی سرخیاں مرنے والوں کے بعد ہماری صحافت میں اتنی بار شائع ہو چکی ہیں کہ اگر واقعۃً یہ صحیح ہوں تو اب تک اتنا زیادہ اندھیرا چھا جانا چاہئے کہ ان سرخیوں کو پڑھنا بھی کسی آنکھ والے کے لئے ممکن نہ رہے۔

"ایک چراغ اور بجھا اور بڑھا سناٹا" یہ سرخی یا اس کے ہم معنی سرخی ہمارے اخبارات و رسائل میں عام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر مرنے والا جب صرف ہماری ویرانی اور ہماری تاریکی میں اضافہ کر رہا ہے تو اس کے بعد عقل کس کے پاس ہو گی اور روشنی کہاں باقی رہے گی۔ اور جب روشنی اور عقل رخصت ہو جائے تو کون دیکھنے والا ہو گا جو دیکھے اور کون سمجھنے والا ہو گا جو سمجھے۔

یہ دور زوال کی بات ہے۔ مگر جب ملت زندہ تھی تو کیا حال تھا، اس کی ایک مثال لیجئے۔
اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کا انتقال ۸۶ھ میں ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے ولید نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت اس کے دوسرے لڑکے ہشام کی زبان سے یہ شعر نکلا:

فما كان قيس هُلكه هلك واحدٍ ولكنه بنيان قوم تهدّ ما

قیس کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں بلکہ اس کے مرنے سے قوم کی بنیاد منہدم ہو گئی

یہ سن کر ولید نے کہا، چپ ہو! تو شیطان کی زبان سے بول رہا ہے۔ تو نے اس طرح کیوں نہ کہا جس طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

اذا مات منا سيدٌ قام سيدٌ قؤولٌ لما قال الكرام فعولُ

جب ہم میں سے کوئی سردار مرتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ وہی کرتا اور کہتا ہے جو شریف لوگ کہتے اور کرتے ہیں۔

دور زوال میں جب کوئی شخص مرتا ہے تو وہ دوسروں کو صرف مرثیہ کا سبق دیتا ہے۔ دور عروج میں جب کوئی مرتا ہے تو دوسروں کو حوصلہ دے کر نئی زندگی عطا کر دیتا ہے

قرآن سے تعلق

امام شافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) کو اصول فقہ کا موسس کہا جاتا ہے۔ علم وفضل کے علاوہ دینداری اور تقویٰ میں بھی وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ان کے بارہ میں ہے کہ ــــ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام سے اس درجہ قوی ہو جتنی اپنے زمانہ میں امام شافعی کی تھی۔

امام شافعی کی عمر ابھی دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے قرآن کا حفظ مکمل کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تین دن میں قرآن کی ایک تلاوت مکمل کرلیتے تھے۔ ان کو قرآن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ہر مسئلہ کی اصل قرآن سے معلوم ہو جائے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امت کا اجماع دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی کو یہ تلاش ہوئی کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کو بار بار پڑھتے اور کوئی ایسی آیت تلاش کرتے جس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہو سکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کوشش میں امام موصوف نے ۳۰۱ بار پورے قرآن کو پڑھ ڈالا۔ بالآخر انھوں نے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کرلی۔ ایک روز وہ تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۵ پر پہنچے تو اچانک ان پر منکشف ہوا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے کی شرعی دلیل موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا	اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ چلا تو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو ہم کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام شافعی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہاں سبیل المومنین سے وہی چیز مراد ہے جس کو ہم اجماع امت کہتے ہیں۔

دور اول کے اہل ایمان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں سینکڑوں بار پورا قرآن پڑھنا پڑے۔ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ کسی چیز کے بارہ میں قرآن کا حکم دریافت نہ کرلیں۔ مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کا استعمال ان کے یہاں یا تو برکت کے لئے ہوتا ہے یا صرف تلاوت کے لئے۔

تاریخ کا سبق

۷۵۰ء میں عباسیوں نے بنو امیہ سے خلافت چھین لی اور عباسی خلافت کی بنیاد ڈالی۔ عباسی لیڈر یہ کام صرف اپنی طاقت سے نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی مدد لی۔ ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کی سلطنت ختم ہوئی اور بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی۔ انھوں نے دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔

ایرانیوں سے مدد لینا صرف ایک وقتی معاملہ یا سادہ واقعہ نہیں تھا۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ مسلم سماج اور مسلم سیاست دونوں میں ایرانیوں کا نفوذ بہت بڑھ گیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی تعریب (Arabicization) کے اصول پر چل رہی تھی، اس کے جلو میں اسلامائزیشن کا عمل جاری تھا۔ مگر عباسی اقتدار میں ایرانیوں کے زیر اثر تفریس (Persianization) کا عمل جاری ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے جس کے گہرے اثرات آج تک باقی ہیں

ایک مورخ کے الفاظ میں، عباسیوں کے ماتحت اسلامی خلافت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ بنو امیہ کے زمانہ میں توجہ کا مرکز مغرب، شمالی افریقہ، میڈیٹرینین اور جنوبی یورپ تھا۔ مگر اب اسلامی خلافت نے اپنی توجہ مشرق کی طرف موڑ دی:

Under the Abbasids the caliphate entered a new phase. Instead of focussing, as the Umayyads had done, on the West - on North Africa, the Mediterranean, and relations with southern Europe - the caliphate now turned eastward. (I/7)

اس معاملہ کی سنگینی اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب یہ سوچا جائے کہ عباسی خلفاء اگر بنو امیہ کے خلاف اپنی مہم میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے تو اسلامی تاریخ میں اس شاندار باب کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔

عباسی خلفاء نے نہ صرف یہ کیا کہ مغربی ممالک کی طرف اپنی توجہ کم کر دی۔ بلکہ وہ ان امویوں کے جانی دشمن بن گئے جو ان سے پہلے یہ کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اموی خاندان یا اموی سلطنت سے تعلق رکھنے والے ایک ایک شخص کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اموی دور میں اگر اسپین کی

طرف پیش قدمی شروع نہ ہوچکی ہوتی اور اموی شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل اگر جان بچاکر اسپین پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا تو اسلامی تاریخ میں مسلم اسپین اور یورپ میں اسلام کے داخلہ کا باب شاید سرے سے حذف ہوجاتا۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں ہندستان میں پیش آیا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ۱۵۴۰ سے لے کر ۱۵۵۵ تک وہ دہلی کے تخت سے محروم رہا۔ اس دوران وہ بھاگ کر ایران پہنچا اور وہاں شاہ تہماسپ سے مدد مانگی۔ ایرانی بادشاہ نے ایک بڑی فوج اور ضروری سامان اس کے حوالے کیا۔ اس طرح ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے از سر نو دہلی کے تخت پر قبضہ کیا۔ ۱۵ سال کے وقفہ کے بعد مغل سلطنت دوبارہ دہلی میں قائم ہوئی۔

مگر دوبارہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے نظام میں ایران کے سیاسی اور تہذیبی اثرات داخل ہوگئے۔ ایرانی اس وقت آرٹ اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ایران سے آرٹسٹ، پینٹر، نقاش اور شاعر قسم کے لوگ بڑی تعداد میں ہندستان آنے لگے۔ ہندستان کا مسلم سماج گہرے طور پر اس سے متاثر ہوا، اور ایرانی تہذیب کے رنگ میں رنگ گیا (17/132)

تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ سبق یہ کہ جب آپ کسی سے مدد لے کر کامیابی حاصل کریں تو وہ کامیابی صرف آپ کی کامیابی نہیں ہوگی بلکہ اس میں اس شخص یا گروہ کا بھی دخل ہوجائے گا جس کی مدد سے آپ نے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ ہزار کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس انجام سے نہیں بچا سکتے۔

ایسی حالت میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو کام کیا جائے خود اپنی بنیاد پر کیا جائے۔ زیادہ بڑے کام کا شوق نہ کیا جائے بلکہ چھوٹی سطح پہ کام شروع کرکے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔

حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ تدریج ہے، چھلانگ نہیں۔

اسلامی رواداری

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سائنس کی تاریخ (History of Science) کے موضوع پر تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ جس وقت اسلامی تہذیب عروج پر تھی اس وقت مغربی یورپ میں تہذیب بالکل پست حالت میں تھی۔ پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں۔ دسویں صدی عیسوی تک یہ حال ہوا کہ ایران سے لے کر اسپین تک تمام قوموں کی علمی زبان عربی بن چکی تھی۔ عرب فاتحین عام طور پر ان ملکوں میں امن اور خوشحالی لے آئے جہاں وہ آباد ہوئے۔ مثال کے طور پر اسپین میں قرطبہ کے کتب خانہ میں اس وقت پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں تھیں جب کہ پائرینیز کے شمال میں مشکل سے پانچ ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی روادار تھے۔ چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں یہودی اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے جب کہ اسی زمانے میں یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں انھیں زندہ رہنے کا حق بھی مشکل سے دیا جاتا تھا:

> The Muslims were tolerant of the other monotheistic faiths. So that Jews rose to high position in Islamic lands at a time when they were scarcely permitted survival in Europe (16/368).

موسیٰ بن میمون (۱۲۰۴ — ۱۱۳۵ء) یہود کے اکابر علماء میں سے تھا۔ وہ کلدانی، یونانی، عبرانی اور عربی زبانیں جانتا تھا۔ یہود کے یہاں اس کی عظمت اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی۔ انھوں نے کہا کہ موسیٰ سے موسیٰ تک موسیٰ جیسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا (من موسیٰ الی موسیٰ لم یظهر واحد کموسیٰ)

موسیٰ بن میمون کی پیدائش اندلس کے شہر قرطبہ میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصر پہونچا۔ اس وقت صلاح الدین ایوبی مصر کا حکمران تھا۔ اس نے موسیٰ بن میمون کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ موسیٰ بن میمون کی یہودیت کے باوجود صلاح الدین ایوبی نے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہ کی۔

یہ بھی ممکن ہے

برطانی فلسفی راشڈل ہیسٹنگز (۱۹۲۴ - ۱۸۵۰) نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب ابن رشد کی کتابیں یورپ میں پھیلیں تو اس کا فلسفہ عیسائیوں کو اپنے حق میں شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل نے ایک متفقہ فیصلہ کیا اور اس کے مطابق ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کو تعلیم و تدریس کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر یہ فیصلہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو احساس ہوا کہ انھوں نے ایسا کرکے اپنے طلبہ کو علم کے خزانہ سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ نہ صرف ممنوعہ کتابیں دوبارہ داخل نصاب کی گئیں بلکہ نئے قاعدہ کے مطابق یونیورسٹی کے فارغ طلبہ سے یہ حلف لیا جانے لگا کہ وہ صرف ان چیزوں کو اپنی تعلیم و تدریس میں استعمال کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو:

Rashdall Hastings, Universities, p. 368

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو مخالف بھی کس طرح اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کچھ لوگ تعصب یا ضد میں ابتداءً آپ کو نہ مانیں تو اس نہ ماننے کو بھی مستقل نہ سمجھئے۔ اگر فی الواقع آپ کے اندر کوئی قابل قدر چیز ہے تو جلد وہ دن آئے گا جب کہ نہ ماننے والے کو اپنے نہ ماننے پر پچھتاوا ہو اور وہ دوبارہ آپ کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

ابن رشد دنیا میں موجود نہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے یا اپنے حق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلائے۔ تاہم اس کا عمل لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ پیرس یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ابن رشد کی تعلیم تو بند کر دی۔ مگر بہت جلد ان کو احساس ہوا کہ ابن رشد کی کتابوں کا بدل ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ابن رشد خواہ ان کے لئے ایک غیر مطلوب انسان ہو مگر اپنی نسلوں کی تعلیم تو بہر حال ان کے لئے ایک مطلوب چیز تھی۔ بالآخر انھیں محسوس ہوا کہ ابن رشد کو چھوڑنا صرف اس قیمت پر ممکن ہے کہ خود اپنی نسلوں کی تعلیم ناقص رہ جائے۔ وہ ابن رشد کو نظر انداز کر سکتے تھے مگر اپنے آپ کو نظر انداز کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابن رشد کی کتابوں کو دوبارہ اختیار کر لیا ——— کوئی شخص اگر یہ حیثیت حاصل کرلے کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن جائے تو دوسرے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خواہ یہ دوسرے اس کے حریف کیوں نہ ہوں۔

بادشاہ بھی

يروى ان عبد الملك بن مروان خطب يوماً خطبة بليغة ثم قطعها وبكى بكاءً شديداً ثم قال: يا ربّ ان ذنوبي عظيمة وان قليل عفوك اعظم منها۔ اللهم فامح بقليل عفوك عظيم ذنوبي۔ فبلغ ذالك الحسن فبكى وقال لو كان كلام يكتب بالذهب لكتب هذا الكلام

(الدعوة ۲ اجمادی الاخریٰ ۱۴۰۵ھ)

بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک روز ایک بلیغ خطبہ دیا۔ پھر وہ رک گیا۔ اور شدت کے ساتھ رویا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے میرے رب، بے شک میرا گناہ بہت زیادہ ہے مگر تیری تھوڑی معافی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اے اللہ، اپنی تھوڑی سی معافی سے میرے زیادہ گناہ کو مٹا دے۔ یہ بات حضرت حسن بصری کو پہنچی تو اس کو سن کر وہ رو پڑے اور کہا کہ اگر کوئی کلام سونے سے لکھا جاتا تو یقیناً یہ کلام اس قابل تھا کہ اسے سونے سے لکھا جائے۔

عبدالملک بن مروان (۸۵ - ۲۳ھ) بنو امیہ کا نہایت ذہین اور مدبر خلیفہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی اسی کا عامل تھا جس نے مکہ پر چڑھائی کی اور عبداللہ بن زبیر کو قتل کیا۔ عبدالملک بن مروان کا شمار تابعین کے گروہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے جابر بادشاہ بھی خدا کے خوف سے خالی نہ تھے۔ کسی نہ کسی موڑ پر ان کا جذبہ پھٹ پڑتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ "دیندار" لوگ بھی خوف خدا سے خالی ہو گئے ہیں۔ ان کی نمازوں نے ان کے دلوں کو نرم نہیں کیا۔ ان کے ذکر نے ان کے سینہ کو چھلنی نہیں کیا۔ ان کا ایمان وہ ایمان نہیں بنا جو ان کو خدا کے سامنے کھڑا کر دے۔

موجودہ زمانہ کے لوگوں پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرہ ۷۴)

تعصب کی قیمت

اسپین یورپ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ وہ ہزاروں برس سے ایک انتہائی پسماندہ ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد پہلی بار اسپین کی ترقی شروع ہوئی۔ عربوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے دوران اسپین نے غیر معمولی ترقی کی۔ حتیٰ کہ یورپ کے اسی پسماندہ ملک سے یورپ کی جدید شاندار ترقیوں کا آغاز ہوا۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے اپنی متعصبانہ ذہنیت کی بنا پر مسلمانوں کے کارناموں کا اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے اسپین کی مسلم سلطنت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے انھیں موقع دیا۔ یہاں تک کہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسپین سے مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ تین ملین مسلمان یا تو ملک سے نکال دیئے گئے یا بے رحمی کے ساتھ مار ڈالے گئے (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۵۵۹)

مگر اسپین کے عیسائیوں کا یہ عمل ان کے لیے الٹا پڑا۔ اس سے انھیں اپنے متعصبانہ ذہن کی تسکین کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ مسلمانوں کے نکلنے کے بعد اسپین کبھی دوبارہ ترقی نہ کر سکا۔ مشہور مورخ لین پول نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> The Moors were banished; for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light; then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since.
>
> Lane-Poole, *Moors in Spain* p. 280

اسپینی مسلمان ملک سے نکال دیئے گئے۔ عیسائی اسپین ایک لمحہ کے لیے چاند کی طرح غیر کی روشنی سے چمکا۔ پھر اس پر گرہن آگیا۔ اور اسپین اس وقت سے آج تک اسی تاریکی کی ذلت میں پڑا ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا کسی ملک میں جانا وہاں ترقی کا جانا تھا اور مسلمانوں کا وہاں سے نکلنا ترقی کا نکل جانا۔ آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دوسری طرف اسپین اور اس کے جیسے دوسرے ممالک کے لیے بھی اس میں سبق ہے۔ وہ یہ کہ تعصب بظاہر دوسرے کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی قیمت خود اس قوم کو ادا کرنی پڑتی ہے جس نے تعصب کا معاملہ کیا تھا۔

امامت کا راز

سسلی ایک یوروپی ملک ہے جو میڈیٹیرینین سمندر میں واقع ہے اور اٹلی سے ملا ہوا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں یہاں ایک مسیحی نارمن بادشاہ راجر دوم (۱۱۵۴—۱۱۰۱) حکومت کرتا تھا۔ قدیم بادشاہوں (مثلاً اسکندر اعظم) کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی زیر حکومت دنیا کا خاکہ تیار کرا کر اپنے پاس رکھیں۔ شاہ راجر دوم کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ دنیا کا ایک بڑا نقشہ تیار کرائے جس میں اس کی اپنی سلطنت کے حدود دکھائے گئے ہوں۔ اس کام کے لئے راجر دوم نے اپنے وقت کے جس ماہر شخص کا انتخاب کیا وہ ایک مسلمان جغرافیہ داں الادریسی تھا۔ اسی مغربی بادشاہ کی خواہش پر الادریسی نے جغرافیہ کے بارے میں اپنی مشہور کتاب تیار کی جس میں جغرافی معلومات کے ساتھ ۷۰ نقشے شامل تھے۔ الادریسی کی عربی کتاب کا پہلا یوروپی ترجمہ روم میں ۱۶۱۹ میں کیا گیا۔

جے۔ ایچ۔ کریمرز نے الادریسی کے مذکورہ جغرافیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاہ راجر دوم نے اپنے وقت کی معلوم دنیا کا تفصیلی خاکہ تیار کرنے کا کام ایک مسلمان عالم کے سپرد کیا، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے علم و فضل کی برتری ایک مسلّم حقیقت سمجھی جاتی تھی"۔ ہر قسم کے فنی ماہرین مسلمانوں سے لئے جاتے تھے۔

اس زمانہ میں مسلمان ساری دنیا میں علم کے میدان میں بڑھے ہوئے تھے۔ ریاضی، طب، فلسفہ، جغرافیہ، فن تعمیر، فن حرب، تاریخ اور زبان و ادب ہر چیز میں وہ دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ اس واقعہ کی ایک شہادت وہ ہے جو زبان کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ یورپ کی زبانوں میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے۔

مسلمان پچھلے تقریباً ہزار سال تک دنیا کے قائد بنے ہوئے تھے۔ مگر یہ مقام ان کو مطالبہ اور احتجاج کی سیاست سے نہیں ملا تھا اور نہ کوڑے اور پھانسی کی سزاؤں کو جاری کر کے وہ اس بلندی تک پہنچ گئے تھے۔ اس کا راز تھا اہلیت۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ دنیا کو دینے والے بن گئے تھے نہ کہ صرف لینے والے۔

تاریخ سبق دیتی ہے

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ (۶۱۷ ھ) اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ حملہ عین اس زمانہ میں ہوا جب کہ مسلمانوں نے یورپ کی صلیبی اقوام پر فتح (۵۸۷ ھ) حاصل کی تھی اور شاہ مصر صلاح الدین ایوبی کے تحت اپنی فوجی برتری کی شاندار روایات قائم کی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ ھ) کے صرف ۲۵ سال بعد تاتاری قبائل کو کیسے یہ جرأت ہوئی کہ وہ مسلم سلطنت پر حملہ کر دیں۔

اس کا راز مسلمانوں کا آپس کا اختلاف تھا۔ اس زمانہ میں بغداد میں خلیفہ ناصر لدین اللہ کی حکومت تھی۔ خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ خوارزم شاہ اگرچہ ایک آزاد حکمراں تھا۔ تاہم آئینی طور پر وہ خلیفہ بغداد کے ماتحت تھا اور اس کے ملک میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے ذہن میں بغاوت کے خیالات پیدا ہوئے۔ اس نے ۶۱۵ ھ میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھنا بند کر دیا اور اپنی سلطنت کو دریائے دجلہ تک وسیع کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔

خلیفہ ناصر لدین اللہ اس پر برہم ہو گیا۔ وہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنے کے موقف میں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ہوشیاری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ہم عصر مورخ کامل بن اثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یہ تدبیر کی کہ چین کی سرحد پر بسنے والے تاتاریوں کو خوارزم شاہ کے خلاف اکسا دیا۔ یہ وحشی قبائل چنگیز خاں کی قیادت میں اپنے علاقے سے نکلے اور خوارزم شاہ کی سلطنت (خراسان) میں گھس آئے۔ خوارزم شاہ نے مقابلہ میں شکست کھائی۔ وہ بھاگ کر طبرستان چلا گیا جہاں ۶۱۷ ھ میں کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔

خراسان اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد تاتاریوں کا حوصلہ بڑھا۔ اس کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھے اور خود خلیفہ ناصر لدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ تاتاریوں کو اگرچہ فوری طور پر بغداد پر قبضہ کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم سلطنت بغداد پر تاتاریوں کے مسلسل حملہ نے خلیفہ ناصر لدین اللہ کو اتنا پریشان کیا کہ اس کو سخت قسم کی پیچش ہو گئی۔ جو مدت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ خلیفہ نہایت کمزور ہو گیا اور اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ اسی اندھے پن کی حالت میں ۶۲۲ ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

دو مسلم قائدین جو ایک دوسرے کو قبر میں پہنچانا چاہتے تھے خود قبر میں پہنچ گئے۔ خوارزم شاہ خطبہ کی موقوفی کے دو سال بعد اور ناصر لدین اللہ حملہ کروانے کے چار سال بعد۔

مغربی قومیں

صلیبی لڑائیوں میں مسلمانوں نے یورپ پر فتح پائی۔ مگر اس کے بعد یورپ میں اسی طاقت سے اسلام کی اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یورپی قوموں میں صلیبی جنگوں (کروسیڈس) کی تلخ یاد ہے صلیبی لڑائیوں میں یورپ کو اسلامی دنیا کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یوروپی قوموں کے اندر اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب پیدا ہو گیا۔ یہی صلیبی نفرت ہے جو یورپ میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی اشاعت میں مانع رہی۔

تاہم پچھلی صدیوں میں جب یورپ نو آبادیاتی طاقت بن کر ابھرا تو وہاں کی فضا بدل گئی۔ اب یورپ نے صلیبی شکست کا بدلہ مسلمانوں سے لے لیا تھا۔ کیونکہ مسلم دنیا کے بڑے حصہ پر یورپی قوموں کا براہ راست یا بالواسطہ اقتدار قائم ہو گیا۔

مفتوح کے اندر فریق ثانی کے لئے نفرت کے جذبات ہوتے ہیں۔ اس لئے مفتوح فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس فاتح کی نفسیات میں بے نیازی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے میں کوئی نفسیاتی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جب نو آبادیاتی دور آیا تو یورپ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے زبردست امکانات پیدا ہو گئے۔ "مفتوح" یورپ میں اسلام کی اشاعت مشکل تھی، مگر "فاتح" یورپ میں اسلام کی اشاعت اتنی ہی آسان ہو چکی تھی۔

مگر اب یہاں ایک اور نفرت رکاوٹ بن گئی۔ پہلے جو چیز یورپی قوموں کی طرف سے تھی وہی چیز اب خود مسلم قوموں کی طرف سے پیدا ہو گئی۔ نو آبادیاتی دور میں چونکہ یورپ نے مسلم قوموں کو سیاسی اور تہذیبی شکست دی تھی، اس لئے مسلمانوں کے اندر یورپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ یورپی قوموں کو مادی رقیب اور قومی حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے ان کو نفرت کی نظر سے دیکھا نہ کہ ہمدردی کی نظر سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نو آبادیاتی دور میں بھی یورپ کو خدا کے دین کا مخاطب نہ بنا سکے۔ مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ماضی میں ایک سبب سے قائم نہ ہو سکا اور حال میں دوسرے سبب سے

جب یہ نوبت آجائے

انگلستان کا بادشاہ رچرڈ اول (۱۱۹۹ – ۱۱۵۷) جس نے تیسری صلیبی جنگ لڑی، وہ ایک بڑی فوج لے کر شاہ مصر صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳-۱۱۳۷) کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ رچرڈ کی فوج کے افسانے اس طرح مشہور ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کی فوج میں پست ہمتی کے آثار پیدا ہو گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے دو خاص جاسوسوں کو طلب کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور رچرڈ کی فوج کے حالات معلوم کریں۔ جاسوس بھیس بدل کر روانہ ہوئے اور عیسائی فوج میں داخل ہو گئے۔ ایک رات اور ایک دن انھوں نے اِدھر اُدھر پھر کر عیسائی فوج کا جائزہ لیا۔ واپس آکر انھوں نے صلاح الدین ایوبی کو خبر دی کہ ہم نے عیسائی لشکر کے خیموں میں دو باتیں خاص طور پر دیکھیں۔ ایک یہ کہ ان کے فوجی شراب وکباب میں مست ہیں اور رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ فوج کے ساتھ جو پادری آئے ہیں وہ مذہبی بحثوں میں مشغول ہیں۔ ہم نے ان کو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے پایا کہ حضرت عیسیٰ کا پیشاب پاخانہ پاک تھا یا ناپاک۔

صلاح الدین ایوبی نے یہ روداد سننے کے بعد اپنے فوجی افسروں کو بلایا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم عیسائی فوج رسوا ہو کر رہے گی۔ جس قوم کا یہ حال ہو کہ اس کے خواص عیش وعشرت میں غرق ہوں اور اس کا مذہبی طبقہ اپنے پیشواؤں کی فضیلت پر بحث مباحثہ میں مشغول ہو، خدا کے یہاں اس کا یہی انجام مقدر ہے۔ تم خدا کے بھروسہ پر آگے بڑھو۔ یقیناً تم ہی کامیاب ہو گے۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں اس کی فوج آگے بڑھی اور عیسائی فوج کو ایسی سخت شکست دی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کسی قوم کے کمزور اور زوال یافتہ ہونے کی یہ خاص پہچان ہے کہ اس کے مذہبی رہنما فضول قسم کی مذہبی بحثوں میں مشغول ہوں اور اس کے دنیوی رہنما فضول قسم کی عیاشیوں میں۔ فضول قسم کی مذہبی بحثیں اس بات کی علامت ہیں کہ آدمی کا رشتہ معنوی حقیقتوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے پاس مذہب کا خول باقی رہ گیا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ پھر جو لوگ الفاظ کی دنیا میں جی رہے ہوں وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی کارنامہ کس طرح دکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح قوم کے بڑوں کا فضول عیاشیوں میں مشغول ہونا اس بات کی علامت ہے کہ زندگی ان کے نزدیک خوش باشی کا نام ہے نہ کہ جدوجہد کا۔ وہ ذاتی خواہش میں جی رہے ہیں نہ کہ زندگی کے وسیع تر تقاضوں میں۔

طلسماتی مذہب ذہنی پستی پیدا کرتا ہے اور طلسماتی عیاشیاں عملی کمزوری۔ اور جن لوگوں میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں ان کو کوئی چیز تباہی سے بچا نہیں سکتی۔

دعوت سے غفلت

ترکی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں ایک قابل لحاظ تعداد عیسائیوں کی بھی ہے۔ ترکی کے سلطان سلیم نے ایک بار ارادہ کیا کہ ترکی کے تمام غیر مسلم باشندوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دے دے۔ جو لوگ اسلام قبول کرلیں وہ ترکی میں رہیں اور جو لوگ اسلام قبول نہ کریں ان کو ملک سے نکال دیا جائے۔

اس وقت ترکی کے ایک عالم مفتی جمال سامنے آئے۔ انھوں نے بادشاہ سے صاف لفظوں میں کہا کہ تمھارے لئے ایسا کرنا جائز نہیں (لا یحل لک ذلک) امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ اگر سلطان سلیم کا یہ ارادہ پورا ہوجاتا تو آج ترکی میں عیسائیوں کا وجود نہ ہوتا۔ مگر مفتی جمال نے اس قوت کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا اور اس کے حق میں ایسی دلیلیں دیں کہ سلطان سلیم کا عزم اس کے بعد ٹھنڈا ہوکر رہ گیا (تعلیقات برمقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۷۷)

اس طرح کی جرأت کی مثالیں ہماری جدید تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اسی طرح کی قوت اور اہمیت کے ساتھ کسی عالم نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کی طرف عوام یا ارباب کار کو توجہ دلائی ہو۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ ہمارے علمار کے ذہن پر فقہی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام علمار کے اندر جو مزاج بناتا ہے اس میں فقہی امور تو پوری شدت کے ساتھ ان کے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ مگر دعوتی امور ان کے ذہن کے خانہ میں جگہ نہیں پاتے۔

ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد فقہ پر ہے نہ کہ دعوت پر۔ اس کا نصاب اور اس کا نظام تمام تر فقہی ضروریات و مسائل کے اعتبار سے بنا ہے۔ دعوتی مسائل و ضروریات کی اس میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ ایسی حالت میں یہی ممکن ہے کہ فقہی امور کے بارے میں لوگ بے حد حساس ہوں مگر دعوتی امور کے بارے میں ان کے اندر حساسیت نہ پائی جائے۔

مفتی جمال نے سلطان ترکی سے جو بات کہی وہ بجائے خود بالکل صحیح تھی۔ لیکن اگر ان کے اندر دعوتی ذہن ہوتا تو سلطان سے وہ یہ کہتے کہ دوسری قوموں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں لانا عین مطلوب ہے اور اس اعتبار سے تمھارا جذبہ قابل قدر ہے۔ مگر یہ کام تم کو تبلیغ و دعوت کے ذریعہ کرنا چاہئے نہ کہ جبر و قوت کے ذریعہ۔

تاریخ کا فتنہ

سأل ابوزرعة شيخه البلقيني قائلا : ما تقصير الشيخ تقي الدين السبكي عن الاجتهاد وقد استكمل آلته. فسكت البلقيني. فقال ابوزرعة : فما عندي ان الامتناع عن ذلك الا للوظائف التي قدرت للفقهاء على المذاهب الاربعة وان من خرج عن ذلك لم ينله شيئ من ذلك وحرم ولاية القضاء وامتنع الناس عن افتائه ونسبت اليه البدعة فابتسم البلقيني ووافقه على ذلك (السيد سابق، فقہ السنۃ، المجلد الاول، صفحہ ۱۴-۱۳)

ابوزرعہ نے اپنے استاد بلقینی سے پوچھا کہ شیخ تقی الدین سبکی اجتہاد کیوں نہیں کرتے جب کہ ان کے اندر اس کی شرائط موجود ہیں۔ بلقینی چپ رہے۔ ابوزرعہ نے کہا کہ ان کے اجتہاد سے رکنے کی وجہ میرے نزدیک تو صرف وہ وظائف ہیں جو مذاہب اربعہ کے فقہاء کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ جو ان مذاہب سے نکلے گا وہ ان وظائف میں سے کچھ نہیں پا سکتا، وہ قاضی کے عہدہ پر باقی نہ رہے گا، لوگ اس کے فتوے کو قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کو بدعتی کہنے لگیں گے۔ یہ سن کر بلقینی ہنسے اور ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

دین کے نام پر جو چیز شروع کی جائے، اگر وہ ایک مدت تک باقی رہے تو بالآخر وہ مقدس سمجھی جانے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نوبت آتی ہے کہ اس کے ساتھ دنیوی قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے منسوب ہو کر آدمی کو ماحول میں عزت ملتی ہے، اس سے وابستگی سے آدمی کے لئے عہدوں اور مفادات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے نام پر "آج" کے ایک آدمی کو وہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو "کل" کے ایک آدمی کو تاریخی روایات کے نتیجہ میں حاصل ہو چکی ہے۔

ایسے ماحول میں لوگ اس حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس کے ساتھ تاریخی شخصیت کا نام شامل نہ ہو۔ وہ "تاریخ" کے پرستار بن کر رہ جاتے ہیں، حق کے پرستار کی حیثیت سے ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

لوگ ہمیشہ زندہ شخصیت کو نظر انداز کرتے ہیں اور تاریخی طور پر مسلّمہ شخصیت کے ساتھ خوب تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلّمہ شخصیتوں کے ساتھ مادی مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں، جب کہ زندہ شخصیت کے ساتھ اس قسم کا کوئی پہلو وابستہ نہیں ہوتا۔

عہدہ نہ ملنے پر

امام شافعی ۱۹۸ھ میں مصر آئے اور وہاں چار سال قیام کیا۔ اس زمانہ میں جو لوگ ان کے شاگرد ہوئے ان میں یوسف بن یحییٰ بویطی اور ابن عبد الحکم بھی تھے۔ امام شافعی کے انتقال کے بعد یہ سوال ہوا کہ مصر میں ان کے حلقہ درس کا مسند نشین اور ان کا قائم مقام کون ہو۔ امام شافعی اپنے تمام شاگردوں میں یوسف بن یحییٰ بویطی کو زیادہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد بھی کر چکے تھے۔ تاہم امام شافعی کے انتقال کے بعد جب یوسف بن یحییٰ بویطی نے امام شافعی کی مسند پر بیٹھنا چاہا تو ابن عبد الحکم نے دعویٰ کر دیا کہ اس مسند کا زیادہ حق دار میں ہوں۔

اس وقت مصر میں امام شافعی کے مکی شاگرد امام حُمیدی موجود تھے۔ انھوں نے بویطی کے حق میں فیصلہ دیا۔ امام حمیدی نے کہا: امام شافعی نے مجھ سے کہا تھا کہ میری مجلس کا حق دار بویطی سے زیادہ کوئی نہیں اور نہ میرے ساتھیوں میں بویطی سے زیادہ کوئی صاحب علم ہے۔ ابن عبد الحکم نے یہ سن کر امام حمیدی سے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ امام حمیدی نے جواب دیا: جھوٹ بات تم نے کہی، تمھارے باپ نے کہی، تمھاری ماں نے کہی (کذبت انت وابوک وامک)

ابن عبد الحکم اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے باپ کے مسلک کے مطابق مالکی مسلک رکھتے تھے۔ پھر شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس واقعہ کا اثر ان کے اوپر اتنا زیادہ ہوا کہ انھوں نے شافعی مسلک چھوڑ دیا اور دوبارہ مالکی مسلک اختیار کر لیا (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

ابن عبد الحکم یہ چاہتے تھے کہ شافعی مسلک کی مسند درس پر بیٹھیں۔ مگر جب ان کو درس کی مسند نہ ملی تو انھوں نے خود اپنے لئے بھی اس مسلک کو پسند نہ کیا جس کے لئے وہ دوسروں کے سامنے نمائندہ بننے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہی اکثر لوگوں کا حال ہے۔ وہ اسلام یا کسی ادارہ کے حامی بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر حقیقۃً ان کی ساری دل چسپی اس اسلام یا اس اسلامی ادارہ سے ہوتی ہے جو انھیں ایک شان دار اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع دے، جو ان کے لئے عوام کے درمیان ایک امتیازی مسند فراہم کر رہا ہو۔ اگر شاندار اسٹیج نہ ملے تو ایسے اسلام کی خدمت کرنے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ ایک شخص صدارت کی کرسی سے یہ تقریر کرتا ہوا سنائی دے گا کہ اس عظیم مقصد کے لئے چپراسی کی حیثیت سے خدمت کرنا بھی میں اپنے لئے فخر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر وہ اپنے کو صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہوا نہ پائے تو اس وقت اس مقصد کے میدان میں اس کے لئے کرنے کا کوئی کام نہ ہوگا۔ اسلام کی صدارت کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے مگر اسلام کی خدمت کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

آدمی بدل جاتا ہے

عبد الملک بن مروان ایک اموی خلیفہ تھا، خلیفہ بننے سے پہلے عبد الملک کا شمار بڑے فقہا میں ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر مسجد میں رہتا اور عبادت اور دینی مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ حتی کہ لوگ اس کو حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) کہنے لگے تھے۔ ۶۵ھ میں جب اس کے باپ مروان بن الحکم کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ مسجد میں قرآن پڑھ رہا تھا۔ محل کا آدمی اس کے پاس خبر لے کر گیا اور کہا کہ آج سے آپ امیر المومنین ہیں۔ عبد الملک نے یہ سنا تو فوراً قرآن کو بند کر کے طاق پر رکھ دیا اور کہا:

هٰذا فراق بيني و بينك — آج سے میرے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔

خلافت کے تخت پر بیٹھنے کے بعد عبد الملک بالکل دوسرا انسان بن گیا۔ اب اس کا سارا وقت دنیا کی چیزوں میں گزرنے لگا۔ یہی وہ اموی خلیفہ ہے جس نے حجاج بن یوسف جیسے ظالم کو گورنر بنا کر اس کو لوگوں کے اوپر مسلط کیا۔ اس نے عبد اللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر اور دوسرے بے شمار لوگوں کو قتل کرایا۔ اس نے اپنے سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لئے کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے، وغیرہ

عبد الملک نے ایک روز سعید بن مسیب سے کہا "سعید اب میرا یہ حال ہے کہ جب میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو میرے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوتی اور جب کوئی برائی کرتا ہوں تو اس کا مجھے کوئی رنج نہیں ہوتا۔ سعید بن مسیب نے جواب دیا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تمھارا دل پوری طرح مر چکا ہے۔

یہی ہر اس آدمی کا حال ہوتا ہے جو اوپری سطح پر دین دار نظر آتا ہو مگر وہ اپنی پوری ہستی کے ساتھ دین دار نہ بنا ہو۔ ایسے آدمی کو جب کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اچانک اس کا ظاہری لبادہ اتر جاتا ہے اور اندر کا واقعی انسان ننگا ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ایک شخص بظاہر دین دار ہے مگر کوئی بڑائی ملتے ہی اس کی دین داری ختم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص بہت شریف بنا ہوا ہے لیکن اگر کسی سے اس کو شکایت ہو جائے تو اس کے لئے وہ اچانک ایک ظالم انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص مسکینی کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہ رہا ہے لیکن اگر اس کو دولت مل جائے تو اس کے بعد وہ ایک متکبر انسان کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص لکھنے اور بولنے میں انصاف کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آجائے جس میں اس کو اختیار حاصل ہو تو وہ ایسے پہلو کی طرف جھک جائے گا جو اس کی ذاتی دلچسپی کا ہو۔ وہ انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے کے بجائے اپنے مفاد کے مطابق فیصلہ کرے گا، وغیرہ۔

محل سے کھنڈر

اندلس کے مسلم حکمرانوں میں سلطان عبدالرحمٰن ثالث بہت مشہور ہے۔ وہ ۳۰۰ ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور ۳۵۰ ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کی ایک عیسائی بیوی تھی جس کا نام زہرا تھا۔ سلطان نے اپنی اس بیوی کے نام پر قرطبہ کے کنارے ایک شاندار محل تعمیر کیا اور اس کا نام الزہرار رکھا۔ چار میل لمبا اور تین میل چوڑا یہ محل اتنا بڑا تھا کہ اس کو قصر الزہرار کے بجائے مدینۃ الزہرار کہنے لگے۔ اس محل کی تعمیر ۳۲۵ ھ میں شروع ہوئی اور پچیس سال میں ۳۵۰ ھ میں مکمل ہوئی۔ المقری نے اس محل کی جو تفصیلات لکھی ہیں اس کے لحاظ سے یہ محل الف لیلہ کا کوئی طلسماتی شہر معلوم ہوتا ہے۔

اس محل کے بنانے پر دس ہزار معمار، چار ہزار اونٹ اور خچر روزانہ کام کرتے تھے۔ اس میں ۴۳۱۶ برج اور ستون تھے۔ سنگ مرمر اور دوسرے بہت سے قیمتی سامان فرانس، ترکی، یونان، شام اور افریقہ کے ملکوں کے بادشاہوں نے بطور تحفہ دئے تھے۔ اس کی چھتوں میں سونے چاندی کا کام اس کثرت سے کیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھ جھپکتی تھی۔ اس محل کے انتظام اور نگرانی کے لئے ۱۳۷۵۰ ملازم مقرر تھے۔ اس کے علاوہ ۱۳۳۸۲ غلام تھے۔ حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لئے حاضر رہا کرتی تھیں۔ سارا قصر باغات اور فواروں سے گلزار رہتا تھا۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کے سیاح کثرت سے اس کو دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے۔

مگر اس عظیم الشان محل کا انجام کیا ہوا۔ ۲۵ سال میں موجودہ معیار سے ایک کھرب روپیہ سے بھی زیادہ میں بننے والا محل صرف پچاس سال میں ختم ہو گیا۔ اندلس کے مسلم حکمرانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے عیسائیوں نے ان کے اوپر قابو پالیا اور ان کو شکست دے کر ان کے نام ونشان تک کو مٹا ڈالا، قرطبہ کا الزہرار کھنڈر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس پر زمانہ کی گرد پڑتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں اس مقام کی کھدائی کی گئی ہے۔ مگر کھدائی کرنے والوں کو وہاں ٹوٹی ہوئی نالیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

دنیا میں عیش وآرام کے نشانات کو مٹا کر خدا دکھاتا ہے کہ اس کی نظر میں یہاں کے عیش وآرام کی کوئی قیمت نہیں، مگر کوئی آدمی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر بعد والا عین اسی مقام پر اپنا عیش خانہ بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے جہاں اس کے پیش رو کا عیش خانہ برباد ہوا تھا۔

منفی سیاست مہنگی پڑی

موجودہ زمانہ میں اسپین کے مورخین اسپین کے اسلامی دور کا ذکر بے حد نفرت کے ساتھ کرتے ہیں، اسپین کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ماہر لکھتا ہے "اگر اسلام نہ ہوتا تو اسپین بھی فرانس، جرمنی، اٹلی اور انگلینڈ کی طرح ترقی کا راستہ اختیار کرتا، بلکہ وہ یورپ کا رہنما بن جاتا۔ مگر اسلام نے آئبیریا (اسپین اور پرتگال) کی تقدیر کو بگاڑ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کو اسلام نے بے اندازہ فائدہ پہنچایا، مگر اسپین کو اس نے انسانی ترقی کے قافلہ سے پیچھے کر دیا"

جو اسلام بقیہ یورپ کے لئے رحمت ثابت ہوا وہی اسلام اسپین کے لئے نقصان وہ کیسے بن سکتا تھا۔ یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری خود اسپین پر تھی نہ کہ اسلام پر۔ چنانچہ پروفیسر جے۔ بی ٹرینڈ نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ اسپین کی منفی سیاست تھی۔ مسلمانوں کی فتح اسپین (۷۱۱) کے بعد یہ ہوا کہ اٹلانٹک سے لے کر بحر روم تک سارے شمالی اسپین میں جگہ جگہ "مسلم حملہ آوروں" کی مخالفت کے مرکز قائم ہو گئے۔ بیشتر لوگوں کا مشغلہ بس جنگ وجدال بن کر رہ گیا۔ تمام مردان کار نے فوجی وعسکری زندگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی علمی اور اقتصادی سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ گئیں۔

اسپین والوں کی مسلم مخالف سرگرمیاں صدیوں کے بعد سولھویں صدی میں اپنی کامیابی کو پہنچیں۔ انھوں نے اسپین کے تمام مسلمانوں کو یا تو مار ڈالا یا ملک سے باہر نکال دیا۔ مگر یہ شان دار کامیابی ان کو صرف اس قیمت پر حاصل ہوئی کہ ملک اپنے تمام ہنرمند کاریگروں اور لاکھوں زرعی کارکنوں سے محروم ہو کر رہ گیا۔ اس خلا کے بعد اسپین کا زوال بالکل لازمی اور ناگزیر تھا۔

مزید یہ کہ اسلام جب ایک خطرناک ہمسایہ کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہ رہا تو ان کی صدیوں کی تربیت یافتہ جنگ جوئی نے باہمی اختلاف اور لڑائی کی صورت میں اس کا استعمال پا لیا۔ اسپین کی مسیحی ریاستیں مسلم نشانہ کو نہ پاکر آپس کے جنگ وپیکار میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی انقطاع پسندی نے ان کے درمیان مختلف زبانیں اور مختلف روایتیں پیدا کر دیں۔ ابتدائی صدیاں اگر مسلمانوں کے خلاف کارروائیوں میں ضائع ہوئی تھیں تو بعد کا زمانہ خود اپنوں کے خلاف ہنگامہ کرنے میں برباد ہو گیا (لیگیسی آف اسلام، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن)

موت کے وقت

عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور سفر میں تھا کہ سخت بیمار پڑا اور راستہ میں ہی ۱۵۸ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ فقرہ تھا: بادشاہ وہ ہے جو نہ مرے۔

یزید بن معاویہ کے بعد معاویہ بن یزید بن معاویہ کو خلیفہ بنایا گیا۔ بہت تھوڑی مدت میں ۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا "اپنے خاندان میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دیجئے" اس کے جواب میں انھوں نے کہا "میں نے خلافت سے نہ زندگی میں فائدہ اٹھایا ہے اور نہ مرنے کے بعد اس کا بوجھ اٹھاؤں گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بنوامیہ اس کی شیرینی لیں اور میرے حصہ میں اس کی تلخی آئے۔

مامون الرشید بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ ۲۱۸ھ میں جب وہ مرنے لگا تو آخری جملہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا ——— اے وہ جس کی سلطنت کبھی زائل نہ ہوگی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔ اے وہ جو کبھی نہیں مرے گا، اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔

خلیفہ واثق باللہ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے حکم دیا کہ فرش اٹھا دیا جائے۔ جب فرش ہٹا دیا گیا تو اس نے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا اور کہا: اے وہ جس کی بادشاہی لازوال ہے، اس پر رحم کر جس کی بادشاہی ختم ہوگئی"۔ یہ کہتے ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

خلیفہ معتضد باللہ عباسی کا انتقال ۲۸۹ھ میں ہوا۔ اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے چند عربی شعر پڑھے جن کا مطلب یہ ہے: میں نے بڑے بڑے بہادر مارے، میں نے کوئی دشمن نہ چھوڑا۔ کسی کو بھی میں نے سرکشی پر باقی رہنے نہ دیا۔ میں نے دارالسلطنت کو تمام مخالفوں سے خالی کر دیا۔ ان کو پراگندہ کرکے انھیں مشرق و مغرب میں پھیلا دیا۔ لیکن جب میں اپنی عزت و بلندی میں ستاروں تک پہنچ گیا اور تمام مخلوق کی گردنوں میں میری غلامی کا طوق پڑ گیا تو ایسا ہوا کہ موت نے مجھ پر ایک تیر چلایا اور میری آگ کو بجھا دیا۔ دیکھ لو، اب میں جلد ہی اپنے گڑھے میں ڈالا جانے والا ہوں۔

حجاج بن یوسف نے گورنر بننے کے بعد عراق میں خطبہ دیا: گردنیں اونچی ہو رہی ہیں۔ سروں کی فصل پک چکی ہے اور کٹائی کا وقت آگیا ہے۔ میری نظریں وہ خون دیکھ رہی ہیں جو پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہہ رہا ہے"۔ یزید کے بعد بنوامیہ کی حکومت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لئے اس نے لاکھوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو بے حد سخت تکلیف تھی۔ ابومنذر یعلی نے لوگوں کی طرف سے اس پر لعنت کرتے ہوئے کہا کہ تو اس قوم کا فرعون تھا، آج تیرے لئے نہ نجات ہے اور نہ فریاد۔ حجاج یہ سن کر بری طرح رو پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور کہا: الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔ آہ میری ہلاکت، آہ میری ہلاکت، اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا۔

غلط استدلال

وکیع بن الجراح (۱۹۷-۱۲۹ھ) اپنے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے۔ وہ نہایت متقی انسان تھے چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی کا عہدہ پیش کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی تمام عمر حدیث کی جمع و تدوین میں گزار دی۔ وہ اپنے وطن کوفہ سے حج کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے تھے کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وکیع بن الجراح کے ایک معاصر نے (تعریفی طور پر) ان کے بارے میں کہا کہ میں نے وکیع کو دیکھا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ وہ حدیثوں کے حافظ تھے (ما رأیت وکیعا ومارأیت بیدہ کتابا قط، انما ھو یحفظ، التہذیب لابن حجر، جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۹)

گولڈ زیہر نے اس قول کو لے کر لکھا ہے کہ وکیع نے کتاب اور کاغذ چھوڑ رکھا تھا، وہ صرف زبانی طور پر حدیث سنتے اور سناتے تھے۔ گولڈ زیہر کا مقصد اس سے حدیث کی صحت کو مشکوک ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تحریر کے مقابلہ میں یادداشت بہر حال ایک غیر معتبر ذریعہ ہے۔

مگر گولڈ زیہر کا یہ استدلال اس وقت غلط معلوم ہوتا ہے جب کہ ہم اسی کتاب میں یہ دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: تمھارے لئے لازم ہے کہ تم وکیع کی کتابوں کو پڑھو (علیکم بمصنفات وکیع، التہذیب لابن حجر جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۶) اگر ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو احمد بن حنبل اس طرح کا مشورہ کیوں دیتے۔ امام وکیع کی کتابوں میں سے چند کتابیں یہ ہیں:

کتاب الزہد

المصنف

التفسیر (الکشف والبیان للثعلبی)

وکیع بن الجراح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ وہ اگرچہ احادیث کو باقاعدہ لکھتے تھے۔ مگر مجالس میں اکثر حافظہ کی مدد سے احادیث کو بیان کرتے تھے۔ امام وکیع سے متعلق تمام واقعات کو دیکھئے تو مذکورہ قول میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مگر گولڈ زیہر نے بقیہ چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک جزء کو لے لیا تو وہ اس کے لئے اس بات کی دلیل بن گیا کہ حدیث کا موجودہ ذخیرہ مشتبہ ذخیرہ ہے، اس کی صحت پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

عقل کی آنکھ سے

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں قاضی ابویوسف کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ علی بن جعد کہتے ہیں کہ امام ابویوسف نے مجھ کو بتایا۔ میرے باپ ابراہیم بن حبیب کا انتقال ہوگیا۔ میری ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں خدمت کے لئے رکھ دیا۔ میں اکثر دھوبی کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ کے حلقہ درس میں چلا جاتا اور وہاں حدیث اور فقہ کا علم حاصل کرتا۔ میری ماں کو معلوم ہوتا تو وہ آتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ دھوبی کے یہاں پہنچا دیتی۔ جب ایسا قصہ بار بار ہونے لگا تو میری ماں پر شاق گزرا اس نے امام ابوحنیفہ سے کہا: اس لڑکے کا بگاڑ صرف تم ہو۔ یہ ایک یتیم لڑکا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ میں چرخہ کات کر اس کو کھلاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ وہ بھی کچھ کمانے لگے۔ امام ابوحنیفہ نے میری ماں سے کہا: وہ پستہ کا فالودہ کھانے والا علم حاصل کر رہا ہے۔ میری ماں یہ کہتی ہوئی واپس چلی گئی: معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے تمھاری عقل جاتی رہی ہے۔

امام ابویوسف کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے میری مالی مدد کی اور میں ان کے حلقہ درس سے برابر علم حاصل کرتا رہا ــــ یہاں تک کہ میں اس قابل ہوگیا کہ عباسی حکومت نے مجھ کو قاضی کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اب میں خلیفہ ہارون رشید کی مجلس میں بیٹھنے لگا۔ میں اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتا۔ ایک روز دسترخوان پر ہارون رشید کے لئے فالودہ آیا۔ ہارون رشید نے کہا اس کو کھاؤ۔ میں نے پوچھا: اے امیرالمومنین یہ کیا چیز ہے۔ ہارون رشید نے کہا: یہ پستہ کا فالودہ ہے۔ یہ سن کر مجھ کو ہنسی آگئی۔ ہارون رشید نے پوچھا کہ تم کیوں ہنسے۔ پھر میں نے مذکورہ قصہ شروع سے آخر تک بتایا۔ ہارون رشید یہ سن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے کہا: میری زندگی کی قسم، علم آدمی کو بلند کرتا ہے اور دین اور دنیا میں اس کو نفع دیتا ہے۔ اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے، وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ چیز دیکھ لیتے تھے جس کو وہ اپنے سر کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے (کان ینظر بعین عقلہ مالا یراہ بعین رأسہ) انسان کے چہرہ پر اللہ نے دو خوبصورت آنکھیں دی ہیں جن سے وہ تمام چیزوں کو دیکھتا ہے۔ مگر ان آنکھوں سے جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف ظاہری چیزیں ہیں۔ زیادہ گہری اور زیادہ بامعنی چیزیں دیکھنے کے لئے ایک اور آنکھ کی ضرورت ہے۔ یہ بصیرت یا عقل کی آنکھ ہے۔ جو شخص صرف سر کی آنکھ رکھتا ہو اس کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مشین کے اوپر کا ڈھکن دیکھے مگر اندر کے کل پرزوں سے بے خبر رہے، ایسا دیکھنا، نہ دیکھنے سے بس برائے نام ہی مختلف ہے۔ بڑھیا کی ظاہری آنکھ نوجوان کا مستقبل صرف دھوبی کے خدمت گار کی صورت میں دیکھتی تھی مگر اسی نوجوان کو جب ایک عقل کی آنکھ والے نے دیکھا تو وہ اس کو بادشاہ کے دسترخوان پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔

عقل کی آنکھ آدمی کو کس طرح حاصل ہوتی ہے، اس کا ایک ہی جواب ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ سر کی آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں سے اوپر اٹھ جائے۔ معنوی حقیقتیں ظاہری حقیقتوں سے پرے ہیں، اس لئے معنوی حقیقتوں کو وہی شخص پاتا ہے جو ظاہری حقیقتوں سے گزر جائے ــــــ سامنے کی چیزوں سے نظر ہٹانے کے بعد ہی دور کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح گہری باتوں کو آدمی اس وقت پاتا ہے جب کہ وہ اوپری باتوں سے بلند ہو جائے۔ چیزوں کے ظاہری روپ میں گم رہنے والا کبھی چیزوں کو ان کے اندرونی روپ میں نہیں دیکھ سکتا۔

ماضی اور حال

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان اپنے ملک سے نکل کر ۱۲۱۷ء میں اسپین آیا۔ اس کا نام مائیکل (Michael) تھا۔ اس کا مقصد طلیطلہ اور قرطبہ کے عرب علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ لاتینی یورپ کو ارسطو سے واقف کرائے۔ یونانی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ اصل یونانی متن سے اس کا ترجمہ نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا لاتینی ترجمہ عربی ترجمہ کی مدد سے کیا۔ اسپین کے قیام کے دوران وہ عربی زبان بخوبی سیکھ چکا تھا۔

۱۲۲۴ء میں سلرنو (سسلی) میں پہلا طبی کالج کھولا گیا۔ اس طبی کالج کے نصاب کے لئے ڈنمارک کے ہنڈرک (Hendrink Harpestraeng) نے سات جلدوں میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب بھی اسٹاک ہام کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہنڈرک کا ماخذ بھی مذکورہ مائیکل کا وہی ترجمہ تھا جو اس نے الرازی اور ابن سینا کی طبی کتابوں کا عربی سے لاتینی زبان میں کیا تھا۔

جارج سارٹن (George Sarton) نے پانچ جلدوں میں سائنس کی تاریخ (History of Science) لکھی ہے۔ اس نے سائنس کی تاریخ کو چند ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ اس کی تقسیم کے مطابق ہر دور نصف صدی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر نصف صدی کے دور کو وہ ایک مرکزی شخصیت سے متعلق قرار دیتا ہے۔ اس طرح ۴۵۰ تا ۴۰۰ قبل مسیح کو سارٹن افلاطون کا دور قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار کو وہ ارسطو، اقلیدس اور ارشمیدس کا دور کہتا ہے، وغیرہ۔ پھر ۶۰۰ سے لے کر ۷۰۰ء تک کے زمانہ کو اس نے چینی علمار کا دور قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ۷۵۰ سے لے کر ۱۱۰۰ء تک اس کی تقسیم کے مطابق مسلسل جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، بیرونی، ابن سینا، ابن الہیثم اور عمر خیام کا دور ہے۔ یہ سب کے سب عرب، ترک، افغانی اور ایرانی مسلمان تھے۔ سارٹن کے نزدیک تاریخ سائنس میں ساڑھے تین سو سال تک بلا انقطاع صرف مسلم سائنس دانوں کا دور رہا ہے۔ جارج سارٹن کی تقسیم کے مطابق ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار مغربی اشخاص کا نام سائنس کی دنیا میں آنا شروع ہوتا ہے۔ مثلاً گیرارڈ، راجر بیکن۔ تاہم اس کے بعد بھی ۲۵۰ سال تک ابن رشد، نصیرالدین طوسی اور ابن نفیس کا ذہنی غلبہ یورپ پر قائم رہا۔ ابن نفیس وہ شخص ہے جس نے پہلی بار جسم کے اندر دوران خون کا امکان ظاہر کیا تھا، بعد کو ہاروے نے اسے دریافت کیا۔ اس طرح گویا سائنس کی تاریخ میں مسلسل چھ سو سال ایسے ہیں جب کہ مسلمانوں کو دنیا کی علمی قیادت حاصل رہی ہے۔

۱۳۵۰ کے بعد مسلم دنیا نے اپنا علمی برتری کا مقام کھو دیا۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ کے سمرقند کے

دربار میں ۱۷۳۴ء میں اور مغل شہنشاہ دہلی کے دربار میں ۱۷۲۰ء میں کچھ علمی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ مگر مسلم دنیا کا علمی زوال بدستور جاری رہا۔ اس کے لئے دوبارہ اپنے ماضی کی طرف واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ موجودہ زمانہ میں تاریخ کے پہیہ نے الٹے رخ پر سفر شروع کیا ہے۔ پہلے مغرب کے لوگ مسلم دنیا میں علم سیکھنے کے لئے آتے تھے ، اب مسلمان علم سیکھنے کے لئے مغربی دنیا میں جا رہے ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں مسلمان مغرب کے تہذیبی مقلد تو بنے ہیں، وہ ان کے علمی ہم سرابھی تک نہ ہوسکے۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ کو یونسکو کے زیر انتظام بنگلہ دیش کے اجتماع میں تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا۔ کسی مغربی سائنس داں سے گفتگو کے دوران انھوں نے شکایت کی کہ مغربی ممالک مسلم ممالک کی سائنسی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے کافی مدد نہیں کرتے۔ مغربی سائنسداں نے اس کے جواب میں کہا: سلام، کیا واقعۃً تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان قوموں کو سنبھالیں۔ ان کو مدد دیں، انھیں زندہ رکھیں جنھوں نے انسان کے علمی خزانہ میں ایک ذرہ برابر بھی کوئی تخلیق یا اضافہ نہیں کیا ہے:

> Salam, do you really think we have an obligation to succour, aid and keep alive those nations, who have never created or added an iota to man's stock of knowledge.

ڈاکٹر عبدالسلام اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے دل کو اس وقت شدید جھٹکا لگتا ہے جب میں جدید طرز کے ایک اسپتال میں داخل ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ پنسلین سے لے کر زندگی کو بچانے والے دوسرے طبی سامان جو وہاں ہیں ان میں سے کسی چیز کی دریافت یا ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہم کسی طرح یہ امید نہیں کرسکتے کہ دوسروں کی مدد میں جدید دنیا کی ترقی یافتہ قوم بن سکتی ہے۔ جو قوم دنیا کو کچھ نہ دے رہی ہو اس کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ دنیا اسے کوئی چیز دے گی۔

مسلم قوموں کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود اپنی کوشش سے آگے بڑھیں۔ عربوں کی بے پناہ دولت بھی اس معاملہ میں ذاتی کوشش کا بدل نہیں بن سکتی۔ آج مسلم ممالک بڑے پیمانہ پر مشینیں اور ہتھیار مغربی ممالک سے درآمد کر رہے ہیں مگر اس قسم کی مشینی درآمدات کے اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے فنی بنیاد (Technical Base) کی ضرورت ہے اور وہ کسی مسلم ملک کے پاس موجود نہیں۔ ایک سائنس داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ تمام بنیادی علوم ایک دوسرے سے متعلق علوم ہیں:

> All basic science is relevant science

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد ہی کوئی قوم ترقی کرسکتی ہے نہ کہ محض چند علوم میں۔

ماضی اور حال کا فرق

ہمارے ماضی اور ہمارے حال میں یہ فرق کیوں ہے، اس کو خود اس معاملہ کی ایک مثال سے سمجھئے

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت، تمدنی ترقی اور علوم و فنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یورپ نے طے کیا کہ اس کو عربی پڑھنی ہے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا، جو سولھویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Rennaissance) کے نام سے جانتی ہے۔ مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور ان میں اضافہ کرکے بالآخر یورپ اتنا طاقت ور ہوگیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ ساری دنیا پر چھاگیا۔

اس واقعہ کے چار سو برس بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست و تمدن اور علوم و فنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ان کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم کو حاصل کریں۔ مگر یہاں نتیجہ برعکس نکلا۔ یورپی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔

ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبہ کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس لئے بڑھے کہ ہم اس کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہوجائیں۔ اور جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام میں فرق پایا جانا لازمی ہے۔

مسلمانوں کو تقریباً ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس یا امریکہ کو حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ یورپ پر ابھی قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شان دار تہذیب کو وجود میں لا چکے تھے۔ اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفہ میں دنیا کی امامت کر رہے تھے، اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم و فنون کے اکتساب کے لئے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہنچ گئے تھے اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارھویں صدی کے آخر (۱۰۹۶) سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا۔ یہ جنگ جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی۔

مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہوگیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں اُن سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب مصری فوج نے منجنیقوں

کے ذریعہ فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنا شروع کئے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشین اژدہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی، جن کے پاس اس وقت پرانے دیسی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لئے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پس ماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعہ حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربہ کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے اب اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور اُن کے علوم کو سیکھ کر انھیں کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقہ نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کرلیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی ہے، اس کو عددی حیثیت سے کمزور کرکے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۴۵ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا وہ ایک صلیبی ہی تھا۔ بعد کو فرانسس کن (۱۲۱۹) نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ و سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درس گاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کئے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لئے جانا شروع ہوئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسس کن راہب راجر بیکن (۹۴ - ۱۲۱۴) جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ کے علماء چلا اٹھے "بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا"۔

مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین کے حاصل کو لے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کئے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مورخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہنچے

(دیسٹرن سویلزیشن، اڈورڈ میکنال برن)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم وفنون کو سیکھیں۔ مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خاں (۹۸ - ۱۸۱۷) جو پروفیسر گب کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدّت پسند تنظیم (Modernist Organization) کے بانی تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ میں علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس پر اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ میں وہ یونیورسٹی بن گیا، وہ یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

سرسید نے جب انگلستان سے واپس آکر دسمبر ۱۸۷۰ میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انھوں نے پہلے پرچہ کے شروع میں لکھا:

> "اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلادیں"

سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان" ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سرسید کی تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر "اینگلو محمڈن کلچر" کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے، وہ اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے تھے۔ ترکی میں مغربی تعلیم وتہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو وہاں دیا گیا۔ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک یہ "غرب دوغرو" تھا، جس کے معنی ترکی زبان میں ——— "سمت مغرب میں سفر" کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لئے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیئے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہوں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی انھوں نے زیادہ کوشش نہیں کی۔ سرسید نے تو صراحتہً مسلمانوں کے لئے "ٹکنیکل ایجوکیشن" کی مخالفت کی اور "اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم" کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان

حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کئے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم مقام حاصل نہ کر سکا۔

یورپ جس ذہن کے تحت ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے انھیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور ان کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے "تقلیدِ مشرق" یا "تقلیدِ مسلم" کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے۔ اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشاۃ ثانیہ (Rennaissance) رکھا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ـــــ نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے لیتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا، مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک ــ یونان ــ کی چیز قرار دے کر اس کو نشاۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا، حالاں کہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خالص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں "پیروئ مغرب" اور اتاترک کے یہاں "غرب دہ غرو" کے ہم معنی تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفیٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے ذہن کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا کھلی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہمیں وہی کرنا چاہئے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا ــ مغربی علوم کو اس لئے سیکھنا تاکہ اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لئے ہمارے مقابلہ میں ظاہر ہوا تھا۔

ترقی کا راز

ابن بطوطہ (۱۳۰۴-۱۳۷۷ء) چودھویں صدی عیسوی کا مشہور عرب سیاح ہے۔ اس کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم اللواتی ہے۔ وہ مغرب کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ اس نے تین بار دنیا کے سفر کئے جن کی مجموعی مدت ۲۹ سال ہے۔ وہ جن ملکوں میں گیا ان میں مغرب، الجزائر، تونس، مصر، شام، فلسطین، حجاز، عراق، فارس، یمن، ایشیا مائنر، ترکی، خوارزم، بخارا، افغانستان سیلان، ملایا، انڈونیشیا، ہندستان، چین، جاوا، اندلس، جبرالٹر، مشرقی و مغربی افریقہ، سودان وغیرہ شامل ہیں۔

ابن بطوطہ نے ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۲ء کے دوران تین عالمی سفر کئے۔ ان سفروں کی مجموعی مسافت تقریباً ۷۵۰۰۰ میل ہے۔ ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۸ء) ابن بطوطہ کا ہم زمانہ تھا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں مختصر طور پر ابن بطوطہ کا ذکر کیا ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفر کے حالات پر کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار۔ تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق یہ اہم کتاب آج اپنے موضوع پر انتہائی مشہور کتاب بن چکی ہے۔ تاہم ابتدائی پانچ سو سال تک وہ محض ایک مخطوطہ کی صورت میں الجزائر کے ایک کتب خانہ میں پڑی رہی۔ انیسویں صدی عیسوی میں جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر قبضہ کیا تو وہ اس کتاب کو حاصل کرکے پیرس لے گئے۔ وہاں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا گیا جو پہلی بار ۱۸۵۳ء میں حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔

ابن بطوطہ کا سفر نامہ اصل عربی زبان میں پہلی ۱۸۷۱ء میں قاہرہ سے شائع ہوا اور دوسری بار ۱۹۰۴ء میں۔ بعد کو اس کا ترجمہ روسی زبان میں اور یورپ کی اکثر زبانوں میں شائع کیا گیا۔
(الفیصل مئی ۱۹۸۴)

مغربی قوموں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حکومتوں کو مٹانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کی۔ مگر عین اسی زمانہ میں انھوں نے مسلم کتب خانوں میں پڑی ہوئی بے شمار کتابوں کو اہتمام کے ساتھ چھاپا اور ان کے ترجمے کئے۔ انھوں نے سیاست کے معاملہ کو الگ رکھا اور علم کے معاملہ کو الگ۔ یہی کسی قوم کی زندگی کی پہچان ہے اور اسی میں قومی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

ظالم کے لئے کامیابی نہیں

نظام الملک طوسی سلطنت سلجوقیہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے دو سلجوقی حکمراں، الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کا نظام سنبھالا۔ وہ حکومت کے معاملات میں اتنا زیادہ دخیل تھا کہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کا کام تخت پر بیٹھنا رہ گیا تھا یا شکار کھیلنا۔ سلجوقی حکومت کے حریفوں نے نظام الملک کو قتل کرادیا۔ ایک شخص نے صوفی کے بھیس میں ۱۰۹۲ء میں اس پر حملہ کرکے اسے ختم کردیا۔ نظام الملک کے مرتے ہی سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

نظام الملک طوسی کی لیاقت کو عام طور پر مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ پی۔ کے ہٹی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربس" میں نظام الملک کی بابت لکھا ہے کہ اسلام کی سیاسی تاریخ میں وہ ایک درخشندہ نام کی حیثیت رکھتا ہے:

One of the ornaments of the political history of Islam (P. 477)

نظام الملک طوسی کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ اس کے مختلف کارناموں میں مشہور مدرسہ نظامیہ کا قیام (۱۰۶۵-۶۷ء) بھی ہے۔ وہ اسی مدرسے سے اپنے لئے انتظامیہ اور عدلیہ کے لئے تربیت یافتہ افراد حاصل کرتا تھا۔ نظام الملک نے طریق حکومت پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا فارسی نام سیاست نامہ ہے۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ہے: الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم (حکومت کفر کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے مگر وہ ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی)

یہ اصول بادشاہ کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک عام آدمی کے لئے بھی۔ ہر آدمی کا اپنا ایک دائرۂ عمل ہوتا ہے۔ بادشاہ کا دائرہ بڑا ہوتا ہے اور عام آدمی کا چھوٹا۔ جو آدمی کامیابی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرہ میں ظلم کرنے سے بچے۔ اگر اس نے دوسروں پر ظلم کرنے سے اپنے کو نہ بچایا تو یقینی طور پر وہ قدرت کی پکڑ میں آجائے گا۔ خدا کی سنت ہے کہ آدمی کے دوسرے جرموں کی سزا تو اس کو آخرت میں دی جاتی ہے مگر جو شخص ظلم کرے اور ناحق دوسروں کو ستائے اس کی سزا اسی دنیا سے شروع ہوجاتی ہے۔ ظلم کرنے والا خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا، خواہ جلد پکڑا جائے یا دیر میں۔

ظلم ایک ایسی برائی ہے جس کا خمیازہ اولاد تک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ظلم کرنے والا خواہ کوئی حکمراں ہو یا غیر حکمراں، اگر وہ اپنے ظلم پر قائم رہتا ہے تو لازماً ایسا ہوگا کہ اس کے ظلم کا انجام اس کے خاندان تک پہنچے گا۔ آدمی اپنے بچوں کی خاطر ظلم کرتا ہے حالاں کہ بچوں کے حق میں اس سے زیادہ بری وراثت اور کوئی نہیں۔

فتوحات کا راز

یورپ کے ملک اسپین اور افریقہ کے ملک مراکو کے درمیان ایک سمندری پٹی ہے جس کی چوڑائی بعض مقامات پر صرف ۸ میل ہے۔ یہاں اسپین کی جانب دو ساحلی مقامات کے نام یہ ہیں: طریفہ (Tarifa) اور جبرالٹر (Gibraltar)۔ یہ دونوں اسپینی شہر دو مسلم سرداروں کے نام پر ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام طریف اور دوسرے کا نام طارق تھا۔ یہ دونوں مسلم سردار ۷۱۱ء (۹۲ھ) میں مراکو (مراکش) کے راستے سے کشتیوں کے ذریعہ اسپین میں داخل ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسپین میں شاہ لرزیق (King Roderick) کی حکومت تھی۔ بادشاہ کے مظالم سے بگڑ کر خود اسپین کے لوگوں نے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج جو ابتداءً اسپین میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک اسپینی سردار کاؤنٹ جولین (Count Julian) بھی شامل تھا اور مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ ــــــ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ لوگوں کی دعوت کا نتیجہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا اقدام:

But the Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative (17/414).

اسپین کے لوگ بادشاہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اسپینی باشندوں نے تعجب خیز طور پر طارق ابن زیاد کی رضاکارانہ اطاعت قبول کرلی:

Much to his surprise, many Spaniards submitted to him voluntarily (17/414).

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فتح نے اسپینی سماج کے بہت سے عناصر کو فائدہ پہونچایا۔ ٹیکسوں کا بوجھ مجموعی طور پر اس سے کم سخت ہوگیا جو گاتھ عہد کے آخری برسوں میں اسپین میں تھا۔ غلام مزدور جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کو آزاد حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہود اب ستائے نہیں جا رہے تھے اور انھیں اب دوسرے اسپینی فرقوں کے برابر کا درجہ

حاصل تھا۔ اس طرح آٹھویں صدی کے نصف اول میں اسپین میں ایک نیا اور بالکل مختلف سماج پیدا ہو گیا،

> The Muslim conquest brought advantages to many elements of society: the burden of taxes was on the whole less onerous than it had been in the last years of the Visigoth epoch; serfs who converted to Islam advanced into the category of freedom; Jews were no longer persecuted and were placed on an equal footing with the Hispano-Romans and Goths. Thus, in the first half of the 8th century, there was born a new quite different society in Muslim Spain (17/414).

یہاں جو بات اسپین کے مسلم عہد کے بارے میں کہی گئی ہے وہی مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں مسلمان جس طرح دنیا کے بڑے حصہ پر چھا گیے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ممالک اپنے ملکی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ کسی نئے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ بادشاہوں سے ضرور مسلمانوں کی لڑائیاں ہوئیں مگر ان ملکوں کے عوام کے دل اکثر مقامات پر مسلمانوں کے ساتھ تھے انھوں نے نہایت آسانی سے ہر جگہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔

اسپین کا آٹھ سو سالہ مسلم عہد تہذیب کی تاریخ میں انتہائی شاندار عہد تھا۔ مسلمانوں نے اس دور میں ہر اعتبار سے اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔ کسی عیسائی پر کبھی مذہب کی بنیاد پر ظلم نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، اسلام کی خوبیوں سے آگاہ ہو کر آزادانہ طور پر کیا۔ انصاف کا حال یہ تھا کہ سلطان عبدالرحمٰن ثانی پر ایک عیسائی نے قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کیا اور سلطان کو ایک عام آدمی کی طرح قاضی کی عدالت میں جانا پڑا۔

مسلمانوں نے تمام ملک میں سڑکوں اور نہروں کا جال بچھا دیا۔ جگہ جگہ پُل بنائے گیے۔ تعلیم، تعمیر، معدنیات، زراعت، باغبانی، جہازرانی، صنعت، غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے اسپین کو غیر معمولی ترقی نہ دی ہو۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے، مسیحی لوگ تعصب کی بنا پر مسلمانوں کے دشمن ہو گیے۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ اسپین پھر دوبارہ ترقی نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی تاریخ ختم کرنے کی کوشش میں ان کی اپنی تاریخ بھی ختم ہو گئی۔

تخریبی سیاست کا انجام

عباسی خلیفہ مستنصر باللہ ۶۴۱ھ میں فوت ہوا۔ یہ بہت نازک زمانہ تھا۔ چنگیز خاں کی قیادت میں تاتاریوں نے ماوراالنہر سے لے کر بحر روم اور بحر اسود تک کے تمام ملکوں کو تاراج کر ڈالا تھا۔ تاہم عراق پر اب بھی عباسی خلیفہ کا قبضہ تھا اور تاتاریوں کے اوپر خلیفہ بغداد کا رعب اتنا زیادہ تھا کہ وہ عراق کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کے مفتوحہ ممالک میں بدستور خلیفہ بغداد کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا جاتا تھا۔

مستنصر باللہ کا ایک بھائی خفاجی نامی تھا جو بہت بہادر اور اولوالعزم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھ کو خلیفہ بنایا جائے تو میں دریائے جیحوں کے پار تک ان تاتاریوں کا نام ونشان مٹا دوں۔ مگر سلطنت کے درباری اتنے طاقت ور خلیفہ کو اپنے لئے مسئلہ سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر خفاجی کو تخت پر بٹھایا گیا تو وہ ہماری بات چلنے نہ دے گا۔ چنانچہ ۶۴۱ھ میں مستنصر باللہ کا انتقال ہوا تو ارکان سلطنت نے خفاجی کو تخت پر بیٹھنے نہ دیا۔ انھوں نے مستنصر باللہ کے لڑکے ابو احمد عبداللہ کو خلافت کے لئے پسند کیا۔ کیونکہ وہ بہت نرم اور سادہ لوح قسم کا آدمی تھا۔ اس کو نہایت آسانی سے اپنے موافق بنایا جاسکتا تھا۔ مستنصر باللہ کے بعد اس کا یہی بیٹا تخت پر بیٹھا اور اس کو مستعصم باللہ کے نام سے پکارا گیا۔

اسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاریوں کی تباہی اپنی تکمیل تک پہنچی۔ وہ ذاتی طور پر اگرچہ دیندار اور متبع سنت تھا مگر وہ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے پہلی بنیادی غلطی یہ کی کہ موید الدین علقمی کو اپنا وزیر بنا دیا۔ علقمی ایک غالی شیعہ آدمی تھا۔ اس کے سینہ میں یہ آگ بھڑک رہی تھی کہ علویوں کے حق خلافت کو غصب کرنے والے عباسیوں کا خاتمہ کر دے۔ اور ان کی جگہ پر دوبارہ علوی خلافت قائم کرے۔ عباسیوں سے اس کا نفرت اور بغض اس کو اس انتہا تک لے گیا کہ وہ درپردہ تاتاریوں کا دوست بن گیا۔ عباسی سلطنت کو ختم کرنے کا کام وہ خود اپنی طاقت سے نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ تاتاریوں کا سہارا لے کر پہلے اپنے "دشمن" کو ختم کرے اور اس کے بعد اپنی منشا کے مطابق علوی خاندان کے کسی فرد کو بغداد کے تخت پر بٹھائے۔

علقمی نے وزارت پانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ شیعوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ حکومت کے تمام شعبوں میں شیعوں کو کلیدی مقامات پر بٹھا دیا۔ یہاں تک کہ حکومت پوری طرح علقمی کے ہاتھ میں آگئی۔ اب اس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ عباسیوں کا نام ونشان مٹا دے اور بغداد میں علویوں کی حکومت قائم

کر دے۔ خلیفہ محل کی مصنوعی دنیا میں رہتا تھا۔ نیز علقمی خلیفہ کے سامنے حد درجہ نیاز مند اور وفادار بن کر آتا تھا۔ اس لئے خلیفہ اس کی اندرونی سازشوں سے واقف نہ ہو سکا۔ تاہم شہر کے بعض لوگ اس کے منصوبوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے خلیفہ سے مل کر اس کو مطلع کیا۔ مگر خلیفہ علقمی کی ظاہری وفاداریوں کی وجہ سے اس کے بارے میں اتنا خوش فہم تھا کہ اس نے ان لوگوں کی باتوں کو خود علقمی سے بیان کر دیا۔ اب علقمی نے اور بھی زیادہ اپنی وفاداری اور فرماں برداری ظاہر کر کے خلیفہ کو یقین دلادیا کہ جن لوگوں نے خلیفہ سے اس قسم کی باتیں کہی ہیں وہ فتنہ پرور اور غدار ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی دارو گیر شروع ہو گئی اور ان کے انجام کو دیکھ کر بقیہ لوگوں نے بھی اپنی زبانیں بند کر لیں۔

اب علقمی نے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں سے خفیہ خط و کتابت شروع کی جس کی سلطنت خراسان تک پہنچ چکی تھی، علقمی کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ ہلاکو خاں کے ساتھ "متحدہ محاذ" بنا کر عباسی خلافت کا خاتمہ کر دے اور اس کے بعد علوی خلافت کے قیام کے بارے میں اپنے منصوبہ کی تکمیل کرے۔ تاہم تاتاری حکمراں پر عباسی خلیفہ کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ بغداد پر فوج کشی کرنے کے لئے راضی نہ ہوا۔ علقمی نے اصرار کیا تو اس نے کہا کہ جب تک میرے پاس کافی ضمانت نہ ہو گی میں بغداد پر اقدام نہیں کر سکتا۔ علقمی کے تخریبی ذہن نے ضمانت کی ایک تدبیر سوچ لی۔ اس نے خلیفہ کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس فوج ضرورت سے زیادہ ہے۔ ملکی محاصل کا بڑا حصہ اس کے اوپر خرچ ہو جاتا ہے۔ اس لئے خرچ کو کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ فوج کی تعداد گھٹا دی جائے۔ خلیفہ کی رضامندی لے کر علقمی نے فوج کے ایک بڑے حصہ کی چھٹی کر دی۔ کچھ فوجیوں کو بغداد سے دور دوسرے مقامات پر بھیج دیا اور خلیفہ سے یہ کہہ دیا کہ ان کو تاتاریوں کی روک تھام کے لئے سرحد پر بھیجا گیا ہے۔

علقمی کا ایک ساتھی خود ہلاکو خاں کے دربار میں موجود تھا۔ یہ نصیر الدین طوسی تھا۔ طوسی بھی علقمی کی طرح غالی شیعہ تھا اور علقمی کے منصوبہ میں پوری طرح شریک تھا۔ طوسی کی معرفت علقمی نے ہلاکو خاں کو پیغام بھیجا کہ بغداد کو میں نے فوجوں سے خالی کر دیا ہے۔ حربی سامان کا بھی بڑا حصہ باہر بھیج دیا ہے۔ یہ واقعہ ہلاکو خاں کی ضمانت طلبی کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ اُدھر طوسی نے ہلاکو خاں کو یقین دلایا کہ علم نجوم سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کے اوپر آپ کا قبضہ بہت جلد ہونے والا ہے۔ ان یقین دہانیوں کے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کا رخ کیا۔ پچاس روز تک بغداد کا محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران دونوں طرف کی فوجوں میں کئی بار لڑائیاں ہوئیں۔ مگر علقمی شہر کی تمام خبریں خفیہ طور پر ہلاکو خاں کو پہنچا دیتا تھا۔ اور اس طرح بغداد والوں کی ہر اس دفاعی کوشش کو ناکام بنا دیتا تھا جو وہ تاتاریوں کے خلاف کرنا چاہتے تھے

جب محاصرہ بڑھا تو علقمی نے ایک فرضی کارروائی کرکے خلیفہ سے کہا کہ ہلاکو خاں آپ کو امان دینے پر راضی ہوگیا ہے بشرطیکہ آپ اس سے ملیں اور آئندہ کے لئے کوئی باعزت سمجھوتہ کرلیں۔ خلیفہ علقمی کے کہنے میں آگیا اور علقمی کے ساتھ اپنے محل سے نکل کر ہلاکو خاں کے یہاں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی ہلاکو خاں نے اس کو گرفتار کرکے بند کردیا اور بغداد کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ بغداد کی مکمل تباہی کے بعد ۹ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں خلیفہ معتصم کو لے کر بغداد میں داخل ہوا۔ خلیفہ سے پوچھ پوچھ کر محل کے تمام خفیہ خزانے نکلوا لئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ خلیفہ کو قتل کردیا جائے۔ علقمی نے ہلاکو خاں سے کہا مسلمانوں کے خلیفہ کے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ نہ کرو۔ بلکہ اس کو کچلوا کر مارو۔ چنانچہ طوسی اور علقمی نے خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر اس کو ایک ستون میں باندھ دیا۔ اس کے بعد اس پر اتنی لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا۔

عباسی خلیفہ کو ختم کرنے کے بعد علقمی نے حسب قرارداد ہلاکو سے کہا کہ بغداد میں کسی علوی کو حاکم مقرر کردے اور اس کو خلیفہ کا خطاب دے دے۔ ہلاکو خاں نے ابتداءً اس قسم کے مبہم وعدے کرلئے تھے جس کی وجہ سے علقمی کو یقین تھا کہ ہلاکو خاں کسی علوی کو خلیفہ بنا کر مجھ کو اس کا نائب سلطنت بنا دے گا۔ مگر ہلاکو خاں نے علقمی کو ڈانٹ دیا۔ اور بغداد پر اپنی قوم کا ایک حاکم مقرر کیا۔ علقمی اس ذلت اور ناکامی کو برداشت نہ کرسکا اور اس کے بہت جلد بعد گھٹ گھٹ کر مرگیا۔

یہ وہی سیاست ہے جس کا خوبصورت نام موجودہ زمانہ میں متحدہ محاذ رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی تخریبی سیاست ہر زمانہ میں رائج رہی ہے —— کچھ سیاسی حوصلہ مندوں نے بنوامیہ کے ساتھ مل کر ہاشمی خلافت کو ختم کیا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے سیاست داں اٹھے اور انھوں نے بنوعباس کے محاذ میں شامل ہوکر بنوامیہ کو ختم کیا۔ پھر ایک اور سیاسی گروہ اٹھا اور اس نے تاتاریوں کا ساتھ دے کر بنوعباس کا خاتمہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے مفروضہ سیاسی حریف کو مشترکہ قوت سے ہٹا دے اور اس کے بعد اپنے آپ کو اوپر لائے۔ مگر ہر ایک کا ایک ہی انجام ہوا۔ وہ وقت کے قابض گروہ کو ہٹانے میں تو ضرور کامیاب ہوگیا مگر اپنے آپ کو اوپر لانے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

تاریخ کا یہ تجربہ کافی تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کو نہ دہرایا جائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے موجودہ زمانہ کے قائدین آج بھی مسلسل اس کو دہرا رہے ہیں۔ نہ تاریخ کی مثالیں ان کو سبق دینے کے لئے کافی ثابت ہوئیں اور نہ خود اپنا ناکام تجربہ۔ سیاسی تقلید کی یہ انوکھی مثال اس امت کے رہنما دہرا رہے ہیں جس کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ پر ایمان لانے والا آدمی کبھی ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا (المومن لا یلدغ من جحر مرتین)

تاتاری فتنہ اختلافی سیاست کا نتیجہ تھا

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہوا۔ اس وقت بغداد کی سلطنت پر ناصرلدین اللہ کا قبضہ تھا اور خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کر رہا تھا۔ دونوں میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گیا۔ تاتاریوں کے ہاتھ سے مسلم دنیا کی غارت گری انھیں دو مسلم قائدین کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں وقوع میں آئی۔ خراسان کی سلطنت اگرچہ ایک آزاد سلطنت تھی۔ تاہم وہاں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ناصرلدین اللہ کی مملکت کے ایک سرحدی حصہ (عراق) کو کاٹ کر اپنے علاقہ میں شامل کر لے۔ اس نے اپنے ملک میں ناصرلدین اللہ کا خطبہ موقوف کرا دیا۔ ناصرلدین اللہ اس خبر سے بہت خفا ہوا۔ اس نے اس کے توڑ کے لئے یہ تدبیر کی کہ لڑاکو تاتاری قبائل کو اکسا کر خوارزم شاہ پر حملہ کرا دیا۔ یہ تدبیر نہ صرف خوارزم شاہ بلکہ پوری مسلم دنیا کے لئے ایک عذاب ثابت ہوئی۔ تاتاری جب خوارزم شاہ کو مغلوب کر چکے تو انھوں نے ناصرلدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا اور بالآخر دونوں کو برباد کر ڈالا۔

خوارزم شاہ کو ۲۱ سال حکومت کرنے کا موقع ملا اور ناصرلدین اللہ کو ۴۶ سال۔ اس کے بعد دونوں میں سے ہر ایک اسی قبر میں لیٹ گیا جس میں وہ اپنے بھائی کو لٹانا چاہتا تھا ——— تاریخ کا یہ سبق بھی کتنا عبرت انگیز ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر شخص جس کو موقع ملتا ہے پہلی فرصت میں اسی تاریخ کو دہراتا ہے جو خوارزم شاہ اور ناصرلدین اللہ کے واقعہ کی شکل میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو چکی ہے اور آخرت میں ناکام تر شکل میں سامنے آنے والی ہے۔

۱۰۹۵ سے لے کر ۱۲۷۱ تک یورپ کی مسیحی قوموں نے بلاد اسلامیہ پر آٹھ زبردست حملے کئے۔ یہ حملے مغربی سمت سے ہوتے تھے اور ان کا مقصد "مقدس مقامات" کو عیسائی قبضہ میں لینا تھا۔ مگر دو سو سالہ جنگ اس طرح ختم ہوئی کہ بالآخر یروشلم مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اسی زمانہ میں ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں (مغلوں) نے بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا اور اس حد تک کامیاب ہوئے کہ سارے عالم اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا۔ وہ چین کے شمالی پہاڑوں سے چنگیز خاں کی زیر قیادت نکلے اور ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، آذربائیجان، اصفہان، افغانستان، فارس، عراق، شام، ایشیائے کوچک، روس، آسٹریا تک تمام ملکوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کا قبرستان بنا دیا۔ مورخ ابن اثیر جو اس زمانہ کا عینی شاہد ہے، اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

فمن الذی یسھل علیہ ان یکتب نعی الاسلام والمسلمین؟ ومن الذی یھون ذکر ذلک؟	کون ہے جس کے لئے آسان ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کی داستان لکھے۔ اور کون ہے جس کے لئے اس کا ذکر آسان ہو۔
فیالیت امی لم تلدنی ویالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا..	کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا اور کاش میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا اور ختم ہو گیا ہوتا۔
فلو قال قائل ان العالم منذ خلق اللہ سبحانہ :	اگر کوئی کہے کہ جب آدم پیدا کئے گئے، اس وقت سے لے کر اب تک ایسا حادثہ

وتعالیٰ آدم الی الآن - ای الی عهد ابن الاثیر - لم یبتلوا بمثلها کان صادقا .. | انسانیت پر نہیں آیا تو یقیناً وہ سچا ہوگا ۔

سلطان صلاح الدین ایوبی (۹۳ - ۱۱۳۷ھ) کی وفات کے ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں اتنا بڑا حادثہ عالم اسلام پر کیوں پیش آیا۔ کچھ لوگ اس سلسلہ میں تاتاریوں کی سفاکی کا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ حکمراں قومیں ہمیشہ سفاک دشمنوں کے زرغہ میں رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی "تاتار" مسلمانوں کے لئے ہمیشہ موجود رہا ہے۔ پھر اس کو تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں یہ شان دار کامیابی کیسے حاصل ہوئی۔ حالاں کہ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلامی سلطنت کی وسعت، اس کی مسلسل فتوحات، اس کی حربی اور تمدنی ترقیاں اور اس کے مقابلہ میں یورپی قوموں کی عبرتناک پسپائی نے اتنی دھاک بٹھادی تھی کہ کوئی سیاسی حوصلہ مند سلطنت اسلامی کی طرف رخ کرنے کی جرأت مشکل ہی سے کرسکتا تھا۔ تاتاری حملہ کا واقعہ دہلی خلیفہ ناصر لدین اللہ (۶۲۲-۵۵۳ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ مشہور مورخ ابن اثیر اس خلیفہ کا ہم عصر تھا۔ وہ تاتاریوں کی خوں ریزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

وکانوا کلما مروا بمدینة او قریة وضعوا السیف علی اهلها دون تفرقة بین کبیر او صغیر او رجل او امراة، وعمت بلاد المشرق جرائمهم وفظائعهم	جب وہ کسی شہر یا گاؤں سے گزرتے تو اس کے باشندوں پر اپنی تیغ بے نیام کردیتے اور بڑے چھوٹے، عورت، مرد سب کو قتل کرڈالتے۔ مشرق کے تمام علاقے ان کے جرائم سے بھر گئے۔

ابن اثیر نے ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) کے حوادث کے ذیل میں لکھا ہے:

ان سبب خروج التتار الی الدیار الاسلامیة هو تصرف خوارزم شاه السیئ بقتل جماعة من التتار جاؤا الی بلاده للتجارة ونهب اموالهم	بلاد اسلامیہ پر تاتاریوں کی یورش کی وجہ خوارزم شاہ کی یہ بیہودہ حرکت تھی کہ اس نے تاتاریوں کی جماعت کو قتل کردیا اور ان کے اموال کو چھین لیا جو کہ اس کے ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔

یہی قصہ مختلف شکلوں میں مشہور ہوا ہے جس میں تاتاری فتنہ کی ذمہ داری خوارزم شاہ (م ۶۱۷ھ) پر ڈالی گئی ہے۔ مگر تاریخ کے گہرے مطالعہ سے یہ بات صحیح نظر نہیں آتی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود مورخ ابن اثیر نے دوسرے موقع پر ایک اور بات لکھی ہے:

وقیل فی سبب خروجهم الی بلاد الاسلام غیر ذلك مما لا یذکر فی بطون الدفاتر: فکان ما کان مما لست اذکره فظن خیرا ولا تسأل عن السبب	تاتاریوں کی یورش کا اس کے سوا دوسرا سبب بھی بیان کیا گیا ہے جس کو لکھا نہیں جاسکتا، جو ہوا وہ ہوا۔ اب میں اس کو بیان نہیں کروں گا۔ تم اچھا گمان کرلو اور سبب مت پوچھو۔ الکامل، ج ۹، صفحہ ۳۳۱

ابن اثیر کے اس بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ سیاسی اسباب سے اصل حقیقت کو چھپا رہا ہے، مگر یہ تاریخ

کی خوش قسمتی تھی کہ ابن اثیر کی زندگی ہی میں وہ سیاسی رکاوٹ ختم ہوگئی اور بعد کے "دفتر" میں وہ اس کو درج کرنے کے لئے زندہ رہا۔ تاتاری حملہ ۶۱۷ھ میں ہوا اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کا انتقال ۶۲۲ھ میں۔ ابن اثیر نے مذکورہ بالا جملے ۶۱۷ھ کے حوادث کے ذیل میں لکھے تھے۔ ناصرلدین اللہ کے انتقال کے بعد جب وہ ۶۲۲ھ کے حوادث کے ذیل میں خلیفہ کے حالات لکھنے بیٹھا تو اس نے اپنی تاریخی کتاب میں حسب ذیل الفاظ ثبت کئے:

ان كان سبب ما ينسبه العجم اليه صحيحا من انه هو الذي اطمع التتار في البلاد وراسلهم في ذلك فهو الطامة الكبرى التي يصغر عندها كل ذنب عظيم

اگر وہ سبب صحیح ہو جو عجمی لوگ ناصرلدین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں یعنی وہی تھا جس نے تاتاریوں کو حملہ پر اکسایا اور اس سلسلہ میں ان کے پاس پیغام بھیجا تو وہ ایسی قیامت تھی جس کے آگے ہر بڑا گناہ ہیچ ہے۔

استاذ احمد حافظ (مؤلف کتاب الدولۃ الخوارزمیۃ والمغول) نے اس موقع پر حسب ذیل تعلیق کی ہے:

والظاهر ان ابن الاثير وهو من المعاصرين للغزو المغولي والخليفة الناصرلدين الله لم يجرؤ على المجاهرة باستدعاء الخليفة للمغول، ولم ينقل ذلك بصراحة ووضوح الا عند ما توفي الخليفة ذكر هذه الحقيقة في جلاء وجراة

اس کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ ابن اثیر، جو کہ مغلوں کے حملہ اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کے ہم زمانہ ہیں۔ خلیفہ کی وفات سے پہلے صراحتاً اس کو کہنے کی جرأت نہ کر سکے تھے کہ مغلوں کو بلانے والا خود خلیفہ ناصرلدین اللہ تھا۔ اس حقیقت کو انھوں نے خلیفہ کی وفات کے بعد جرأت اور وضاحت سے بیان کیا

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ابن اثیر کے قول کو نقل کیا ہے اور اس پر کوئی جرح و تعدیل نہیں کی (جلد ۱۳، صفحہ ۱۰۷) ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے:

وقد نسب الى الامام الناصر انه هو الذي كاتب التتار واطمعهم في البلاد ليشغل خوارزم شاه عن قصد العراق

ج ۳ صفحہ ۱۲۶

خلیفہ ناصرلدین اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہی ہے جس نے تاتاریوں کو لکھا اور ان کو حملہ کرنے کے لئے اکسایا تاکہ خوارزم شاہ اس کے مقابلہ میں مشغول ہو جائے اور عراق کا قصد نہ کرے

اسی طرح مقریزی نے اپنی کتاب السلوک لمعرفۃ دول الملوک میں اس کی تائید کی ہے (ج ۱، صفحہ ۲۱۸) وہ خلیفہ ناصرلدین اللہ کی وفات کے تذکرے میں لکھتا ہے

وفي خلافته خرب التتار بلاد المشرق حتى وصلوا الى همذان، وكان هو السبب في ذلك فانه كتب اليهم بالعبور الى البلاد خوفا من السلطان علاء الدين محمد بن خوارزم شاه، لما هم بالاستيلاء على بغداد

ناصرلدین اللہ کی خلافت کے زمانہ میں تاتاریوں نے بلاد اسلامیہ کے مشرقی علاقہ میں غارت گری کی یہاں تک کہ ہمدان تک پہنچ گئے، اس کا سبب خود یہی خلیفہ تھا، اس نے تاتاریوں کو لکھا کہ وہ بلاد اسلامیہ میں گھس آئیں۔ یہ

وان یجعلھا دار مملکتہ کما کانت السلجوقیۃ — اس نے سلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاہ کے خوف سے کیا تھا، کیونکہ وہ بغداد پر قبضہ کا ارادہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنا دارالحکومت بنائے۔

خلیفہ ناصرلدین اللہ نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی۔ وہ ۵۷۵ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۴۶ سال تک حکمراں رہا آخر عمر میں اس کو شدید قسم کی پیچش ہوگئی۔ اس کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھا ہوگیا اور اسی حال میں رمضان ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) کی آخری رات کو مرگیا۔ تاتاری اپنے اس خروج میں پہلے خوارزم شاہ پر حملہ آور ہوئے اور خراسان اور بلاد جبل کو اس کے قبضہ سے چھین لیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں (۱۱۶۲-۱۲۲۷ء) کی قیادت میں ارانیہ اور شروان پر قابض ہوگئے۔ خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر طبرستان کے کسی مقام میں چلا گیا اور ۲۱ سالہ حکومت کے بعد ۶۱۷ھ میں فوت ہوگیا۔ تاتاریوں کا ایک گروہ غزنی، سجستان، کرمان وغیرہ کی طرف نکل گیا۔ خوارزم شاہ کو شکست دینے کے بعد تاتاریوں نے اس کے بیٹے جلال الدین بن خوارزم شاہ کو غزنی میں شکست دی۔ چنگیز خاں اس کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ تک چلا گیا۔ جلال الدین دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندستان میں داخل ہوگیا۔ چند روز ہندستان میں رہ کر ۶۲۲ھ میں خوزستان اور عراق کی طرف چلا گیا اور آذربائیجان اور آرمینیا پر قابض ہوگیا۔ یہاں تک کہ مظفر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد تاتاریوں کا ٹڈی دل ناصرلدین اللہ کی مملکت کی طرف بڑھا اور سارے عالم اسلام کو قتل و غارت گری کا قبرستان بنا ڈالا۔

ناصرلدین اللہ نے خوارزم شاہ کو نیچا دکھانے کے لئے جو تدبیر کی، وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں عربوں نے ترک خلافت کا "جوا" اپنے سر سے اتار پھینکنے کے لئے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بنگلہ دیش نے پاکستانی غلبہ کے خلاف اپنی لڑائی میں ایک خارجی ملک کو بہترین مددگار پایا (۱۹۷۰) افغانستان میں سردار داؤد خاں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے وہاں کے لیڈر اشتراکی روس سے مل گئے (۱۹۷۸) وغیرہ۔ اس طرح آج بھی اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی "تاتاری فتنہ" کی شکار گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ان نئے تاتاریوں کو جو لوگ مسلم ممالک میں داخلہ کا راستہ دے رہے ہیں وہ دوبارہ خود مسلمان ہیں جو اپنے حریف مسلمان کو شکست دینے کے لئے اغیار کو ان کے اوپر چڑھالاتے ہیں، اس سیاست کا نتیجہ دوبارہ اسی بھیانک صورت میں نکل رہا ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں ناصرلدین اللہ کے زمانہ میں نکلا تھا۔ اس قسم کی سیاست میں نہ صرف ملت کے بہترین امکانات برباد ہوتے ہیں بلکہ وہ دونوں فریقوں کے لئے یکساں مہلک ہے، جو لوگ اپنے مسلمان بھائی کی ضد میں اغیار کو اپنی صفوں میں داخل کرتے ہیں وہ جب آتے ہیں تو صرف ان کے مفروضہ حریف کو ختم نہیں کرتے۔ بلکہ بیرونی دراندازی کی یہ سیاست بالآخر خود ان کے لئے بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ وہ خود بھی بہت جلد اسی تخریبی سیاست کا شکار بن جاتے ہیں جس کا شکار وہ اپنے حریف مسلمان کو بنانا چاہتے تھے۔ بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن کا قتل (۱۹۷۵) اور افغانستان کے کرنل عبدالقادر (۱۹۷۸) کی تطہیر (purge) اس کی تازہ مثالیں ہیں۔

دو تاریخی تجربے

سلیمان بن عبدالملک (م ۹۹ھ) کی منقبت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے خلافت راشدہ کی زریں فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی اموی حکمراں کے خانہ میں تاریخ ان واقعات کو بھی لکھتی ہے جن کا آخری نتیجہ ان دو عظیم ترین المیوں کی شکل میں برآمد ہوا جن میں سے ایک کا نام اسپین اور دوسرے کا نام ہندوستان ہے۔ اگر سلیمان بن عبدالملک نے اسپین میں طارق کو اور ہندوستان میں محمد بن قاسم کو معتوب کرکے واپس نہ بلایا ہوتا تو شاید ان دونوں ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو بعد کے دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔

اسپین میں کیا ہوا

سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ محض ایک ذاتی شکایت کی بنا پر موسیٰ بن نصیر گورنر افریقہ اور اس کے سپہ سالار طارق بن زیاد (فاتح اسپین) کو ان کے عہدوں سے معزول کرکے واپس بلالیا۔ اور اول الذکر کو قید اور دوسرے کو نظر بند کردیا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر اسپین کی مسلم حکومت اور مرکز خلافت کے درمیان آغاز ہی میں حریفانہ جذبات پیدا ہوگئے۔ ۱۳۲ھ میں جب ایک خونی آشام انقلاب کے بعد دمشق کی اموی سلطنت ختم ہوئی اور نئے دارالخلافہ بغداد میں عباسی خلافت قائم ہوئی تو اموی خاندان کا ایک لٹا ہوا شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اسپین پہنچا اور وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اسپین میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بنوامیہ کے ایک فرد کی یہ کامیابی عباسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس طرح اسپین اور مرکز خلافت کے درمیان رقابت کی ایک اور وجہ پیدا ہوگئی اور نتیجۃً باہمی آویزشوں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا جو صرف اس وقت ختم ہوا جب اسپین میں خود مسلم سلطنت ختم ہوگئی۔

مرکز خلافت اور اسپین کی یہ رقابت یہاں تک بڑھی کہ جس خلافت نے طارق بن زیاد کو کمک دے کر اسپین کی مہم پر بھیجا تھا اسی خلافت نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو اکسایا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں ایک عام خانہ جنگی اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہر علاقہ کا گورنر خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ امیر قرطبہ کے رشتہ داروں نے اس نازک وقت کو اسپین کے تاج و تخت کے لیے سازش کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ مقامی عیسائیوں کو شہ ملی کہ وہ باغی مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہر جگہ شورش پیدا کرتے رہیں۔ اسپین کی اموی خلافت کے بعد اسپین کا ملک چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہوگیا جنھوں نے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بلنسیہ، طلیطلہ، مالقہ وغیرہ شہروں کو اپنا اپنا دارالحکومت بنالیا۔

طارق بن زیاد ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسپین میں داخل ہوا تھا اور ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اسپین سے مسلم

اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ آٹھ سو برس کی اس طویل مدت کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو بغاوتوں اور شورشوں سے خالی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کو اکثر بہت لائق مسلم حکمراں ملے۔ عدل وانصاف کے اعتبار سے بھی اور تمدن و سیاست کے اعتبار سے بھی۔ اور بلاشبہ انھوں نے مشکل حالات کے باوجود تمدن اور سیاست دانی کے اعتبار سے اسپین میں ایک عظیم تاریخ بنائی۔ مگر اندرونی حالات اور مرکز خلافت کی شہ کی بنا پر ملک کی عیسائی رعایا مسلسل بغاوتوں پر مائل رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ ماحول نہ بن سکا جس میں اس اہم ترین کام کی بنیاد پڑتی جس کے لیے اسلام نے کشور کشائی اور جہاں بانی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ یعنی اشاعت دین کا کام۔ عرب اور اطراف عرب کے اکثر ممالک جتنی مدت میں مکمل طور پر اسلامی آبادی کے ملک بن گئے اس سے بہت زیادہ مدت پانے کے باوجود اسپین اسلامی آبادی کا ملک نہ بن سکا۔

اسپین میں مسلم حکومت کی مثال تقریباً ویسی ہی ہے جیسے آزادی سے قبل ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی مثال۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سو سالہ دور حکومت میں ملک کو زبردست تمدنی ترقیات سے مالا مال کیا۔ اگرچہ انھوں نے وہ غلطی نہیں کی جو اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی۔ انھوں نے سارے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھا دیا اور ان کو بے پناہ سہولتیں عطا کیں مگر مسیحی مذہب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس ملک کی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہندوستان سے انگریزوں کی ہوا اکھڑی تو عالی شان عمارتیں اور بڑے بڑے پل ان کے کام نہ آسکے اور انھیں ہندوستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑا۔

طارق بن زیاد نے جس اسلامی جذبے کے تحت اسپین کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اگر وہ جذبہ جاری رہتا اور وہاں مستحکم حکومت کی روایت قائم ہوسکتی تو اسپین میں مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود نہ ہوتا۔ دریا پار کرنے کے بعد اپنی طویل دعاؤں میں اس نے رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا کی آیت بطور بددعا نہیں دہرائی تھی۔ بلکہ یہ اپنے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ اس ملک کو کفر و شرک سے خالی کرکے اسلام کا گہوارہ بنا دینا چاہتا ہے۔ مسلم اسپین کی ابتدائی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر چند ہی برس بعد وہاں کی سیاست کا رخ اس طرح بدلا کہ تبلیغ دین کا کام پس پشت پڑ گیا۔ ۱۳۲ھ میں جب مرکز خلافت میں تبدیلی ہوئی اور بنو امیہ کی جگہ بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی تو اس ذہن کو مزید تقویت ملی۔ کیونکہ عباسیوں کو جتنی دلچسپی تمدن اور علوم و فنون کی ترقی سے تھی اتنی دین کی اشاعت سے نہیں تھی۔ اس طرح بغداد کے اثر سے قرطبہ تمدن اور علوم و فنون کا مرکز تو بن گیا مگر وہ اشاعت دین کا مرکز نہ بن سکا۔

چنانچہ اسپین میں جب حالات بدلے تو وہاں کی مسلم اقلیت پر عیسائی اکثریت آناً فاناً غالب آگئی اور الحمرا کا بے مثال محل مسلمانوں کے کچھ کام نہ آسکا۔ چونکہ عام آبادی میں عیسائیوں کو غلبہ حاصل تھا اس لیے ۹۰۴ھ میں قرطبہ کو زیر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف دار و گیر شروع ہوئی تو ان کے لیے وہاں چھپنے کی

بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عیسائیوں نے غالب آتے ہی تمام ملک میں اپنی مذہبی عدالتیں قائم کر دیں جن میں ہر روز ہزاروں مسلمان گرفتار کرکے لائے جاتے اور طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے۔ ۱۶۰۲ء میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے وہ دین مسیحی قبول کرلے ورنہ جہاں اس کو پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ کچھ مسلمان جہازوں پر سوار ہو کر افریقہ کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ آخر کار کوئی ایک بھی توحید پرست سرزمین اسپین میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب کو یا تو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ یا سمندر میں ڈبو دیا۔ یا آگ میں جلا ڈالا۔

— ۲ —

خلفائے اربعہ کے بعد اسلامی حکومت بنی امیّہ کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے بانی امیر معاویہ (وفات ۶۰ھ) تھے اس سلسلۂ حکومت کا پانچواں فرماں روا عبدالملک بن مروان تھا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس نے تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے کہ عید الفطر کے اجتماع میں یکم شوال ۸۶ھ کو ولید و سلیمان کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی جائے۔ چنانچہ تمام ممالک اسلامی میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولی عہدی کے لیے بیعت لی گئی۔ یہی موقع ہے جب کہ مدینہ کے مشہور محدث سعید بن مسیب کو بیعت سے انکار کرنے پر درے لگائے گئے۔

عبدالملک بن مروان (۸۶-۲۳ھ) کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا لڑکا ولید تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے بعد تخت کی وراثت اپنے بھائی (سلیمان) کے بجائے اپنے بیٹے (عبدالعزیز) کی طرف منتقل کردے۔ ولید بن عبدالملک نے پہلے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا کہ وہ از خود ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے۔ جب سلیمان اس کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے دوسری تدبیر کی۔ اس نے تمام والیان ملک اور ممتاز افراد کو اپنے حق میں ہموار کیا اور طے کیا کہ ایک روز کسی خاص اجتماع کے موقع پر تمام ممالک اسلامی میں سلیمان بن عبدالملک کی ولیعہدی کی منسوخی کا اعلان کر دیا جائے اور اس کے بجائے عبدالعزیز بن ولید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی جائے۔

مگر اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ (فروری ۷۱۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو قدرتی طور پر وہ ان سرداروں کا دشمن ہو گیا جنھوں نے اس کو تخت سے محروم کرنے کی سازش میں اس کے بھائی ولید کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں میں سے ایک حجاج بن یوسف تھا جو مشرق کے اسلامی ممالک کا وائسرائے تھا اور مغربی ممالک کا وائسرائے موسیٰ بن نصیر۔ حجاج کا صدر مقام عراق تھا اور موسیٰ بن نصیر کا قیروان۔ ان دونوں نے ولید کے منصوبہ کی حمایت کی تھی اس لیے دونوں سلیمان کی نظر میں وہ بدترین دشمن تھے جن سے سب سے پہلے نمٹنا نئے حکمراں کے لیے ضروری تھا۔

حجاج، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی سے آٹھ ماہ پہلے شوال ۹۵ھ میں انتقال کر گیا تھا۔ اس لیے

سلیمان اب حجاج بن یوسف کو نہیں پا سکتا تھا۔ تاہم حجاج کے رشتے دار اس کے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے موجود تھے جن میں سرفہرست حجاج کے ابن عم اور داماد محمد بن قاسم کا نام تھا جس نے سندھ (موجودہ پاکستان) میں غیر معمولی فاتحانہ کارنامے دکھا کر حجاج کی شہرت میں اضافہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والا سپہ سالار تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "اس نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے زیادہ بڑا بہادر ثابت کیا تو دوسری طرف نوشیروان عادل سے بڑھ کر عادل و رعایا پرور ظاہر ہوا۔" یہ نوجوان فتح مند سردار سندھ و پنجاب میں اتنی تیزی سے گھس رہا تھا اور بستیوں کی بستیاں اس کے اثر سے اس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب سارا علاقہ ایک اسلامی علاقہ بن جائے گا۔

ہندوستان کی مہم پر محمد بن قاسم کو حجاج ہی نے روانہ کیا تھا اس کے لیے حجاج نے کتنا اہتمام کیا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہوگا۔

۱۔ حجاج نے دیگر تمام ساز و سامان کے علاوہ ۳۰ ہزار دینار خصوصی طور پر محمد بن قاسم کے ہمراہ کیے تھے تاکہ ناگہانی ضرورت کے وقت کام آسکیں (میر معصوم) کہا جاتا ہے کہ فوج کشی کی اس مہم پر کل ۶ کروڑ درہم صرف ہوئے تھے۔

۲۔ فراہمی سامان کا حجاج کو اس قدر خیال تھا کہ اس نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو عربوں کی عادت کی بنا پر کھانے میں سرکہ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ اس نے بہت سی روئی سرکہ میں تر کر کے خشک کرایا اور اس کو محمد بن قاسم کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ جب سرکہ کھانے کا جی چاہے تو اس کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیا کرنا۔

۳۔ پانچ منجنیقیں جو بھاری ہونے کی وجہ سے خشکی کے راستے سے روانہ نہ ہو سکتی تھیں، ایک بڑے جہاز پر لاد کر ساحل سندھ کی طرف روانہ کیں۔ یہ منجنیقیں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو چلانے کے پانچسو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی

۴۔ اس پوری مہم کے دوران حجاج اور محمد بن قاسم کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بصرہ میں تھا اور محمد بن قاسم سندھ میں۔ مگر انتظام یہ تھا کہ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن قاسم بھی ساری مصروفیتوں کے باوجود ہر تیسرے روز حجاج کے نام مفصل حالات تحریر کرتا۔ ڈاک کی روانگی کے لیے ایسے خاص انتظامات کیے گئے تھے کہ اگرچہ دیبل (سندھ) اور بصرہ میں ہزاروں کوس کا فاصلہ تھا مگر برابر ساتویں روز بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ دونوں کے خطوط پہنچ جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں ملتان فتح کیا۔ اب پورا سندھ اس کے قبضہ میں تھا۔ بحر عرب سے لے کر حدود کشمیر تک تمام راجاؤں اور سرداروں نے اسلام کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب اس نے پورے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور قنوج کی طرف کوچ کرنا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد

بقیہ علاقوں کی فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ مگر ۹۶ ھ میں سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کو حجاج کے متعلقین سے حجاج کا بدلہ لینا تھا۔ اس نے ایک طرف حجاج کے بعد یزید بن مہلب کو عراق کا والی مقرر کیا اور ایک خارجی المذہب صالح بن عبدالرحمٰن کو خراج وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ دونوں حجاج کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ سلیمان کے حکم کے مطابق ان دونوں نے نسل عقیل (خاندان حجاج) کے لوگوں کو طرح طرح سے ماخوذ کرکے قتل کرنا شروع کیا۔

دوسری طرف سلیمان نے محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کرنے کا حکم جاری کر دیا جس کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کا ابن عم اور داماد تھا اور حجاج کا نامور عزیز ہونے کی بنا پر اس کو ہلاک کرکے سلیمان اپنے انتقامی جوش کو ٹھنڈا کر سکتا تھا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ نیا حاکم دربار خلافت کا حکم لے کر سندھ پہنچا۔ اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کیا اور مجرموں کی طرح اس کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈالیں اور معاویہ بن مہلب کی حراست میں عراق روانہ کیا۔ یہ بھی محمد بن قاسم کی سعادت مندی تھی۔ ورنہ سندھ میں وہ اتنا مقبول تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم سے بغاوت کرکے خود یزید اور مہلب کو گرفتار کر سکتا تھا۔

فتوح البلدان کے بیان کے مطابق عربی کا مشہور شعر اسی وقت محمد بن قاسم کی زبان پر جاری ہوا تھا:

اضاعونی وای فتی اضاعوا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ لیوم کریھۃ وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا۔ وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے)

اس کے بعد محمد بن قاسم کو دمشق لے جایا گیا۔ وہاں سلیمان کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا۔ اس پر داروغہ جیل کی حیثیت سے صالح بن عبدالرحمٰن مسلط تھا جس نے اس کو جیل میں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالا۔

ایک مورخ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر ولید بن عبدالملک کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی۔ یا سلیمان ہی عقل و ہوش سے کام لے کر محمد بن قاسم کو چھوڑ دیتا تو شاید ایشیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔"

یہی مورخ مزید لکھتا ہے "محمد بن قاسم کے زمانہ میں خلقت خدا کثرت سے اسلام قبول کرتی جا رہی تھی۔ تبلیغ دین کی جو سچی اور صحیح کوشش اس نے چند روز میں کرکے دکھا دی۔ بعد کی بڑی بڑی سلطنتیں صدیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ اس نوعمر سپہ سالار نے چند روز کی حکمرانی میں جو گہرا اثر ڈال دیا تھا۔ ویسا اثر پٹھانوں اور مغلوں کی سلطنتیں پانچ سو برس میں بھی ملک پر نہیں ڈال سکیں۔ سندھ کے علاوہ بقیہ ملک میں آج مسلمان تھوڑے ہیں اور ملک پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ بخلاف اس کے سندھ میں سب سے بڑا غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہے اور یہ صرف عربوں اور خاصتہً محمد بن قاسم کی دین ہے۔"

اچھی زندگی

متوکل علی اللہ (۲۰۷ - ۲۴۷ ھ) ایک عباسی خلیفہ تھا۔ فتح بن خاقان کہتے ہیں کہ ایک روز میں خلیفہ متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ سر نیچا کئے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: امیر المومنین، آپ کچھ فکر مند معلوم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ آپ وہ شخص ہیں جس کو روئے زمین پر سب سے زیادہ آسائش کے سامان حاصل ہیں۔ خلیفہ متوکل نے میری بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور کہا:

> اے فتح، مجھ سے زیادہ اچھی زندگی اس شخص کی ہے جس کے پاس ایک کشادہ مکان ہو، نیک بیوی ہو، بقدر ضرورت روزی کا انتظام ہو، نہ ہم اس کو جانتے ہوں کہ اس کو تکلیف دیں اور نہ وہ ہمارا محتاج ہو کہ ہم اس کو رسوا کریں (تاریخ الخلفاء، صفحہ ۲۴۱)

"اچھی زندگی" اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے ساز و سامان کی کثرت ہو۔ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے۔ قناعت کی دولت اسے ملتی ہے جو بقدر ضرورت چیزوں پر راضی ہو جائے اور شہرت و عزت سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو۔

کسی کو بقدر ضرورت روزی حاصل ہو تو اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ بقدر ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا صرف حرص کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کے لئے کبھی اطمینان نہیں۔ کیونکہ بقدر ضرورت کی تو حد ہے مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

بیوی اس لئے ہے کہ وہ زندگی کی رفیق بنے اور آدمی کے لئے گھریلو سکون کا ذریعہ ہو۔ مگر یہ فائدہ صرف نیک اور صالح بیوی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری تمام خصوصیات جو آدمی ایک عورت میں تلاش کرتا ہے وہ زوال پذیر بھی ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا کرنے والی بھی۔

کسی کے پاس کشادہ مکان ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خود اپنی ایک دنیا حاصل ہے جہاں وہ اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنا کر اس کے اندر رہ سکتا ہے۔ دانش مند آدمی کے لئے کشادہ مکان گویا طوفان نوح کے درمیان ایک کشتی نوح ہے۔

گم نامی آدمی کے لئے سب سے بڑی عافیت ہے۔ کیوں کہ جو شخص نام حاصل کر لے اس کو حاسدین کے حسد سے بچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو خدا نے دوسروں کی محتاجی سے بچایا ہو اس سے بڑا خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عین اس مقام پر آدمی کو ذلیل کر دیتے ہیں جہاں وہ حاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا ہو۔

اخلاص کافی نہیں

ہرمزان (یا ہرمز) قدیم ایرانی سلطنت کا ایک فوجی سردار تھا۔ جنگ قادسیہ میں وہ ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا۔ اس جنگ میں جب اس کو شکست ہوئی تو وہ بھاگ کر خوزستان آیا اور یہاں اپنی فوجیں جمع کرکے ایران کے اس سرحدی علاقہ پر اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔

مسلم فوج نے کوفہ وبصرہ سے نکل کر اس پر حملہ کیا۔ ہرمزان کو شکست ہوئی اور اس نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں سے صلح کرلی۔ مگر موقع پاتے ہی اس نے بغاوت کردی۔ دوبارہ مسلم فوج آئی۔ مقابلہ ہوا جس میں ہرمزان کو شکست ہوئی۔ ہرمزان نے ایک نئے مقام پر پناہ لی۔ جس کا نام رام ہرمز تھا۔ اس نے پھر جزیہ کی شرط پر صلح کی پیش کش کی۔ جس کو مسلمانوں نے منظور کرلیا۔ مگر ہرمزان نے کچھ عرصہ بعد دوبارہ بغاوت کردی۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعری کی سرکردگی میں اسلامی فوج نے اس پر حملہ کیا۔ ہرمزان کو شکست فاش ہوئی۔ اس کا شہر تشتر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ہرمزان تشتر کے قلعہ میں محصور ہوگیا۔

ہرمزان نے دیکھا کہ بہت جلد مسلمان اس کے قلعہ پر قابض ہوجائیں گے، اس نے مسلمانوں کے سردار کے پاس یہ درخواست بھیجی کہ میں اس شرط پر اپنے آپ کو تمہارے سپرد کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مجھ کو خلیفہ عمر کی خدمت میں بھیجا جائے اور میرے معاملہ کو انھیں کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ ہرمزان کو انس بن مالک اور دوسرے لوگوں کی نگرانی میں مدینہ لایا گیا۔ حضرت عمر نے ہرمزان سے کہا کہ تم نے بار بار بدعہدی کی ہے اور بدعہدی کی سزا تم جانتے ہو کہ قتل ہے۔ ہرمزان نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ میری بات سنے بغیر ہی مجھے قتل نہ کردیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ نہیں، تمھاری بات ضرور سنی جائے گی، اس کے بعد ہرمزان نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر اس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے پانی پینے کی حالت میں قتل نہ کردیں، حضرت عمر نے کہا نہیں۔ تم اندیشہ نہ کرو۔ جب تک تم پانی نہ پی لوگے، تم کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہرمزان نے اس کے فوراً بعد پیالہ کا پانی زمین پر گرادیا اور کہا کہ آپ مجھے اب قتل نہیں کرسکتے۔ کیونکہ آپ اس پانی پینے تک کے لئے مجھے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمر نے یہ سن کر کہا: تو جھوٹ بولتا ہے۔ ہم نے تو تجھ کو امان نہیں دی ہے اور تو قتل

کیاجائے گا۔ انس بن مالک فوراً کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا: امیرالمومنین، ہرمز صحیح کہتا ہے۔ آپ کہہ چکے ہیں کہ جب تک تم پانی نہ پی لوگے تم قتل نہ کئے جاؤگے اور پانی اس نے پیا نہیں۔ حضرت عمر اگرچہ انس بن مالک کی دلیل سے مطمئن نہ تھے۔ مگر معاملہ کی نزاکت کی بنا پر خاموش ہو گئے۔

اب ہرمزان نے دوسری ہوشیاری یہ کی کہ کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان بن کر مدینہ میں رہنے لگا اور عمومی اسلامی قاعدہ کے مطابق دو ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ بھی بیت المال سے حاصل کر لیا۔

انھیں دنوں ایک ایرانی غلام ابولولو فیروز مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا۔ ہرمزان اور ابولولو فیروز دونوں مسلمانوں سے اس بات پر ناراض تھے کہ انھوں نے ایران کی کیانی عظمت کو مٹا دیا اور ان کے قومی فخر کا خاتمہ کر دیا۔ اس مشترک جذبہ نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ ان میں رازدارانہ باتیں ہونے لگیں۔ کیانی عظمت کو واپس لانے کے بارے میں وہ اپنے خواب کو واقعہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کی تخریب کے منصوبے بنانے لگے۔

جلد ہی اس کا ایک موقع انھیں میسر آگیا۔ ابولولو فیروز ایک روز مدینہ کے بازار میں تھا کہ اس کی ملاقات خلیفہ عمر سے ہو گئی۔ اس نے کہا اے امیرالمومنین، میرا آقا مغیرہ مجھ سے بہت زیادہ محصول لیتا ہے، آپ اس کو کم کرا دیجئے۔ حضرت عمر نے پوچھا کتنا۔ ابولولو نے کہا دو درہم روز۔ حضرت عمر نے کہا تم کیا کام کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ آہنگری، نقاشی اور نجاری۔ حضرت عمر نے کہا کہ جب تم اتنے ہنر جانتے ہو تو پھر یہ رقم تمھارے لئے زیادہ نہیں ہے۔ ابولولو کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ کیونکہ حضرت عمر نے مذکورہ معاملہ میں ابولولو کے بجائے مغیرہ بن شعبہ کی حمایت کی تھی۔

اس کے بعد حضرت عمر نے ابولولو سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ایسی چکی بنانا جانتے ہو جو ہوا کے زور سے چلتی ہے۔ تم مجھ کو بھی ایسی ایک چکی بنا دو۔ ابولولو نے جواب دیا کہ اچھا۔ میں آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کی آواز مشرق و مغرب کے لوگ سنیں گے۔

اب ہرمز اور ابولولو کے خواب کی تکمیل کا وقت آگیا۔ دونوں نے خفیہ سازش کر کے زہر میں بجھا ہوا ایک خنجر تیار کیا۔ اس کے بعد ابولولو ایک روز فجر کے وقت اندھیرے میں مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا۔ اس کی آستین میں مذکورہ خنجر چھپا ہوا تھا۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو وہ صف اول میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے امامت کے مقام پر کھڑے ہو کر نماز شروع کی تو ابولولو اچانک تیزی سے صف سے نکلا اور حضرت عمر پر پے بہ پے چھ وار کئے۔ حضرت عمر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعد کو اسی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اعلیٰ ظرفی

امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں روم کی مشرقی سلطنت کے اکثر حصے فتح ہو چکے تھے۔ رومی بادشاہ پسپا ہو کر قسطنطنیہ (ترکی) کے قلعہ میں رہنے لگا تھا۔ تاہم سرحد پر وہ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ اسی قسم کی ایک جھڑپ میں ایک بار رومیوں نے کچھ مسلمانوں کو قید کر لیا جن میں قریش کا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ رومی بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ وہ لوگ میرے سامنے حاضر کئے جائیں۔

مسلمان قیدی اس حال میں دربار میں لائے گئے کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی بادشاہ نے ان سے ذلت آمیز گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ تم جیسے لوگوں کی سزا یہی ہے۔ ہم تم کو اس طرح سزا دیں گے یہاں تک کہ تم مرجاؤ اور تمہارے ہم قوموں کو عبرت ہو کہ وہ ہمارے علاقہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔

قریشی کو بادشاہ کا کلام سن کر غیرت آگئی۔ اس نے بادشاہ کو سخت انداز میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک تمہاری اسلام دشمنی باقی ہے تمہارے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔ اور تم جان لو کہ خدا کے راستہ میں ہمارا خون بہت سستا ہے مگر وہ اس وقت بہت قیمتی ہو جائے گا جب کہ تمہارے جیسا بادشاہ ہم کو قتل کرے۔

قریشی کا یہ جواب سن کر دربار کے ایک بطریق (Patriarch) کو غصہ آگیا۔ وہ اٹھ کر قریشی کے پاس آیا اور اس کے چہرہ پر دائیں بائیں دو طمانچہ مارا۔ قریشی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اپنی اس بےعزتی پر وہ چیخ پڑا:

وصاح القرشی باعلیٰ صوتہ۔ یامعاویۃ این انت لتنتقم من ھٰؤلاء الانذال الذین لطموا شریفا من امۃ۔ والتفت الی البطریق وقال، اقسم باللہ ان لی معک یوما ستعرف فیہ من انا۔	قریشی بلند آواز سے چیخا۔ اے معاویہ تم کہاں ہو کہاں ذلیل لوگوں سے انتقام لو جنھوں نے تمہارے ایک شریف آدمی کو طمانچہ مارا ہے۔ پھر وہ بطریق کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میرا ایک دن آئے گا،

جب کہ تم جان لوگے کہ میں کون ہوں۔

اس واقعہ کی خبر قسطنطنیہ سے دمشق پہنچی۔ امیر معاویہ کو اسے سن کر بہت رنج ہوا۔ انھوں نے عزم کیا کہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے اولاً رومی بادشاہ سے تبادلہ کی بنیاد پر مسلمان قیدیوں کی رہائی کی بات کی۔ یہاں تک کہ مسلم قیدیوں کی تعداد کے مقابلہ میں رومی قیدیوں کی زیادہ تعداد کو واپس کرکے اپنے قیدیوں کو رہا کرالیا۔

اس کے بعد امیر معاویہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا۔ انھوں نے تلاش کرکے صور (شام) کے ایک آدمی کو حاصل کیا۔ وہ تاجر تھا اور رومی زبان جانتا تھا۔ امیر معاویہ نے کثیر مقداریں اس کو سونے کے دینار دئے۔ اس کو پورا منصوبہ بتایا اور کہا کہ تم جاؤ اور کسی نہ کسی طرح اس بطریق کو پکڑ کر دمشق لے آؤ۔

اس آدمی نے تاجر کے روپ میں سفر کیا اور اس طرح دمشق سے قسطنطنیہ پہنچا۔ بطریق کے بارہ میں معلومات حاصل کرکے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اس کو قیمتی تحفے (عطر، جواہرات، ریشمی کپڑے وغیرہ) پیش کئے۔ اس طرح وہ کئی بار دمشق سے قسطنطنیہ اور قسطنطنیہ سے دمشق آتا جاتا رہا اور بطریق کو تحفے دیتا رہا۔ یہ پورا معاملہ اتنی رازداری کے ساتھ ہوا کہ تاجر اور امیر معاویہ کے سوا کسی اور کو اس کی مطلق خبر نہ ہوسکی۔

اس طرح لمبا عرصہ گزر گیا۔ جب بطریق سے کافی تعلقات ہوگئے تو اس نے بطور خود کچھ خاص تحفے لانے کی فرمائش کی۔ تاجر اس سے وعدہ کرکے واپس ہوا۔ وہ دمشق آیا۔ یہاں اس نے نہایت تیز رفتار اونٹنی حاصل کی۔ اونٹنی کو ایک آدمی کے ساتھ لاکر ایک خاص مقام پر ٹھہرایا۔ اس کے بعد وہ بطریق کے پاس گیا اور کہا کہ میں تمہارے تمام تحفے لے کر آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس طرح حیلہ کرکے وہ بطریق کو مذکورہ مقام پر لے گیا۔ یہاں دونوں نے اچانک بطریق کو پکڑ لیا۔ انھوں نے نہایت تیزی سے بطریق کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کو سواری پر بٹھا کر ہوا کی رفتار سے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے۔

بطریق جب دمشق پہنچ گیا تو امیر معاویہ نے ایک مجلس میں بہت سے لوگوں کو جمع کیا اور مذکورہ قریشی کو بھی بلایا۔ اس کے بعد ایک پردہ ہٹایا گیا تو اس کے پیچھے مذکورہ بطریق موجود تھا۔ قریشی اس

کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ کے اگلے الفاظ یہ ہیں :

قال معاوية يخاطب القرشي يا ابن عمّ ، الان تستطيع ان تشكر الصوري فقد نفذ كل تدبير دبرته له دون ان يخيب ظني في اقل شئ. والان تستطيع ان تاخذ بحقك من البطريق دون ظلم له.

قال القرشي لولا اني اقسمت لعفوت عنه ، ورفع يده ولطمه لطمة واحدة وهو يقول هذه تكفي ، واعفو عنه فيما بقي.

ونظر معاوية الى البطريق ، وقال : بعد هذا انت في ضيافتنا ثلاثة ايام

ومرت الايام الثلاثة فاعاده الصوري ومعه كل الهدايا التي كان قد طلبها

وفي قصر ملك الروم التف البطارقة حول الملك ليقول لهم لا تسيئوا الى اسرى المسلمين منذ الآن فما رأيت مثلهم عزة وكرامة واخلاقا. ولو اراد معاوية ان يخطفني لما عجز لكنه لا يرضى.

امیر معاویہ نے قریشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے ، اب تم اس صوری تاجر کا شکریہ ادا کرو۔ اس کو میں نے جو تدبیر بھی بتائی اس کو اس نے بغیر کسی ادنیٰ کمی کے نافذ کیا۔ اور اب تم اس بطریق سے اس پر ظلم کئے بغیر اپنا حق لے سکتے ہو۔ قریشی نے کہا کہ اگر میں نے قسم نہ کھائی ہوتی تو میں اس کو معاف کر دیتا۔ پھر ہاتھ اٹھایا اور اس کو ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ بس یہ کافی ہے۔ بقیہ کو میں اس سے معاف کرتا ہوں۔ پھر معاویہ نے بطریق کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب تم تین دن کے لئے ہمارے مہمان ہو۔ تین دن گزرنے کے بعد اس کو صوری تاجر نے اس حال میں واپس کیا کہ اس کے ساتھ وہ تمام تحفے تھے جن کو اس نے طلب کیا تھا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ میں تمام بطریق رومی بادشاہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اب مسلم قیدیوں کے ساتھ برا سلوک نہ کرو۔ کیوں کہ میں نے عزت اور شرافت اور اخلاق میں ان کے جیسا نہیں دیکھا۔ اور اگر معاویہ مجھ کو پکڑنا چاہتے تو وہ اس کے لئے عاجز نہ تھے مگر انھوں نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔

الدعوة (مكة) ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

علامتی سرزمین

شارلی مان (۷۴۲-۸۱۴ء) عباسی خلیفہ ہارون رشید کا ہم عصر تھا۔ مغربی یورپ کے بڑے حصہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ ہارون رشید کے زمانہ حکومت (۷۸۶-۸۰۹ء) میں ایسا ہوا کہ خلیفہ اور فرینک شہنشاہ شارلی مان کے درمیان بعض سفارتی تبادلے ہوئے۔ اس میں بظاہر شارلی مان کا مقصد یہ تھا کہ لاطینی اہل کلیسا کے لیے یروشلم میں کچھ مراعات حاصل کی جائیں:

It was in Harun's reign that certain diplomatic exchanges took place between the caliph and the Frankish emperor Charlemagne.

پروفیسر ہٹی نے بعض مسیحی ماخذ کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلیفہ بغداد کی طرف سے اس وقت شارلیمان کے لیے جو قیمتی تحفے بھیجے گئے، ان میں ایک پیچیدہ گھڑی (Intricate clock) بھی شامل تھی۔ (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۲۹۸)

۱۲ سو سال پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ یورپ کے بادشاہ کو وقت کا وہ اعلیٰ تحفہ بھیج سکتے تھے جو خود یورپ میں ناقابل حصول تھا۔ اور یورپ کا مسیحی بادشاہ فلسطین میں اپنے ہم مذہبوں کے حق میں معمولی مراعات حاصل کرنے کے لیے مسلم خلیفہ سے رجوع کرتا تھا، آج یہ حال ہے کہ اسی فلسطین میں مسلمانوں کی خود اپنی جان و مال بھی محفوظ نہیں۔

فلسطین کے قدیم وارثوں (یہود) کے لیے یہ قانون تھا کہ اگر وہ خدا کے دین پر قائم رہیں تو انھیں فلسطین میں باعزت زندگی حاصل ہو۔ اور اگر وہ خدا کے دین سے ہٹ جائیں تو خدا کافر قوموں کے ذریعہ انھیں فلسطین میں ذلیل کردے (بنی اسرائیل ۸)۔ فلسطین اپنے قدیم وارثوں کے لیے خدا کے رحمت اور غضب دونوں کی علامت تھا۔ اسی طرح فلسطین اپنے نئے وارثوں (مسلمانوں) کے لیے بھی خدا کے رحمت اور غضب کی علامت ہے۔ مسلمان اگر خدا کے دین پر قائم ہوں تو وہ فلسطین میں عزت پائیں گے۔ اور اگر وہ خدا کے دین پر قائم نہ رہیں تو اندیشہ ہے کہ فلسطین میں ان کا وہی انجام ہو جو اس کے سابق وارثوں کا اس بابرکت زمین میں ہوا۔

تعمیر ما سیاست

ابوعلی محمد بن علی بن مُقلہ (۳۲۸ ـ ۲۷۲ھ) نہایت اعلیٰ صلاحیت والا آدمی تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیت سے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں مجتہدانہ اصلاحات کیں۔ اور اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے عربی خط کو ابتدائی دور سے نکال کر تکمیلی دور میں پہنچا دیا۔ فلپ کے ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں اس کو عربی فن کتابت کا بانی (Founder of Arabic Calligraphy) کہا ہے (صفحہ ۴۶۸)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ ابن مقلہ ۸۸۶ء میں بغداد میں پیدا ہوا، اور ۹۴۰ء میں بغداد ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ عباسی دور (۱۲۵۸ ـ ۷۵۰) کا ممتاز ترین خطاط تھا۔ اس نے عربی خط کو کوفی خط کے دور سے نکال کر نسخی خط کے دور میں پہنچایا۔ اس طرح اس نے عربی خط کو نیا حسن (Beauty) عطا کیا۔ (V/272)

ابن مقلہ ابتداءً بغداد میں عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ ـ ۲۸۲ھ) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ ـ ھ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ ـ ۲۹۷ھ) کا۔

واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسیٰ الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے:

اعجب من کل ما رأینا   ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی   وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط

بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتاب کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔

مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوتی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۶۸۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔

اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۸۸۵ــــ۹۴۰ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں، شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں وہ اس کو مل چکی ہوتیں۔ ابن مقلہ ہزار سال پہلے دنیا کو دور پریس میں داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو اپنے مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لیے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی برباد ہوا، اور ملت بھی اس قیمتی فائدہ سے محروم رہ گئی جو اس کی خداداد صلاحیت کے ذریعہ ملت کو پہنچ سکتا تھا۔

ابن مقلہ جب وزیر (یا وزیر اعظم) کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے لیے صحیح ترین بات یہ تھی کہ وہ اس اعلیٰ موقع کو تعمیری میدان میں استعمال کرے۔ مگر وہ حب جاہ کی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گیا جس میں اکثر وہ لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی اور تعمیری حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش خدمت میں مشغول رہنے کے بجائے اب وہ خفیہ قسم کی سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا۔ اب اس نے چاہا کہ حکومت کے نظام میں اپنے مفید مطلب انقلاب لائے۔ اس نے ایک خفیہ منصوبہ کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا تاج پہنایا جائے۔

کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبّك الشيئ يُعمى و يُصم) ابن مقلہ بھی اپنی ساری ذہانت کے باوجود اسی کمزوری کا شکار ہوا۔ وہ اپنے حالات کا اور اس کے مقابلہ میں خلیفہ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ چنانچہ راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لیے مسائل پیدا کیے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا، اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذة عیش   یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔ (ہٹی، صفحہ ۴۲۴)

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کیے۔ وہ کہتا تھا:

وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہؐ کی فلاں فلاں حدیثوں کی کتابت کی، جس نے مشرق اور مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے، وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔

مگر اس دنیا میں اس قسم کے جذباتی الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ ابن مقلہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ قرآن اور حدیث لکھنے ہی پر نہیں رکا، اس نے حد سے نکل کر ایسے مقام پر اپنا ہاتھ ڈال دیا جو اس کا مقام نہ تھا۔ اور جو شخص اس طرح حد سے نکل جائے، اُس کا اِس دنیا میں یہی انجام ہوتا ہے۔

ابن مقلہ مر گیا مگر اس کا کردار آج بھی زندہ ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ ہیں جو عین ابن مقلہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنے ملے ہوئے مواقع کو تعمیر ملت کی بجائے ذاتی جاہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ملت کی تاریخ تعمیر کی تاریخ بننے کے بجائے تخریب کی تاریخ بن رہی ہے۔

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جدوجہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں، ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا (المومن لا یلدغ من جحر مرتین)

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہمیشہ سیاسی عزائم میں برباد ہوئی ہیں۔ سیاست بازی کے کام میں عام طور پر وہی لوگ حصہ لیتے ہیں جو قدرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کو کسی تعمیری خدمت میں لگانے کے بجائے سیاسی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ بے شمار اقتصادی وسائل برباد ہوتے ہیں۔ اور عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو لیڈرانہ شہرت حاصل ہو جائے اور عوام کے حصہ میں صرف یہ نتیجہ آئے کہ ایک "ظالم" کی جگہ دوسرا "ظالم" تخت سلطنت پر بیٹھ گیا ہو۔

تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے کہ مقابلہ آرائی کی سیاست سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہوا ہو۔ قوم کو اٹھانے کا راز یہ ہے کہ قوم کے رہنما اپنے سیاسی جھنڈے کو نیچا کر لیں۔ انفرادی حوصلوں کا "بیج" جہاں زمین میں دفن ہوتا ہے وہیں سے قومی مستقبل کا شاندار "درخت" اگتا ہے۔ آج ہماری تاریخ کو اسی قسم کی نفسیاتی شہادت کا انتظار ہے نہ کہ جسمانی قتل اور ہلاکت کا۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم بن جو ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے "امام" مقرر ہوئے ۔۔ ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چارجامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا" خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور بآسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت، تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا، مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکایک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہونے سے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوتے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

الفاظ کا فتنہ

ابوالطیب احمد بن حسین عرف متنبی (۳۰۳-۳۵۴ھ) کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس بنا پر امیر حمص نے اس کو قید خانہ میں بند کر دیا تھا۔ دوسرا طبقہ اس کا منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ متنبی کے دل میں کبھی اس کا ارادہ پیدا ہو مگر اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔

متنبی ایک ذہین اور باکمال شاعر تھا۔ اس کا کچھ کلام کتابوں میں نقل ہوا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں کہا تھا مثلاً:

والنجم السيار والفلك الدوار والليل والنهار
ان الكافر لفي اخطار

جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کلام اتنا سطحی ہے کہ کوئی جاہل یا غبی آدمی ہی اس کو قرآن کے مقابلہ میں رکھ سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ متنبی سے پوچھا گیا کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ کیوں کہ آپ نے تو صاف طور پر کہا ہے کہ لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اس نے کہا کہ تم لوگوں نے اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حدیث میں تو میری نبوت کی بشارت ہے۔ اس میں لا حرف نفی نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "لا" نام کا نبی میرے بعد ہوگا۔ کیوں کہ آسمانوں پر میرا نام "لا" ہے۔

ایک برطانی شہری کو کسٹم والوں نے پکڑا۔ وہ اپنے جوتے میں ۵۹۸ ملی گرام ہیروئن لئے ہوئے تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جون ۱۹۸۴) سوالات کے دوران اس نے کہا کہ اس نے صرف اس لئے ایسا کیا تھا کہ اپنی عادت کو ٹھوکر مار کر پھینک دے۔

He was only trying to kick the habit.

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظی تاویل کا میدان کتنا زیادہ وسیع ہے۔ لفظی تاویل ایک ایسا ہتھیار ہے جو سفید کو سیاہ کر دے۔ جو قائل کے کلام سے اس کے منشا کے برعکس مفہوم ثابت کر دے۔ لفظی تاویل آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ ہر بات سے اپنا نظریہ نکال لے۔ خواہ وہ بات اصلاً اس کے نظریہ کے بالکل برعکس مفہوم کیوں نہ رکھتی ہو۔ آدمی حقیقت کی تردید الفاظ کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

دو قسم کے انسان

امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) خلیفہ ہارون الرشید کے ہم زمانہ تھے۔ وہ حصول علم کے لئے مکہ آئے۔ یہاں انھوں نے سفیان بن عُیینہ اور دوسرے محدثین سے استفادہ کیا۔

اس زمانہ میں امام شافعی بہت سخت معاشی حالات میں تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں یمن کا والی مکہ آیا۔ قریش کے بعض ممتاز افراد نے والی یمن سے سفارش کی کہ شافعی کے اندر اہلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے۔ والی یمن نے اس سفارش کو قبول کرتے ہوئے انھیں نجران کا عامل بنا دیا۔

مگر امام شافعی کی غیر مصالحت پسندانہ طبیعت نے اس کے بعد ان کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ مذکورہ والی یمن ایک ظالم آدمی تھا۔ امام شافعی نے بعض مواقع پر اس کو اس کی زیادتی اور بے انصافی پر ٹوکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ امام شافعی کا مخالف ہو گیا۔ وہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنے لگا جس کے واسطے سے وہ ان کو سزا دے سکے۔

بالآخر ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے امام شافعی کے اندر اپنے سیاسی "عقائد دریافت کر لیے جن کا ذکر کر کے خلیفۂ وقت کو ان کے خلاف مشتعل کیا جا سکے۔ چنانچہ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو خط میں لکھا کہ ــــــ شافعی علوی سادات کے ساتھیوں میں سے ہے۔ علوی سادات وہ لوگ تھے جن پر یہ الزام تھا کہ وہ عباسیوں کی حکومت کے خلاف ہیں۔ ہارون الرشید نے یہ سنا تو اس نے سمجھا کہ شافعی کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اس نے بگڑ کر والی یمن کو خط لکھوایا کہ شافعی کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ فوراً دارالخلافہ (بغداد) روانہ کرو۔ اس حکم کے مطابق امام شافعی کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا گیا۔

یہ بہت نازک معاملہ تھا۔ مگر اس زمانہ میں امام محمد بغداد میں موجود تھے۔ وہ خلیفہ کے قابل اعتماد لوگوں میں تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعی ایک مجرم کے طور پر خلیفہ کے دربار میں لائے گئے ہیں تو وہ فوراً دربار میں پہنچے۔ انھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ وہ ایک دیندار اور علمی آدمی ہیں۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ امام محمد کی سفارش پر امام شافعی رہا کر دیے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے جب کہ ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ ابھی وہ صرف "شافعی" تھے، اس وقت تک وہ "امام شافعی" نہیں بنے تھے۔ اس مثال میں ایک کردار والی یمن کا ہے اور دوسرا امام محمد کا۔ والی یمن نے پست اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور امام محمد نے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ۔

غلط فہمی

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری (۸۳۹ - ۹۲۳ ء) مشہور عالم ہیں۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک میں تحصیل علم کے بعد بغداد میں مقیم ہوگیے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی کتابوں میں سے دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر میں جامع البیان عن تاویل آی القرآن، اور تاریخ میں تاریخ الامم والملوک۔ دولت سامانیہ کے شہزادہ منصور بن نوح نے ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کی تاریخ کی کتاب کا فارسی ترجمہ (۹۶۳ ء) تیار کرایا تھا۔

ابن جریر طبری مسلمہ طور پر ایک عظیم اسلامی عالم تھے۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ ھ) نے لکھا ہے کہ اقوام وملوک کی تاریخ پر ان کی مشہور کتاب ہے، اور تفسیر قرآن پر ایک کتاب ہے جس کے مثل کتاب ابھی تک کسی نے نہیں لکھی (ولہ الکتاب المشہور فی تاریخ الامم والملوك وکتاب فی التفسیر ولم یصنف احد مثلہ) مگر ۲۸ شوال ۳۱۰ ھ کو جب ابن جریر طبری کا بغداد میں انتقال ہوا تو حنبلی علماء کی شدید مخالفت کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے عام قبرستان میں جگہ نہیں ملی۔ انتقال کے اگلے روز وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کر دیئے گیے۔

امام محمد بن جریر طبری کا یہ انجام کیوں ہوا۔ اس کی وجہ ایک بدگمانی تھی جو بلا تحقیق ان کی طرف منسوب کر دی گئی اور بڑھتے بڑھتے اپنی آخری حد پر پہونچ گئی۔ اصل یہ ہے کہ اسی زمانہ میں ایران میں ایک اور صاحب تھے جن کا نام محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری تھا۔ یہ شیعہ عالم تھے۔ شیعی مسلک کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا ضروری نہیں ہے۔ صرف مسح بھی کافی ہے۔ نام کے جزئی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کو ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کا مسلک سمجھ لیا، حالانکہ وہ محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری کا مسلک تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر متشدد علماء (مثلاً ابو بکر محمد بن داؤد ظاہری) نے ان کو رافضی کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ امام ابن جریر طبری کا رفض اور شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

الرسالہ جون ۱۹۸۷

معاشی فراغت

محمد بن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) ایک انتہائی مشہور عالم ہیں۔ وہ طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کی تحصیل کے لئے رے، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، بغداد وغیرہ کے سفر کئے۔ اپنی پوری عمر تحقیق اور تصنیف میں گزار دی۔ ان کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے:

قیل انه کان یکتب کل یوم ۴۰ صفحة ویتحیرون متی ینام ومتی یاکل ویصلی وذالك لکثرة ماصنفه فی التاریخ والفقه والحدیث والتفسیر والقرأت وعلم الحساب

کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ چالیس صفحات لکھتے تھے اور لوگ حیرت کرتے تھے کہ وہ کب سوتے ہیں اور کب کھاتے ہیں اور کب نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، قرأت اور علم حساب میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی کتاب ۳۰ جلدوں میں ہے اور قرآن کے مطالعہ کے لئے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب تاریخ الرسل والملوک اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ عربی اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ابن جریر طبری کی فارسی دانی ان کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے فارسی مصادر سے معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیں۔

ابن جریر طبری نے اپنی زندگی کو علم کے لئے وقف کیا اور اہم ترین کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی وجہ ان کی معاشی فراغت تھی:

کان والد الطبری یملك مقاطعة فی طبرستان فنشأ ابن جریر غیر محتاج لکسب۔ اذ کان والده ینفق علیه واستمر هذا الانفاق یؤدی الیه حتی بعد وفاة ابیه وهو ینتقل بین البلاد

ابن جریر طبری کے والد کی طبرستان میں ایک جائداد تھی۔ اس کی وجہ سے ابن جریر نے کمانے کی محتاجی کے بغیر نشو و نما پائی۔ ان کے والد ان کا خرچ دیتے رہتے تھے۔ یہ معاملہ والد کی وفات کے بعد بھی باقی تھا۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے رہتے اور ان کا خرچ انھیں ملتا رہتا۔

کوئی موثر کام کرنے کے لئے معاشی فراغت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دینی کام کے لئے بھی ہے اور دنیوی کام کے لئے بھی۔

نازک مسئلہ

خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان پر کچھ شورش پسند مسلمانوں نے قاتلانہ حملہ کیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو انھیں شہید کر ڈالا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ آپ کی مدت خلافت ۱۲ سال ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ اس وقت حج کی ادائگی کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ مقام سرف تک پہونچی تھیں کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ راستہ ہی سے مکہ کی طرف واپس روانہ ہو گئیں۔ مکہ پہونچیں تو ان کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپ کی سواری کے گرد جمع ہو گیے۔ حضرت عائشہ نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ خدا کی قسم، عثمان مظلوم مارے گیے۔ خدا کی قسم، میں ان کے خون کا بدلہ لوں گی (قُتل واللہ عثمان مظلوماً واللہ لاطلبن بدمہ، العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۷۲۱)

حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو کر مکہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ مکہ اور اطراف مکہ میں منادی کر دی گئی کہ ام المومنین عائشہ بصرہ جا رہی ہیں۔ جو شخص اسلام کا حامی ہو اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہے، وہ قافلہ میں شریک ہو جائے۔

مکہ سے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا لشکر روانہ ہوا۔ باہر نکلے تو اطراف وجوانب سے لوگ جوق در جوق آکر قافلہ میں شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی اس لشکر کی تعداد تین ہزار ہو گئی۔

یہ لوگ چلتے ہوئے ایک مقام پر پہونچے جہاں ایک چشمہ تھا۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کو دیکھ کر وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہ نے یہ منظر دیکھ کر چشمہ کا نام پوچھا۔ بتایا گیا کہ یہ مواٴب کا چشمہ ہے۔ یہ نام سنتے ہی حضرت عائشہ نے کہا کہ مجھ کو لوٹاؤ۔

لوگوں نے سبب دریافت کیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی بیویاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی آپ نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم میں سے کس کو دیکھ کر مواٴب کے کتے بھونکیں گے یہ کہہ کر حضرت عائشہ نے اونٹ کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اونٹ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ ایک دن اور ایک رات وہیں مقیم رہیں۔ تمام لشکر بھی آپ کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہا۔

اس کے بعد کچھ لوگوں نے منصوبہ بنا کر اچانک شور کر دیا کہ جلدی کرو، جلدی کرو۔ علی تم تک پہنچ گیے۔ یہ سن کر تمام لشکر نہایت عجلت کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ کے اونٹ کو بھی تیزی سے اٹھا کر بھیڑ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت عائشہ کے سوال پر انھیں بتایا گیا کہ کسی نے غلطی سے آپ کو اس چشمہ کا نام حواب بتا دیا تھا۔ درحقیقت یہ چشمہ وہ چشمہ نہیں ہے۔ اور نہ حواب کا چشمہ اس راستہ میں آتا ہے۔

یہ لوگ چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ بصرہ کے قریب پہونچ گیے جہاں خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب مقیم تھے۔ یہیں وہ جنگ پیش آئی جو اسلامی تاریخ میں جنگ جمل (۳۶ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں خود مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ ایک گروہ کے قائد حضرت علی تھے جن کے ہاتھ پر حضرت عثمان کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی تھی۔ دوسری طرف حضرت عائشہ تھیں جو خون عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر وہاں پہنچی تھیں، کیوں کہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ حضرت علی خون عثمان کے معاملہ کو دبا رہے ہیں اور قاتلین عثمان سے انتقام لینے پر تیار نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑ گیا۔

جنگ جمل کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ بوقت مقابلہ حضرت عائشہ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تقریباً ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف حضرت علی کی فوج کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت عائشہ کے لشکر میں سے ۹ ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گیے۔ اور حضرت علی کی فوج میں سے ایک ہزار ستر آدمی کام آئے۔ گویا مجموعی طور پر تقریباً دس ہزار مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ عوامی تحریک اٹھانا جتنا آسان ہے، اس کو کنٹرول کرنا اتنا آسان نہیں۔ خواہ اس کی قیادت ام المومنین جیسی مقدس ہستی کیوں نہ کر رہی ہو۔ جو لوگ جذباتی اشو پر پر جوش تقریریں کر کے بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے ہیں اور عوام کی بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ آغاز سے زیادہ انجام پر غور کریں۔

اس قسم کی عوامی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں لیڈر نمبر ا پر ہوتا ہے

اور عوام نمبر ۲ پر۔ مگر جب جوش وجذبہ میں بھرے ہوئے عوام کی بھیڑ اکھٹا ہو چکی ہو تو اس کے بعد صورت حال یکسر بدل جاتی ہے۔ اب عوام کو نمبر ۱ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور لیڈر نمبر ۲ کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اب تحریک کی رہنمائی کے لیے عملی طور پر صرف عوام کا جوش رہ جاتا ہے نہ کہ رہنماؤں کا ہوش۔

ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے عوامی کام کو بہت زیادہ سوچ سمجھ کر شروع کیا جائے۔ کیوں کہ اس قسم کے کام کو شروع کرنا ہمیشہ انتہائی آسان ہوتا ہے، مگر اس کو نیک انجام تک پہونچانا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ حضرت عائشہ اگر حج کے بعد گھر (مدینہ) واپس جانے کا فیصلہ کرتیں تو یہ ان کے لیے بالکل سادہ اور آسان سی بات ہوتی۔ مگر حواب کے چشمہ پر جب کہ وہ بھیڑ کے درمیان تھیں تو یہی سادہ سی بات ان کے لیے ناممکن کے درجہ میں مشکل ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہنگامی مواقع پر بیچ سے رائے بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں میں بیچ سے رائے بدلنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دریا کو چھلانگ کے ذریعہ پار کرنا چاہے، اور جب وہ اس کے درمیان میں پہونچے تو یہ فیصلہ کرے کہ مزید تیاری کے لیے اس کو پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔

یہ صحیح نہیں

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے مقالہ کروسیڈ (Crusades) کے تحت لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسیحی مبلغین مشرق کے مسلم ممالک میں داخل ہوئے۔ تاہم وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلامی قانون چوں کہ نہایت سختی کے ساتھ غیر مذاہب کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اسلام سے پھر جانے والے کے لیے اس کے یہاں موت کی سزا ہے، اس لیے اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہی :

Since Islamic law rigidly prohibited propaganda and punished apostasy with death, conversion from Islam were few (5/310).

یہ صحیح ہے کہ اسلامی دور میں غیر مذاہب کی تبلیغ موثر انداز میں جاری نہ رہ سکی۔ مگر اس کی وجہ قانونی ممانعت نہ تھی۔ اس کی وجہ تمام تر وہی تھی جو موجودہ زمانہ میں ہم نسلی بادشاہت کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ آزاد ممالک (مثلاً ہندستان یا فرانس میں) نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ پر کوئی قانونی پابندی نہیں۔ اس کے باوجود ان ملکوں میں نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کے فکری انقلاب نے نسلی بادشاہت کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ نسلی بادشاہت علمی طور پر اب اس قابل نہیں کہ کوئی اس کا مبلغ بن سکے۔

اسی طرح مسلمانوں کے عیسائی نہ ہونے کا کوئی تعلق اسلام کے قانونِ ارتداد سے نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قسم کے اندیشہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ مگر سابقہ صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی تقریباً تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے عملاً ارتداد کا راستہ کھلا ہوا ہے، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں مسیحی مبلغین کو کہیں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی صداقت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے اوپر دوسرے مذاہب کی تبلیغ کو غیر موثر بنا رہی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کی نظریاتی طاقت سے ہے نہ کہ تبلیغ کی قانونی ممانعت سے۔

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد نے رجب ۔ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) میں اسپین کو فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ طارق جب آبنائے جبرالٹر کے ذریعہ سمندر کو پار کرکے اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی فوج کو اسپینیوں سے جنگ پر اکساتے ہوئے کہا:

این المفر۔ البحر من ورائکم والعدو	اب بھاگنے کی جگہ کہاں۔ سمندر تمہارے پیچھے
امامکم۔ فلیس لکم واللہ الا الصدق	ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے۔ خدا کی قسم اب
والصبر	تمہارے لئے صدق اور صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

حقائق کا گہرا تجزیہ بتاتا ہے کہ کشتیوں کو جلانے کا یہ قصہ محض داستاں گو قسم کے لوگوں کی ایجاد ہے، وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ ایک عرب مصنف نے لکھا ہے کہ اسپین میں ایک مثل ہے کہ میں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں (احرقتُ کل سُفُنی) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت خرچ کردی۔ یعنی جنگ کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ (ای بذلت کل طاقتی ۔ بمعنی قاتلوا او موتوا) ممکن ہے کہ یہی اسپینی مثل عربی میں ترجمہ ہوئی ہو، اور پھر کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنی میں لے کر بطور خود کشتیوں کو جلانے کا افسانہ گھڑ لیا ہو۔

طارق بن زیاد کا قافلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں اسپین میں داخل ہوا ہے۔ اس زمانہ کی معاصر تاریخ میں یا کسی بھی قریبی زمانہ کی تاریخی دستاویز میں کشتیوں کے جلانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ابتدائی دور کی تمام کتابیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ قصہ پہلی بار ان کتابوں میں ملتا ہے جو اصل واقعہ کے ساڑھے چار سو سال بعد چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر معاصر مورخین کو یا قریبی زمانہ کے تاریخ دانوں کو نہ ہوسکی، اس کی خبر سیکڑوں سال بعد کے مصنفین کو کیسے ہوگئی۔

طارق بن زیاد کے فتح اسپین (۹۲ھ) کے بارہ میں قدیم ترین ماخذ دو کتابوں کو مانا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں احراق سُفُن (کشتیاں جلانے) کا مطلق کوئی ذکر نہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

تاریخ افتتاح الاندلس، ابن القوطیہ، م ۳۶۷ھ

اخبار مجموعہ، مصنف کا نام لامعلوم، یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان کے علاوہ چوتھی صدی ہجری میں کئی مشہور مسلم مورخ گزرے ہیں۔ مثلاً ابن عبد الحکم (فتوح مصر والمغرب والاندلس) عبد الملک بن حبیب (مبتدأ خلق الدنیا) ابو بکر محمد القرطبی (تاریخ افتتاح الاندلس) احمد بن محمد، ابن الفرضی (تاریخ علماء الاندلس)، الخشنی (قضاۃ قرطبہ)، وغیرہ۔ ان مورخین کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد اپنی کشتیوں کو آگ لگادی تھی۔ حتی کہ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون تک کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔

احراق سُفُن (کشتیوں کو جلانے) کا واقعہ پہلی بار چھٹی صدی ہجری میں بیان کیا گیا۔ ابومروان عبد الملک بن الکردبوس چھٹی صدی ہجری کا ایک مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب تاریخ الاندلس میں اس قصہ کو درج کیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ قصہ اس کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا۔ اس لئے آج ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کے ماخذ کی تحقیق کریں۔

دوسرا شخص جس نے ابتداءً اس قصہ کو بیان کیا وہ بھی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ ابوعبد اللہ محمد الادریسی (م ۵۶۰ھ) ہے۔ اس نے نزہتہ المشتاق کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں احراق سفن کا قصہ درج کیا۔ مگر اس نے بھی اس کا کوئی ذریعہ نہیں بتایا۔ انھیں دونوں کتابوں سے لے کر دوسرے لوگوں نے اس قصہ کو نقل کرنا شروع کردیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو واقعہ لوگوں کو ساڑھے چار سو سال تک معلوم نہ تھا، وہ ساڑھے چار سو سال بعد کس طرح لوگوں کے علم میں آگیا۔ ایسی حالت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصہ سراسر فرضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دانش مند جنرل ایسا نہیں کرسکتا۔ اسپین میں قیام کے دوران طارق کا اتصال افریقہ (مغرب) سے برابر جاری رہا۔ اگر کشتیاں جلادی جاتیں تو یہ اتصال کیوں کر ممکن ہوتا۔ طارق نے اسپین کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر (مقیم افریقہ) سے مدد طلب کی۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار مزید فوجی بطور امداد روانہ کئے۔ یہ پیغام رسانی اور سمندر میں لشکر کی منتقلی کشتیوں کے بغیر کیسے ممکن ہوئی۔

تاریخی تفصیلات

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو، ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک " مورخ اسلام " لکھتے ہیں:

" اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لدکر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتی وجود میں نہیں آئی تھی جس پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کریں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کرکے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴۱۵ء میں قوط (Visigoths) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ گاتھ

کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کر کے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (فیلشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (Radrick) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کر دیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کر کے مسلمانوں کے قریب کر دیا جو افریقی برّ اعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہو گیا اور جبری طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دے دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کر لے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ ھ کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا: "مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پرامید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو۔"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر

پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح کی داستانوں میں اس قسم کے افسانے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی قدیم کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کرکے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایہا الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم
واللہ الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے۔ تمہارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکری چیخ اٹھے:

انا وراءک یا طارق — طارق ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمہارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو۔ وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر

اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلعۃ الاسد (Lion's rock) تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (Pamplona) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جاسکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو گئے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں

کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۹۰ - ۸۸ ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شمرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

> "رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہوگیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ کی دعوت پر ہوا تھا نہ کہ محض اپنی تحریک پر۔ ۷۰۹ میں وٹیزا (Witiza) کی موت سے اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں رذریق کے مقابلہ میں وٹیزا کے خاندان نے موسیٰ بن نصیر سے مدد چاہی۔ اس کے بعد طارق ۷۱۱ء میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں اترے اور رذریق کو فیصلہ کن شکست دی۔

اس کے بعد تعجب خیز طور پر اکثر اسپینیوں نے رضاکارانہ طور پر اس کی اطاعت قبول کرلی۔ ۲۰ ہزار کی ایک فوج کے ہاتھوں اس تیز رفتار فتح کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس وقت اسپین کے لوگوں میں

اتحاد نہ تھا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں سے اسپین کے لوگوں کو بہت فائدے پہنچے۔ مثلاً نئے حکمرانوں نے ان کے اوپر سے ٹیکس کا بوجھ کم کردیا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوگئی۔ یہود پر عیسائیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم ختم ہوگئے اور انھیں سماج کے اندر برابری کا درجہ مل گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصہ میں مسلم اسپین کے اندر ایک نیا اور بالکل مختلف سماج قائم ہوگیا (17/414)

نتیجۂ بحث

تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ حقائق حیات کا مطالعہ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں طارق بن زیاد کی کامیابی ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ تھی نہ کہ محض پرجوش اقدام کا نتیجہ۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت اٹل اصولوں پر قائم ہے جن کو پوری طرح سمجھا اور جانا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی واقعہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ ان قوانین کے ساتھ مطابقت کرکے عمل کیا جائے جن پر موجودہ دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں کو جانے اور ان کے اوپر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں، خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارہ میں کتنا ہی زیادہ خوش فہم ہوا اور اپنی مفروضہ کامیابی کو بتانے کے لئے اس نے کتنے ہی زیادہ شاندار الفاظ پالئے ہوں۔

میوات کا سفر از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ہدیہ ۲۵ روپیہ

یونانی علوم

سکندراعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) قدیم یونان کا بادشاہ تھا۔ اس نے ایران سے لے کر ترکستان اور چین تک بہت سے ممالک فتح کر ڈالے۔ اس کے بعد رومی ابھرے اور انھوں نے دوسرے ملکوں کے ساتھ یونان کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اب دونوں سلطنتیں ایک ہوگئیں۔ اس طرح یونانیوں اور رومیوں نے اسلام سے پہلے قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ سیاسی کامیابیوں نے قوم کے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ ان کی بڑھتی ہوئی خوشحالی نے انھیں علمی کام کے مواقع دیے۔ ان حالات میں یونان میں فلسفہ اور دوسرے علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم یہ فلسفہ زیادہ تر منطقی بحثوں اور دور از کار قیاس آرائیوں پر مشتمل تھا۔ قسطنطین کے بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو اس قسم کی کتابوں کو مذہب کے لیے مضر سمجھ کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کو فلسفیانہ کتابوں کی تلاش ہوئی تو اس نے شاہ روم کو خط لکھا کہ فلسفہ کے متعلق یونانی اور رومی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے ان کو بھیج دے۔ اس زمانہ کا رومی بادشاہ خود بھی اس قسم کی کتابوں سے بے خبر تھا۔ اس نے معلومات کیں تو ایک بوڑھے راہب نے اس کو ایک بند مکان کا پتہ دیا جہاں عیسائیت کے فروغ کے بعد فلسفہ کی تمام کتابیں لوگوں سے چھین کر رکھ دی گئی تھیں اور باہر سے اس پر بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا۔ شاہ روم نے راہب سے پوچھا، کیا یہ کتابیں مسلمانوں کے ملک میں بھیج دی جائیں۔ راہب نے جواب دیا: آپ ضرور ان کو مسلمانوں کے پاس بھیج دیں۔ کیوں کہ یہ کتابیں جس قوم میں پڑھی جائیں گی اس کو لایعنی بحثوں میں الجھا کر اس کے عقائد کو متزلزل کردیں گی اور نتیجۃً اس قوم کی کمزوری کا باعث ہوں گی۔ چنانچہ شاہ روم نے یہ کتابیں اس مکان سے نکالیں اور ان کو پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے:

ووجد وافیہ کتبا کثیرۃ فاخذوا — ان کو اس گھر میں بہت سی کتابیں ملیں۔
من جلمنہا بغیر علم وفحص خمسۃ — انھوں نے کسی تحقیق و جستجو کے بغیر ایک طرف

سے پانچ بوجھ کے بقدر کتابیں لیں اور ان کو مامون کے پاس بھیج دیا۔

احمال وسیرت الی السماموت
(اخبار الحکماء)

عیسائی راہب کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں اس قسم کی کتابوں کے اثر سے مسلمان قرآن کے فطری اسلوب سے ہٹ گیے۔ قرآن میں استدلال کی بنیاد حقائق فطرت پر رکھی گئی تھی، قدیم فلسفیانہ کتابوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ دی۔ یہ طریق بحث اور طرز استدلال سراسر قرآن سے ہٹا ہوا تھا۔ مگر بعد کو وہ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہو کر دھیرے دھیرے مقدس بن گیا۔ اس واقعہ کو اب ایک ہزار سال سے زیادہ ہو رہے ہیں مگر آج بھی مسلمان منطق و فلسفہ کے اس طلسم سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اس غیر اسلامی علم کے ابدی تسلط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں کے بعد مسلمانوں کے جو علوم مدون ہوئے وہ تمام تر اسی منطقی اسلوب میں مدون ہوئے۔ یہ طرز ہمارے علوم میں اتنا زیادہ دخیل ہوا کہ اب ایک شخص جو قدیم منطق میں کافی درک نہ رکھتا ہو وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً شرح ملا علم نحو کی کتاب ہے اور ہمارے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر منطق کی اصطلاحات اور منطقی طرز بحث کو جانے بغیر اس کتاب کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی حال فنون اسلامی کی دوسری کتابوں کا ہے۔ اس طرح منطق اسلامی علوم کی فنی تدوین میں داخل ہوئی اور بالآخر وہ اسلامی کتب خانہ کا ایک مستقل جزء بن گئی۔ اب غیر ضروری طور پر یہ سوال سامنے آ گیا کہ قدیم منطق کو چھوڑنا ہے تو اسلام کی قدیم فنی کتب کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر اتنا چھا گیا ہے کہ خود اسلامی علوم اس کے نیچے دب کر رہ گیے ہیں۔

تاریخ کا سبق

المامون (۲۱۸-۱۷۰ھ، ۸۳۳-۸۶ء) ساتواں عباسی خلیفہ ہے۔ وہ اپنے والد ہارون الرشید کی وفات کے بعد محرم ۱۹۸ھ میں بغداد کے تخت خلافت پر بیٹھا۔ وہ علم اور عمل دونوں اعتبار سے ممتاز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگوں اور شورشوں کا زمانہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے زمانہ میں علم وفن کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ المامون ہی نے بغداد کے مشہور بیت الحکمت کو قائم کیا تھا۔ بیت الحکمت (۸۳۰ء) ایک عظیم علمی ادارہ تھا جو کتب خانہ، تحقیق اکیڈمی اور دار الترجمہ وغیرہ کا مجموعہ تھا (ہسٹری آف دی عربس ۳۱۰)

مامون کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنے کے لیے رشتہ کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صحیح آدمی کی تلاش کی۔ ۲۰۰ھ میں اس نے آل عباس کے قابل ذکر افراد کو مرو میں جمع کیا۔ کئی مہینے تک ان کی تواضع کی۔ وہ ان میں سے کسی لائق شخص کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی عباسی اس کو اپنے معیار کے مطابق نظر نہ آیا۔

آخرکار اپنے وزیر الفضل کے مشورہ (الکامل فی التاریخ ۱۹۷/۶) پر اس نے بنو ہاشم کی علوی شاخ سے مناسب آدمی لینے کا فیصلہ کیا۔ تلاش اور غور وفکر کے بعد اس نے اس منصب کے لیے علی بن موسی الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد بن الحسین بن علی بن ابی طالب کا انتخاب کیا۔

مامون نے ان کو الرضی کا خطاب دیا اور اپنے انتخاب کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ان سے اپنی لڑکی ام حبیب کا نکاح کر دیا۔ ہارون الرشید کی وصیت کے مطابق، مامون کے بعد اس کا بھائی مؤتمن ولی عہد تھا، مگر مامون نے مؤتمن کو معزول کر دیا۔ اور علی الرضی کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں :

وذلك ان المامون رأى ان عليا الرضى خير اهل البيت وليس فى بنى العباس مثله فى علمه و دينه فجعله ولى عهده من بعده (البداية والنهاية ۲۴۷/۱۰)	اور ایسا اس لیے ہوا کہ مامون نے دیکھا کہ علی الرضی اہل بیت میں سب سے بہتر ہیں۔ اور بنو عباس کے اندر علمی اور دینی اعتبار سے ان کے جیسا کوئی نہیں۔ پس مامون نے اپنے بعد ان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

ابن اثیر نے یہی بات ان لفظوں میں لکھی ہے کہ : انہ نظر فی بنی العباس وبنی علی فلم یجد احداً افضل ولا اورع ولا اعلم منہ (الکامل فی التاریخ ۶/۳۲۶)

یہ المامون کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے خلافت کے منصب کے لیے بنوعباس کا کوئی فرد نامزد کرنے کے بجائے علوی شاخ کا ایک فرد منتخب کیا۔ کیوں کہ اس کو نظر آیا کہ عباسی خاندان کے مقابلہ میں علوی خاندان کے اندر زیادہ اہل افراد موجود ہیں۔ مگر المامون کے اہل خاندان (بنوعباس) اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے مختلف قسم کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ، بعض روایات کے مطابق، انگور میں زہر ملاکر علی الرضی کو کھلا دیا۔ جس سے صفر ۲۰۳ھ میں ان کی موت واقع ہوگئی۔

فرانسیسی مستشرق پروفیسر ڈامینیک سورڈیل (Dominique Sourdel) نے لکھا ہے کہ المامون کے وقت مسلم دنیا شیعہ گروہ اور سنی گروہ میں بٹ گئی تھی۔ ایک طرف پیغمبر اسلام کے چچا عباس کے اہل خاندان تھے اور دوسری طرف پیغمبر کے داماد علی سے وابستہ حضرات، پوری عباسی سلطنت کا خلیفہ بننے کے بعد المامون نے طے کیا کہ وہ مسلم امت کی اس تقسیم کو ختم کرے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس کے معاصرین کے لیے سخت تعجب خیز تھا، حتی کہ وہ خود اس کی اپنی حیثیت کے لیے بھی نقصان دہ تھا۔ اس نے یہ کیا کہ اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے لیے اپنے خاندان کے کسی فرد کو نہیں لیا۔ بلکہ اس نے علی الرضی کو اپنا سیاسی جانشین مقرر کیا جو کہ علی بن ابی طالب کے خاندان سے تھے۔ بظاہر دو خاندانوں کے درمیان رقابت کو ختم کرنے کے لیے المامون نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی علی الرضی کے ساتھ کر دیا۔ دونوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لیے مزید اس نے یہ کیا کہ اس نے عباسیوں کے کالے جھنڈے کو چھوڑ کر علویوں کے ہرے جھنڈے کو سرکاری طور پر اختیار کر لیا۔

مگر المامون کی ان کوششوں کا متوقع نتیجہ نہیں نکلا۔ عباسی گروہ اتنا ناراض ہوا کہ بغداد میں باقاعدہ طور پر المامون کی خلافت سے معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ عباسیوں نے المامون کو تخت سے ہٹاکر عباسی خاندان کے ابراہیم کو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کر دیا۔

اس وقت المامون بغداد سے دور مرو میں تھا۔ جب یہ خبریں پہنچیں تو وہ فوراً مرو سے چل کر بغداد کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس لمبے سفر کے دوران یہ واقعہ ہوا کہ فروری ۸۱۸ء میں اس کے وزیر

الفضل کو قتل کر دیا گیا۔ اور علی الرضی بھی زہر آلود انگور کھانے کے بعد اگست ۸۱۸ء میں اچانک مر گئے۔

علی الرضی اور ان کے حامی وزیر الفضل کی یہ اندوہناک موتیں کیوں کر ہوئیں، اس کی توجیہہ کے لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عباسیوں نے ان دونوں کو مروادیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خود المامون نے اس وقت کے مخالفانہ حالات سے گھبرا کر انھیں ختم کر دیا اور حالات سے مصالحت کرتے ہوئے دوبارہ خلافت کا منصب عباسی خاندان کے حوالے کر دیا (11/417-18)

ابن خلدون نے اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی معاشرہ میں عمومی طور پر جب وازع دینی ضعیف ہو جائے تو اس کے بعد ایک فرد، خواہ بذات خود وہ کتنا ہی صالح ہو، وہ معاشرہ میں صلاح و فلاح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا (مقدمہ ابن خلدون ۲۱۱)

اس طرح کے واقعات کثرت سے تاریخ میں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیاسی نظام سماجی حالات کے تابع ہے۔ جیسے سماجی حالات ویسا ہی سیاسی نظام۔

یہ تاریخی حقیقت بتاتی ہے کہ جو شخص صالح افراد کے ہاتھ میں حکومت کا نظام دینا چاہتا ہو اس کو پہلے سماجی نظام میں اس کے موافق تبدیلی لانا ہوگا۔ اس تبدیلی سے پہلے کبھی صالح افراد کی سیاسی قیادت کسی معاشرہ میں قائم نہیں ہو سکتی۔

اس واضح تاریخی شہادت کے باوجود جو لوگ ایسا کریں کہ ضروری سماجی تبدیلی کے بغیر صالح سیاسی قیادت کا نعرہ لگائیں، وہ یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

نصیحت کا اثر

قال سفیان بن حسین ۔ ذکرتُ رجلاً بسوءٍ عند ایاس بن معاویۃ ۔ فنظر فی وجھی فقال ۔ اغزوتَ الروم ۔ قلت لا ۔ قال السند والھند والترك ۔ قلت لا ۔ قال افسَلِمَ منك الروم والسند والھند و الترك ولم یَسلم منك اخوك المسلم ۔ قال فلم اعد بعدھا

(البدایۃ والنھایۃ)

سفیان بن حسین کہتے ہیں ۔ میں نے ایاس بن معاویہ کے پاس ایک شخص کا ذکر برائی کے ساتھ کیا ۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا ۔ کیا تم نے روم سے جہاد کیا ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ انھوں نے کہا کیا تم نے سندھ اور ہند اور ترک سے جہاد کیا ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ انھوں نے کہا پھر کیا روم اور سندھ اور ہند تو تم سے محفوظ رہے اور تمہارا بھائی مسلمان تم سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ سفیان بن حسین کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اس بات کو نہیں دہرایا ۔

قال ابن ابی حاتم قدم سفیان الثوری المدینۃ فسمع المعافری یتکلم ببعض ما یضحك بہ الناس فقال لہ یا شیخ اما علمت ان للہ تعالیٰ یوماً یخسر فیہ المبطلون ۔ قال فمازالت تعرف فی المعافری حتی لحق باللہ تعالیٰ

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع ، صفحہ ۱۵۱)

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ سفیان ثوری مدینہ آئے انھوں نے معافری کو سنا کہ وہ کچھ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے لوگ ہنسیں ۔ سفیان ثوری نے ان سے کہا کہ اے شیخ ، کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہے جب کہ باطل لوگ گھاٹے میں رہیں گے ۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ نصیحت معافری میں پہچانی جاتی رہی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے ۔

آدمی کا احساس زندہ ہو تو وہ نصیحت کو سن کر فوراً چونک اٹھتا ہے اور اپنی اصلاح کر لیتا ہے ۔ مگر جن لوگوں کا احساس مردہ ہو جائے ۔ وہ نصیحت کو سنتے ہیں مگر نصیحت ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتی ۔ نصیحت سننے کے بعد بھی ان کا وہی حال رہتا ہے جو نصیحت سننے سے پہلے ان کا حال تھا ۔

دو مثالیں

دمشق کی مسلم خلافت جس زمانہ میں ولید بن عبد الملک اموی کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ کی طرف سے موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کے حاکم تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ انھیں موسیٰ بن نصیر کی ماتحتی میں انجام پایا۔ موسیٰ بن نصیر نے اولاً معلومات حاصل کرنے کے لیے سردار طریف کو ۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ اسپین بھیجا۔ سردار طریف کی واپسی کے بعد طارق بن زیاد (ایک بربری غلام) کی سرداری میں سات ہزار کا لشکر روانہ کیا گیا۔ یہ لوگ مراکش کے ساحل سے کشتیوں پر روانہ ہوئے اور تقریباً دس میل کا سمندری سفر طے کر کے اسپین کے ساحل پر اتر گئے۔

طارق بن زیاد کو اسپین میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی فوج سے سابقہ پیش آیا۔ طارق ابن زیاد کے ساتھ صرف سات ہزار آدمی تھے اور دوسری طرف ایک لاکھ کی فوج جو ہر لحاظ سے زیادہ مسلح اور زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ ۲۸ رمضان ۹۲ ھ (جولائی ۷۱۱ء) کو دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس درمیان میں مزید ۵ ہزار فوج طارق کی مدد کے لیے مرکز سے آگئی۔ بارہ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ عیسائیوں سے نہایت بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان کے اوپر فتح حاصل کی۔ اس طرح طارق ابن زیاد نے اسپین میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔

طارق بن زیاد نے فتح کی خبر اپنے امیر موسیٰ بن نصیر کے پاس روانہ کی۔ امیر موسیٰ بن نصیر نے اس کے جواب میں طارق بن زیاد کو لکھا کہ تم نے ملک کا جتنا حصہ فتح کیا ہے اسی پر قائم رہو اور اس سے آگے مت بڑھو۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اسپین کی طرف روانہ ہوئے۔

امیر موسیٰ بن نصیر کا مذکورہ خط طارق بن زیاد کو ملا تو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس وقت پیش قدمی سے رکنا درست نہیں ہے۔ ہم کو آگے بڑھ کر ملک کے بقیہ حصوں کو بھی فتح کرنا چاہیے ورنہ عیسائی طاقتیں اکٹھا ہو کر ہمارے اوپر حملہ کر دیں گی اور ہمارے لیے موجودہ قبضہ کو باقی رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ طارق بن زیاد نے امیر کے مشورہ کے خلاف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ علاقے فتح کر ڈالے۔

امیر موسیٰ جب اسپین پہونچے تو وہ یہ دیکھ کر سخت ناراض ہو گئے کہ طارق نے ان کے حکم کی پروا

نہیں کی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ امیر موسیٰ نے طارق کو اس حکم عدولی پر قید کر دیا۔ تاہم یہ صرف ایک ظاہری کارروائی تھی جو انھوں نے اس لیے کی کہ دوسرے سرداروں کو یہ سبق ہو جائے کہ ماتحت کے لیے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری ہے، وہ دل سے طارق کی بہادری اور حسن کارکردگی پر خوش تھے چنانچہ وقتی تنبیہہ کے بعد امیر موسیٰ نے طارق کی اس طرح قدر دانی کی کہ ان کو اسپین کی تمام افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔

یہ صورت جو طارق بن زیاد کے ساتھ پیش آئی تھی یہی جلد ہی بعد خود موسیٰ بن نصیر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک کو جب موسیٰ بن نصیر کی فتوحات کا علم ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر اسپین کو فتح کر کے فرانس میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو لکھا کہ تم یورپ میں مزید پیش قدمی نہ کرو اور بلا تاخیر دمشق واپس آجاؤ۔ خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں موسیٰ بن نصیر اندلس سے دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے اندلس کی حکومت اپنے لڑکے عبد العزیز کے سپرد کی اور کثیر مالِ غنیمت اور سونے چاندی کے ساتھ روانہ ہو کر مراکش اور مصر ہوتے ہوئے شام پہونچے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک سخت بیمار ہو گیا جو اس کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ ولید بن عبد الملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبد الملک تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر کثیر اموال کے ساتھ شام پہونچ گیے ہیں تو اس نے موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ابھی باہر رُکے رہو اور دمشق میں داخل ہونے میں جلدی نہ کرو۔ سلیمان بن عبد الملک کا منشا یہ تھا کہ خلیفہ ولید کی وفات کے بعد امیر موسیٰ دمشق آئیں اور اسپین کا مال غنیمت میرے خلیفہ بننے کے بعد دربار میں لایا جائے۔ اس طرح میری تخت نشینی کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ مگر امیر موسیٰ سلیمان بن عبد الملک کے اس پیغام کی رعایت نہ کر سکے اور وہ تیزی سے سفر کر کے دمشق پہونچ گیے۔

امیر موسیٰ کے دربار میں حاضری کے صرف چند دن بعد خلیفہ ولید بن عبد الملک کی وفات ہو گئی اور ۱۶ جمادی الثانی ۹۶ھ کو سلیمان بن عبد الملک خلیفہ قرار پایا۔ سلیمان بن عبد الملک کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ امیر موسیٰ کی حکم عدولی کو حسن نیت پر محمول کر کے معاف کر دے۔ مگر وہ ان کو معاف نہ کر سکا۔ اس نے امیر موسیٰ کے ساتھ سخت سلوک کیا حتیٰ کہ ان کو قید میں ڈال دیا۔ موسیٰ بن نصیر شدید مایوسی اور ناکامی کے عالم میں اگلے ہی سال ۹۷ھ میں وفات پا گیے۔ بوقت وفات ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔

دو تصویریں

کہا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب شیخ بایزید بسطامی کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے۔ یہودی نے کہا۔ میں اسلام کیسے قبول کروں۔ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید بسطامی کا مذہب تھا تو وہ میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں عام مسلمانوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے۔

ایک غیر مسلم شیخ بسطامی جیسے بزرگوں میں جو مذہب دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی دنیا سے کٹ کر گوشہ میں معتکف ہو جائے۔ وہ مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے۔ وہ روزانہ کئی کئی بار قرآن ختم کرے۔ وہ سال بھر روزے رکھے۔ وہ حج کرنے جائے تو ہر قدم پر دو رکعت نفل پڑھے۔ وہ ذکر کے کچھ الفاظ یاد کر کے روزانہ کئی کئی لاکھ بار اس کا ورد کرے، وغیرہ

دوسری طرف عوام کے اندر جو اسلام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اسلام کا نام لے اور عملاً اپنی مرضی پر چلے۔ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے اور انسان کے سامنے اکڑ دکھائے۔ وہ قرآن کو بطور تلاوت پڑھے اور اپنی زندگی کو اس کے احکام سے آزاد رکھے۔ وہ اسلام کے دینِ کامل ہونے پر فخر کرے مگر اپنی حقیقی زندگی میں جزئی اسلام پر بھی قائم نہ ہو۔ وہ کریڈٹ ملنے والے مقامات پر اسلام کا جھنڈا اٹھائے اور جہاں بظاہر کریڈٹ نہ مل رہا ہو وہاں اسلام سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ قومی دین کو اپنا دین بنائے اور اس کے اوپر خدا کے دین کا لیبل لگا دے۔

اسلام ایک سادہ اور فطری دین ہے۔ وہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اپنی اسی فطری کشش کی وجہ سے دورِ اول میں اسلام زمین کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسلام کی خود ساختہ شکلیں بن گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے لوگوں کی نظر میں اپنی کشش کھو دی۔

اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ باعتبار حقیقت وہ آج بھی اپنے اندر مکمل کشش رکھتا ہے۔ اگر اسلام کی حقیقی تصویر سے تمام مصنوعی پردے ہٹا دیئے جائیں تو اسلام اپنے آپ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔

ایک عام برائی

یزید کی فوجوں سے حضرت حسین کی جو لڑائی کربلا کے میدان میں ہوئی، اس میں حضرت حسین کے ساتھ ان کے چار فرزند بھی مارے گیے تھے۔ مگر شیعہ مصنفین کی کتابوں میں حضرت حسین کی شہادت کے ذیل میں صرف ان کے ایک صاحبزادے کا ذکر آتا ہے جن کا نام عباس بن علی تھا۔ بقیہ تین صاحبزادوں کے نام سرے سے ذکر نہیں کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نام حضرت علی نے خلفاء ثلاثہ کے نام پر رکھے تھے جن کو شیعہ حضرات جائز خلیفہ نہیں مانتے۔ یعنی ان کے نام تھے ——— ابوبکر بن علی، عمر بن علی، اور عثمان بن علی۔

اپنی پسند کے ناموں کو تاریخ میں شامل کرنا اور جو نام پسند نہ ہوں ان کو تاریخ سے حذف کر دینا صرف شیعہ حضرات کا جرم نہیں ہے۔ اس میں سُنّی حضرات بھی یکساں طور پر شریک ہیں۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے سنّی حضرات تو اس میں اتنا زیادہ مبتلا ہیں کہ شاید ہی کوئی مثال اس کے خلاف مل سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت و قیادت کو دیکھیے۔ وہ واضح طور پر اسی صورت حال کی مثال ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام ہر جگہ شامل کرتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کی تشہیر کرتے ہیں مگر جو ان کے مبغوض نام ہیں ان کو اس طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ایسا کرنا حقیقت کو قتل کرنا ہے۔ اور حقیقت کا قتل بلاشبہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ جس چیز کو ایمان کہتے ہیں وہ حقیقت واقعہ کے اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے خدا کی عظمت کو مان لے۔ انسان کی یہی وہ اعلیٰ ترین صفت ہے جس کو نفسیات کی زبان میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کہا جاتا ہے۔ جنّت کی لطیف دنیا میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو اس اعلیٰ خصوصیت کا ثبوت دیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حقیقت واقعہ کو چھپائیں یا اس کا اقرار نہ کریں وہ جنّت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے نااہل ٹھہریں گے۔

نصیحت

امام عبدالرحمٰن اوزاعی (۱۵۷ - ۸۸ ھ) بہت بڑے عالم تھے۔ مگر وہ اکثر چپ رہتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ مومن کم بولتا ہے اور زیادہ عمل کرتا ہے اور منافق زیادہ بولتا ہے اور کم عمل کرتا ہے (ان المومن یقول قلیلا ویعمل کثیرا وان المنافق یقول کثیرا ویعمل قلیلا)

وہ ظواہر دین کے مقابلہ میں حقیقت دین پر زور دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ عدل کی ایک ساعت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے (ساعة عدل خير من عبادة الف شهر)

امام اوزاعی کے ایک شاگرد ابوالفضل بن الولید بن مزید نے اپنے استاد کے بارہ میں اپنا تجربہ ان الفاظ میں بتایا ہے:

من نظر فی کتب الاوزاعی یظن انه کان صاحب کلام۔ وما رأیت قط رجلا اطول منه سکوتاً (الشیخ طه الولی، عبدالرحمٰن الاوزاعی، بیروت ۱۹۶۸، صفحہ ۶۷)

جو شخص امام اوزاعی کی کتابوں کو دیکھے گا وہ گمان کرے گا کہ وہ بڑے بولنے والے تھے۔ حالاں کہ ان سے زیادہ دیر تک چپ رہنے والا میں نے کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے امام اوزاعی کو بلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ خلیفہ کو نصیحت کریں۔ اس موقع پر امام اوزاعی نے نصیحت کے جو کلمات کہے ان میں سے ایک فقرہ یہ تھا:

یا امیر المومنین، تدری ما جاء فی تاویل هذه الآیة عن جدك (مال هذا الكتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها) قال الصغیرة التبسم والکبیرة الضحك۔ فکیف بما عملته الایدی وحصدته الالسن (صفحہ ۷۴)

اے امیر المومنین کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس آیت کے بارہ میں آپ کے دادا عبداللہ ابن عباس نے کیا کہا ہے (کیسی عجیب ہے یہ کتاب جس نے چھوٹی بڑی ہر چیز لکھی ہے)، انھوں نے کہا ہے کہ صغیرہ سے مراد مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے۔ پھر ان اعمال کا کیا ذکر جو ہاتھ کریں اور جو زبان سے صادر ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا مطلب یہ تھا کہ ہنسنا اور مسکرانا جن کو تم بالکل معمولی چیز سمجھتے ہو وہ بھی تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جارہا ہے پھر دوسرے زیادہ بڑے اعمال کا کیا ذکر۔

پکار پر دوڑنے والے

مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کر لیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اور اس کے آس پاس کا کچھ علاقہ اب بھی اس کے قبضہ میں تھا اور یہاں اس کی بقیہ سلطنت کا مرکز قائم تھا۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں قسطنطنیہ کا رومی بادشاہ توفیل بن میخائیل تھا۔ ۲۲۳ھ میں وہ ایک عظیم لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہنچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے قلعہ پر حملہ کیا۔ یہاں اس وقت زیادہ فوج موجود نہ تھی ان حملوں میں اس نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو قتل کیا، انھیں گرفتار کیا اور بہت سے لوگوں کا مثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ شاہ روم کے سپاہیوں نے ایک عرب عورت کو پکڑا تو وہ پکاری وامعتصماہ (ہائے معتصم) یہ خبر بغداد میں خلیفہ معتصم عباسی کو پہنچی تو وہ تڑپ اٹھا۔ وہ اس وقت اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ فوراً ہی لبیک لبیک کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النفیر النفیر (کوچ کوچ)

اس کے بعد معتصم اپنی فوج کو لے کر روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (ترکی) میں پہنچا عموریہ اس وقت رومیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ معتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ ان پر منجنیق کے ذریعہ گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ قلعہ کی دیواریں ٹوٹ گئیں اور معتصم مع اپنی فوج کے قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اب رومیوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ چنانچہ انھوں نے ہتھیار ڈال دئے معتصم نے اپنے تمام قیدیوں کو چھڑایا۔ اور اس عورت کو بھی قید سے آزاد کرایا جس نے رمیوں کے حملہ کے وقت وامعتصماہ کہہ کر آواز لگائی تھی۔

جب کرتب بازی کو کمال سمجھا جانے لگے

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک شخص آیا اور کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنا ایک کرتب دکھاؤں۔ ہارون رشید نے اجازت دے دی۔ آدمی نے اس کے بعد اپنی جھولی سے بارہ بڑی بڑی سوئیاں نکالیں۔ اس نے ایک سوئی کو ہاتھ میں لے کر پھینکا تو وہ ایک فاصلہ پر جاکر کھڑی صورت میں زمین پر گڑ گئی۔ اب اس نے دوسری سوئی پھینکی تو وہ پہلی سوئی کے سوراخ میں جاکر اٹک گئی۔ پھر اس نے تیسری سوئی پھینکی تو وہ دوسری سوئی کے سوراخ میں پیوست ہوگئی۔ اسی طرح وہ ایک ایک سوئی پھینکتا گیا اور ہر سوئی اپنے سے پہلے والی سوئی کے سوراخ میں داخل ہوتی چلی گئی، اور بالآخر بارہ سوئیوں کا ایک جال بن گیا۔ ہارون رشید حیرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر میں اس نے دس درہم ہاتھ میں لے کر آدمی کی طرف پھینکے اور کہا خذ ھذا اف لک (اس کو لے، تجھ پر افسوس ہے) کاش تو نے کسی مفید کام میں یہ مہارت پیدا کی ہوتی۔

جب مسلمان زندہ تھے تو ان کو معلوم تھا کہ کرتب بازی میں اور ایک حقیقی کام میں کیا فرق ہے — مگر آج انھیں مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ اس فرق سے بے خبر ہوکر کرتب بازی پر وہ داد دے رہے ہیں جو صرف حقیقی عمل پر دی جانی چاہئے۔ قافیہ میں قافیہ ملانے والے شاعر، الفاظ کا گلدستہ بنانے والے مقرر، سیاسی شوشوں سے قوم کا مستقبل برآمد کرنے والے قائد، سب اسی قسم کے کرتب باز ہیں جیسے ہارون رشید کے زمانہ کا مذکورہ شخص۔ مگر ہارون رشید نے اپنے زمانہ کے کرتب باز سے کہا تھا کہ تیرا برا ہو۔ جب کہ آج کے کرتب بازوں کو شاندار خطابات مل رہے ہیں اور ہر طرف ان کے استقبالیہ جلسوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے کرتب بازوں کی فہرست میں سب سے آگے وہ انقلابی قائدین ہیں جو تقریروں کے ذریعہ ہر روز شاندار محل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ ہارون کے زمانہ کے آدمی نے اگر سوئیوں کا کھیل دکھایا تھا تو یہ لفظوں کے کھیل دکھا رہے ہیں۔ ایک قائد ایک "عظیم اسلامی اجتماع" میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریر کو اس جملہ پر ختم کیا — "مسلم نوجوانوں کو میرا پیغام ہے کہ کفر کے چراغ کو جہاں پاؤ بجھا دو"

اس قسم کی مجاہدانہ تقریریں آج ساری مسلم دنیا میں گونج رہی ہیں۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو انتہائی جذباتی بنا دیا ہے مگر "کافر اقوام" پر ان کا بس نہیں چلتا۔ کیوں کہ ان قوموں نے طاقت کے تمام اسباب جمع کرکے اپنے کو انتہائی طاقت ور بنا لیا ہے اور مسلمان ان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بے حد پیچھے ہیں۔ تاہم لوگوں کے بڑھے ہوئے جوش جہاد کو کوئی نشانہ درکار تھا۔ چنانچہ اب ہر ایک نے خود اپنے مسلم بھائیوں میں "کفر کے چراغ" دریافت کر لئے ہیں اور ہر ایک ان کو بجھانے میں مشغول ہے۔ کہیں یہ جہاد گولیوں کی بوچھار کے ذریعہ جاری ہے اور جہاں اس کے مواقع نہیں ہیں وہاں اس سے کمتر کسی کارروائی کی صورت میں۔ کفر کا چراغ بجھانے کا نعرہ عملاً اسلام کا چراغ بجھانے کے ہم معنی بن گیا ہے۔ کہیں تو جیں خود اپنے ملک پر چڑھائی کرکے فتح کے جھنڈے لہرا رہی ہیں۔ کہیں قائدین خود اپنے مسلمان سیاسی حریفوں کو قتل کرکے مجاہد کا لقب لے رہے ہیں۔ کہیں کوئی جماعت خود اپنے بھائی کو جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا کر باطل کو مٹانے کا کارنامہ انجام دے رہی ہے۔

بڑھیا کی دلیری

عباسی خلیفہ مامون الرشید (۲۱۸ - ۱۰۷ھ) اپنے سیاسی مخالفین کے لئے نہایت بے رحم تھا مگر عام لوگوں کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں بغداد کی ایک بوڑھی عورت آئی۔ اس نے خلیفہ مامون سے شکایت کی کہ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس ایک زمین تھی جس کو ایک ظالم نے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے کتنی ہی فریاد کی مگر اس نے نہیں سنا۔ میری دادرسی کی جائے۔ مامون نے پوچھا: وہ کون ظالم ہے جس نے تمھارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، بڑھیا نے اشارہ سے بتایا کہ وہ وہی ہے جو اس وقت آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ مامون نے دیکھا تو وہ اس کا لڑکا عباس تھا۔ مامون نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ کو پکڑ کر اٹھائے اور اس کو لے جا کر بڑھیا کے برابر کھڑا کردے۔ وزیر نے ایسا ہی کیا۔ اب مامون نے حکم دیا کہ دونوں اپنا اپنا بیان دیں۔

شہزادہ عباس رک رک کر آہستہ آواز میں بولتا تھا۔ لیکن بڑھیا بلند آواز میں بول رہی تھی۔ وزیر نے بڑھیا کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ آہستہ بولو، خلیفہ کے سامنے زور زور سے بولنا آداب کے خلاف ہے۔ مامون نے اپنے وزیر کو روکا اور کہا: اس کو آزاد چھوڑ دو، جس طرح چاہے اسے کہنے دو۔ سچائی نے بڑھیا کی زبان تیز کر دی ہے اور شہزادہ کو اس کے جھوٹ نے گونگا بنا دیا ہے۔ بڑھیا کا دعویٰ صحیح تھا۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ بڑھیا کے حق میں ہوا اور اس کی زمین شہزادہ سے لے کر اس کو واپس کر دی گئی (عقد الفرید جلد اول)

سچائی اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ سچائی پر ہونے کا احساس آدمی کو دلیر بنا دیتا ہے۔ سچا آدمی بے دھڑک ہو کر بولتا ہے۔ سچے آدمی کا بیان تضاد اور تصنع سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔ سچا آدمی بولتا ہے تو اس کے چہرے پر احساس جرم کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس کی آواز جھجک سے خالی ہوتی ہے۔ اس بنا پر سچے آدمی کی آواز میں قوت آجاتی ہے۔ وہ سننے والے کو مفتوح کر لیتی ہے۔

اس کے برعکس جس آدمی کا معاملہ جھوٹ پر مبنی ہو وہ کبھی قوت کے ساتھ نہیں بول سکتا۔ وہ ہمیشہ احساس جرم میں مبتلا رہتا ہے جس کا اثر اس کے لہجہ پر آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ وہ بے یقینی کے ساتھ بول رہا ہے۔ جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش میں اس کے بیان کے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان رکھنے کے باوجود وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔

اچھا گمان رکھئے

خلیفہ منصور عباسی وہ شخص ہے جس نے بغداد کا شہر بنایا۔ عباسی دور میں بغداد کو اتنی ترقی ہوئی کہ وہ دنیا کا سب سے عظیم شہر بن گیا۔

بغداد جیسے ایک شہر کی تعمیر بڑا مہنگا منصوبہ تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد خلیفہ منصور کو اس کے اخراجات بہت گراں گزرنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس کے ایک درباری ابوایوب موریانی نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ کسریٰ کے محل جو بغداد سے کچھ فاصلہ پر ہیں ان کو توڑ دیا جائے اور ان کا اینٹ پتھر بغداد کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

خلیفہ منصور کے وزیر خالد بن برمک کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ "امیر المومنین، ایسا نہ کیجئے۔ کسریٰ کے محل اسلام کی فتح کی نشانی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہماری نسلوں کے اندر اسلام کی عظمت کا یقین بڑھتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کو توڑنے کا جو خرچ ہے وہ اس سے حاصل ہونے والے فائدے سے زیادہ ہے"۔ مگر خلیفہ منصور نے خالد بن برمک کی رائے کی پروا نہیں کی۔ اس نے کہا "تم کسریٰ کے محل کو توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہے ہو کہ تمھارے اندر ابھی تک عجمیت کا تعصب پایا جاتا ہے"۔ خالد بن برمک عجمی (ایرانی) تھا، خلیفہ منصور نے اس کی رائے کو اس کے ایرانی النسل ہونے کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا کہ وہ کسریٰ کا محل توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ کسریٰ کی عظمت کا نشان باقی رہے۔

خلیفہ منصور نے کسریٰ کے محل کو توڑنے کا حکم دے دیا۔ مزدوروں اور کارکنوں کی ایک فوج اس کام پر لگ گئی کہ وہ محل کو توڑے اور اس کے پتھروں کو گدھوں اور خچروں پر لاد کر بغداد لے آئے۔ مگر بہت جلد منصور کو اندازہ ہوا کہ اس طرح جتنا عمارتی سامان ملتا ہے اس سے زیادہ اس کے اوپر خرچ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے درمیان ہی میں اس کام کو روک دیا۔

کسی کے مشورہ کو مشورہ کی حیثیت سے دیکھئے، اس کو بدنیتی پر محمول نہ کیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا قیاس غلط ہو اور مشورہ دینے والے نے واقعی وہ مشورہ دیا ہو جو آپ کے لئے سب سے بہتر اور مفید ہے۔

تیسرا باب

زندگی کی کامیاب منصوبہ بندی کے لئے
تاریخ سے بہتر کوئی رہنما نہیں۔

عصری تقاضے

عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کا زمانۂ حکومت ۱۸۷۶ سے ۱۹۰۹ تک ہے۔ اس نے ترکی میں ریفارم لانے کی کوشش کی۔ اس نے تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ تاہم بعض اسباب سے ملک میں اس کی شدید مخالفت ہوئی اور اس کو تخت سے معزول کر دیا گیا۔

قدیم زمانہ میں ترکی اپنے عظیم بحری بیڑے کے لیے مشہور تھا۔ مگر جب یورپ میں بھاپ کی طاقت دریافت ہوگئی اور بحری جہازوں کو اسٹیم انجن کے ذریعہ چلانے کا دور آیا تو ترکی اس میدان میں بہت پیچھے ہوگیا۔ مزید یہ کہ اس کا پچھڑا پن اس نوبت کو پہنچا کہ نئے طرز کی دخانی کشتیوں کو حاصل کرنا اور ان کو استعمال کرنا بھی ایک خطرناک فعل سمجھا جانے لگا۔

سلطان عبدالحمید ثانی پہلا شخص تھا جس نے بھاپ کی طاقت سے چلنے والا بحری بیڑہ (اُسطول) تیار کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ جب دخانی کشتیاں تیار ہوگئیں تو اس کے بعد وقت کے ترک علمار نے اصرار کیا کہ اس کو استعمال کرنے سے پہلے اس پر بخاری شریف کا ختم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کشتیوں کو سمندروں میں داخل کرنا ان کے نزدیک مخدوش تھا۔ علمار کا اصرار جب بہت بڑھا تو بعض ترک افسروں نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ بحری بیڑا بخار (بھاپ) سے چلتا ہے نہ کہ بخاری سے (إنَّ الأُسطُولَ یسیرُ بالبخارِ لا بالبخاری)

بحری بیڑہ جیسے معاملات میں علمار کا دخل دینا بجائے خود جائز تھا۔ مگر علمار کو جاننا چاہیے تھا کہ اس کے لیے انھیں سب سے پہلے جدید تقاضوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔ جدید دور کو سمجھے بغیر جدید معاملات میں دخل دینا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے علمار نے ہر جگہ یہی نادانی کی ہے۔ ترکی سے لے کر عرب تک اور ہند سے لے کر روس تک ہر جگہ اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے علمار نے دورِ جدید کا کوئی مطالعہ نہیں کیا۔ وہ عصری تقاضوں سے بالکل بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں ان پر فرض تھا کہ وہ مسجد اور مدرسہ کے دائرہ میں اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ مگر وہ اپنی حد پر نہیں رکے۔ ان کی نادانی کی چھلانگوں نے موجودہ زمانہ میں ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

خود شکن بنئے

سبکتگین ایک ترکی غلام تھا، سامانی (ایرانی) حکمرانوں نے اس کو غزنہ (افغانستان) کا گورنر بنایا۔ بعد کو حالات سے فائدہ اٹھا کر اس علاقہ میں اس نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ وہ ۹۷۷ء سے لے کر ۹۹۷ء تک اس غزنوی سلطنت کا حکمراں رہا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اس سلطنت کا حکمراں بنا جو محمود غزنوی (۱۰۳۰–۹۷۱) کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ۱۰۲۴ء میں پہلی بار سومناتھ (گجرات) پر حملہ کیا۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں شیو کا مندر ہے اور اس کے اندر بڑی مقدار میں سونا موجود ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مندر کو توڑ کر اس کا سونا حاصل کرے۔

اس سے پہلے ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے پشاور کے قریب راجہ جیپال کا مقابلہ کیا تھا۔ اس وقت محمود غزنوی کے پاس صرف پندرہ ہزار فوجی تھے۔ اس کے مقابلہ میں راجہ جیپال کے فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، حتی کہ اس کے پاس ۳۰۰ ہاتھی بھی تھے۔ مگر محمود غزنوی نے اس مقابلہ میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اوپر اس کا ایک فوجی رعب قائم ہوگیا۔

چنانچہ محمود غزنوی جب اپنے لشکر کو لے کر سومناتھ پہنچا تو یہاں کے پنڈتوں نے اس سے مل کر یہ پیش کش کی کہ آپ ہمارے مندر کو نہ توڑیں۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو بڑی مقدار میں سونا، چاندی پیش کر دیں گے۔ محمود غزنوی نے اس کے جواب میں کہا: من بت شکنم نہ بت فروش۔ یعنی میں بت کو توڑنے والا ہوں نہ کہ بت کو بیچنے والا۔

محمود غزنوی نے اپنے آپ کو اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مگر اس کے اس فعل کا کوئی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بت شکنی اسلام کا کوئی اصول نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خود شکن بناتا ہے نہ کہ بت شکن۔ اور کسی مندر کا یا کسی بھی ادارہ کا خزانہ لوٹنا تو اس سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ وہ سراسر حرام ہے۔

خود شکن بننا یہ ہے کہ آدمی خواہش کے پیچھے نہ چلے بلکہ اصولِ حق کا اتباع کرے۔ وہ کبر کی نفسیات سے اوپر اٹھے اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ ذاتی مفاد کے بجائے انصاف کو اہمیت دے۔ وہ خود پرست کے بجائے خدا پرست بن جائے۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (صفر ۱۴۱۴ھ) میں کرسٹوفر کولمبس (۱۵۰۶-۱۴۵۱ء) کے بارہ میں ایک تحقیقی مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: لماذا أخطأ کولمبس (کولمبس نے کیوں غلطی کی؟) اس کے لکھنے والے دکتور مظفر صلاح الدین شعبان ہیں۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے:

فی الفترة الممتدة من القرن الثامن و حتی القرن الثانی عشر کانت اللغة العربیة هی لغة العلوم لغالبیة الجنس البشری۔ و لهذا السبب فقد اعتبر کولمبس اللغة العربیة ام جمیع اللغات۔ وهذا یفسر سبب اصطحابه معه فی رحلته الاولی الاسبانی لویس دی تور الذی یتقن العربیة مترجما خاصا له (صفحہ ۳۰)	آٹھویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ میں عربی زبان ہی دنیا کے بیشتر لوگوں کی علمی زبان تھی۔ اور اسی بنا پر کولمبس نے عربی زبان کو تمام زبانوں کی ماں قرار دیا اور اسی سے اِس کا سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنے پہلے سفر میں ایک اسپینی لوئی دی تور کو خصوصی مترجم کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا جو کہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھا۔

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس طرح آیا ہے ـــــ کولمبس چوں کہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جہاں جا رہا ہے وہاں اس کو وحشی لوگ ملیں گے یا مہذب لوگ، اس نے اپنے جہازوں پر سستے اور معمولی سامان لادلیے تاکہ وہ وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کا سونا حاصل کر سکے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایک شخص لوئی دی تور کو اپنے جہاز میں بٹھایا جو کہ ایک یہودی تھا اور وہ عبرانی اور کلدانی کے علاوہ کچھ عربی زبان بھی جانتا تھا، اس ضرورت کے پیش نظر کہ وہاں "عظیم خان" سے اس کی ملاقات پیش آجائے:

> As Columbus did not know whether he was to come across new savages or old civilizations, he loaded his ships with cheap merchandise to relieve aboriginals of their gold, but also took on board one Luis de Torres — "who had been a Jew and knew Hebrew and Chaldeand a little Arabic" — in case he met the "grand khan". (4/938)

یہ اس دور کی بات ہے جو پانچ سو سال پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عربی زبان کا وہی مقام تھا جو آج انگریزی زبان کا مقام ہے۔ اس وقت عربوں کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج اہل مغرب کو حاصل ہے۔ اس وقت عالمی واقعات کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی جس طرح آج وہ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ تبدیلی کسی سازش کی بنا پر پیش نہیں آئی۔ بلکہ تمام تر فطرت کے قانون کے تحت پیش آئی۔ اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ جس کو جو کچھ ملے گا استعداد کی بنا پر ملے گا اور جس سے جو کچھ چھنے گا بے استعدادی کی بنا پر چھن جائے گا۔ اس دنیا میں جو لوگ محروم رہ جائیں انھیں دوسروں کی سازش یا تعدی کا انکشاف کرنے کے بجائے اپنی بے استعدادی کو ختم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر وہ کچھ پائیں گے تو اپنی بے استعدادی کو ختم کر کے ہی پائیں گے۔ شکایت اور احتجاج کی بنیاد پر یہاں انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے کسی خاص نسل یا کسی خاص گروہ کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں کسی ایک انسان کا جو حق ہے وہی دوسرے تمام انسانوں کا حق بھی ہے۔ یہاں کوئی چیز صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو فی الواقع اس کے حق دار ہوں۔

حق دار کون ہے۔ قرآن کے مطابق، حق دار وہ ہے جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہو۔ قرآن میں فطرت کا ایک مستقل اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے (وامّا ماینفع الناس فیمکث فی الارض) :

and that which is for the good of mankind remains on the earth

یہی اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ابدی قانون ہے۔ یہاں قیام و استحکام صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جو دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو۔ کسی قوم کی زبان ہو یا اس کی حکومت، کسی قوم کا کلچر ہو یا اس کی اقتصادیات، کسی بھی چیز کو صرف اس وقت تک زمین کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل ہوگی جب کہ اس میں دوسروں کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ نفع بخشی کی صلاحیت کھوتے ہی وہ اپنا غالب مقام بھی کھو دے گی۔

بلند کرداری

ہندستان میں مسلمان بادشاہ بھی آئے اور مسلمان صوفی بھی۔ مگر ہندستان کی غیر مسلم قوموں نے بادشاہوں کو اپنا رقیب سمجھا اور صوفیوں کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے بادشاہوں سے لڑائیاں کیں مگر صوفیوں کے آگے وہ عقیدت سے جھک گئے۔ حتی کہ ان میں سے لاکھوں لوگوں نے ان کے مذہب (اسلام) کو قبول کر لیا۔ آج بھی ہندستان کے لوگ مسلم صوفیوں کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ان کے مزاروں اور درگاہوں پر حاضری دینے والوں میں ان کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب کہ مسلمان بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم بادشاہ ان کو اپنی سطح پر نظر آتے تھے اور مسلم صوفی اپنے سے اونچی سطح پر۔ لوگوں نے دیکھا کہ جس طرح وہ دولت کے حریص ہیں اسی طرح مسلم بادشاہ بھی دولت کے حریص ہیں۔ لوگ اقتدار کے لئے لڑتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اقتدار کے لئے لڑتے ہیں۔ لوگ اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں۔ لوگ دوسروں کو لوٹتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی دوسروں کو لوٹتے ہیں۔ مسلم بادشاہ لوگوں کو اسی عام سطح پر نظر آئے جہاں وہ خود تھے۔ ایسی حالت میں مسلم بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی اعلیٰ جذبہ ابھرتا تو کیسے ابھرتا۔

مگر مسلم صوفیوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ انھیں دولت کی تمنا نہ تھی وہ اپنی فقیری میں مگن تھے۔ اقتدار کو چاہنا تو درکنار وہ اقتدار سے دور بھاگنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی خواہش کو معبود نہیں بنایا تھا۔ بلکہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ سخت قسم کی نفسیاتی ورزشیں کرتے تھے تاکہ اپنی خواہش کے شیطان کو زیر کر سکیں۔ وہ دوسروں سے صرف محبت کرنا جانتے تھے۔ ان کے یہاں نفرت کا کوئی گزر نہ تھا۔

ان صوفیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے لئے بھی ان کے پاس جو چیز تھی وہ دعا اور خیر خواہی تھی نہ کہ نفرت اور انتقام۔ ایک صوفی کو ایک شخص نے ایک بار پتھر مارا۔ صوفی کو چوٹ لگی مگر وہ غصہ نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھ کر اس آدمی کو سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے پوچھا کہ آپ نے مجھ کو سینے سے کیوں لگایا جبکہ میں نے آپ کو مارا تھا۔ صوفی نے جواب دیا کہ تمہارے اندر ایک برائی ہے اس لئے تم سب سے زیادہ اس کے مستحق ہو کہ تم کو سینے سے لگایا جائے۔ اس واقعہ کے بعد اس شخص نے توبہ کر لی اور صوفی کا مرید ہو گیا۔

ذمہ دار کون

انیسویں صدی کے وسط کا واقعہ ہے۔ فرانس کے ایک مسیحی مسٹر لیون روش نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ امیر عبدالقادر الجزائری کے یہاں آیا اور امیر کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ اس کے بعد امیر عبدالقادر الجزائری نے اس کو قربت دی۔ اس کو اپنا مشیر خاص بنالیا۔ کئی مہمات میں اس کو بھیجا۔ اسی طرح اس کو جزیرہ عرب بھیجا جہاں اس نے حج ادا کیا۔

لیون روش کی شادی الجزائر کی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی۔ دونوں تقریباً ۱۰ سال تک ایک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ فرانس کی فوجیں الجزائر میں داخل ہوگئیں۔ جنگ کے بعد بالآخر فرانس کو امیر عبدالقادر الجزائری پر فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کے بعد لیون روش فرانسیسی جنرل الدوک دوماں سے مل گیا اور کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ میں نے اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ مسیحیت اختیار کر لی ہے۔

یہ واقعہ لیون روش کی مسلمان بیوی کے لئے بہت اندوہناک تھا۔ اس نے کہا کہ اسلام نے اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کر دی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تیرے جیسا سانپ زندہ رہے اور لوگ مجھ کو تیری وجہ سے غیرت دلائیں۔ چنانچہ اس نے خنجر لے کر لیون کو قتل کر ڈالا (الثقافۃ العربیۃ، طرابلس دسمبر ۱۹۸۲)

اس طرح کے ارتداد کے واقعات کو عام طور پر اس معنی میں لیا جاتا ہے کہ متعلقہ شخص محض منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اور اپنا کام پورا کرکے اسلام سے نکل گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی ہوں۔ مگر اس نظریہ کو ارتداد کے تمام واقعات پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر وہ ہیں جو کسی تبلیغی جدوجہد کے نتیجہ میں مسلمان نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ میں نے بہت سے نومسلموں سے بات کرکے یہ اندازہ کیا ہے کہ ان کے اسلام کا سبب کوئی گہرا فکری انقلاب نہیں ہوتا۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے مذہب کے معاملہ میں متشدد اور متحمس نہیں ہوتے۔ وہ کسی وقتی اور معمولی پسندیدگی کی بنا پر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اب اگر ان کو خوش قسمتی سے موافق حالات مل گئے تو وہ دھیرے دھیرے اسلام میں پختہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا ابتدائی معمولی

تاثر بالآخر گہرے اسلامی تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر جن کو اسلام کے بعد اچھے حالات نہ ملیں ان کا اسلام کمزور ہوتا رہتا ہے۔ وہ ان کے شعور کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے کمزور اسلام کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں اور کچھ لوگ دوبارہ اپنے سابق معاشرہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ وہ جس طرح ایک معمولی سبب کے پیش آنے سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اسی طرح دوسرا معمولی سبب پیش آنے سے اسلام کے باہر چلے جاتے ہیں۔

ایک نومسلم کا مسلم معاشرہ میں جذب ہونا مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے، مگر مسلم معاشرہ یہاں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نومسلم اپنے نئے ہم مذہبوں کے درمیان ایک قسم کا اجنبی بن جاتا ہے۔ یہ اجنبیت کبھی کبھی اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ صورت اختیار کرلیتی ہے جس کو ہم "ارتداد" کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ارتداد کے اکثر واقعات دشمنان اسلام کی "سازش" سے زیادہ مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ یہ غفلت خاص طور پر تین قسم کی ہے۔

۱۔ دعوت و تبلیغ کا کام ہمارے یہاں اس نہج پر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر گہرا فکری انقلاب پیدا کرے۔ آدمی شعوری تبدیلی کے بغیر کسی سطحی یا عارضی سبب سے اسلام قبول کرلیتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا اسلام بہت زیادہ دیر پا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ ایک نومسلم جب اسلام قبول کرتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف معاشرہ سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اسلام میں پختہ کرنے کے لئے اس کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ مگر مسلمانوں کے یہاں ایسے لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یہ تربیت تمام تر مسلمانوں کی ذمہ داری ہے مگر اس کے لئے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا مسئلہ معاشرہ کا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد نومسلم ایک طرف اپنے معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف مسلم معاشرہ بھی اس کو بھرپور طور پر قبول نہیں کرتا۔ یہ دو طرفہ اجنبیت اس مخلوق کے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہے جس کی تعریف سماجی حیوان Social Animal سے کی گئی ہے۔

اس طرح کے مختلف اسباب اکثر نومسلموں کے اندر چھپی ہوئی بے چینی بن کر موجود رہتے ہیں، وہ مسلسل عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں اور کوئی بڑا واقعہ پیش آنے کی صورت میں اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

تاریخ سبق دیتی ہے

آٹومین لینڈر (۱۹۸۰-۱۸۹۵) ایک یہودی سائنس داں تھا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ ہٹلر کے وی ٹو راکٹ (V-2 Rocket) کے منصوبہ میں کام کر رہا تھا۔ ہٹلر کے زمانہ میں جرمنی میں پہلی بار یہ راکٹ تیار کئے گئے۔ ان راکٹوں نے لندن میں زبردست دہشت پھیلا دی تھی۔ ہٹلر نے جب اپنے ملک کے یہودیوں کے خلاف ظلم و زیادتی شروع کی تو آٹومین لینڈر (Otto Mainlander) اور دوسرے یہودی سائنس داں ہٹلر سے سخت برہم ہو گئے۔

اس برہمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹومین لینڈر اور تقریباً ایک درجن یہودی سائنس داں جو ہٹلر کے راکٹ کے منصوبہ میں کام کر رہے تھے، وہ ضروری سامان اور فنی راز لے کر بھاگ گئے اور ان کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ امریکہ میں بھی راکٹ کی سائنس پر ابتدائی تجربات ہو رہے تھے۔ جرمنی کے یہودی ماہرین کی مدد حاصل ہونے کے بعد اس تحقیق میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ چنانچہ امریکہ نے راکٹ تیار کر کے جرمن علاقوں پر اتنی تیزی سے حملے کئے کہ ہٹلر کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ انھیں جرمن یہودیوں کی مدد سے امریکہ نے وہ ایٹم بم تیار کئے جو ۱۹۴۵ میں جاپان پر گرائے گئے اور جس کے بعد دوسری جنگ عظیم کا فیصلہ اتحادیوں کے حق میں ہو گیا (۲۱ جنوری ۱۹۸۰)

تاریخ میں اس طرح کے واقعات بار بار ہوئے ہیں کسی شخص یا گروہ کے زوال کا سبب اکثر اس کے وہ اپنے لوگ ہوتے ہیں جن کو وہ شخص یا گروہ اپنی آمرانہ پالیسی کی بنا پر ناراض کر دیتا ہے۔ یہ ناراض لوگ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں اور "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت اس کے دشمنوں سے مل جاتے ہیں۔ اپنوں کے اس تعاون سے دشمن کو غیر معمولی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ اپنے حریف کے خلاف زیادہ مؤثر اقدام کر سکے۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے حریف کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ حریف کے ساتھیوں کی مدد اس کے لئے اس مہم کو آسان کر دیتی ہے جو تنہا اپنی قوت سے اس کے لئے مشکل بنی ہوئی تھی۔ یہ بات ایک خاندان کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک حکومت کے لئے بھی اور اسی طرح ایک پوری قوم کے لئے بھی۔

اپنوں کا ٹوٹ کر حریف سے ملنا بہت سے پہلوؤں سے نہایت خطرناک ہے۔ اس کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ حریف کو اپنے دشمن کے راز معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے کمزور پہلوؤں کو جان کر اس کے مطابق اپنا منصوبہ بناتا ہے اور ٹھیک اس مقام پر وار کرتا ہے جہاں اس کا حریف سب سے کم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں نے "ظالمانہ نظام" کو ختم کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مگر یہی تحریکیں "عادلانہ نظام" کو قائم کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا حقیقت کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک ظالمانہ نظام کو توڑنے کے لئے صرف ظلم دشمنوں کی فوج مل جانا کافی ہے اور وہ ذاتی اسباب کے تحت بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔ مگر عادلانہ نظام کو قائم کرنے کے لئے عدل دوستوں کی ضرورت ہے اور حقیقی معنوں میں عدل دوست اتنے کم ہیں کہ صرف امکان ہی کے درجہ میں ان کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشترک دشمنی کی بنیاد پر قائم ہونے والا اتحاد مشترک دوستی کی بنیاد نہ پا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ نفرت اور بغض کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک محبت کی فضا پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ظلم دشمنی کی بنیاد پر اٹھنے والی بھیڑ عدل دوستی کا نظام قائم نہیں کر سکتی

کتنا فرق

سترھویں صدی میں جب کہ مغربی قومیں ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں، ان سے پہلے ان کے سیاح کثرت سے اِن ملکوں میں آئے۔ انھوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں، لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ لمبی لمبی مدت تک یہاں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہاں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے کتابیں لکھیں اور اپنی حکومتوں اور اپنی قوموں کو یہاں کے حالات سے باخبر کیا۔

انھیں میں سے ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر (Bernier) ہے۔ وہ ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ طبیب تھا۔ اس کے طب نے اس کو موقع دیا کہ وہ جہاں جائے وہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان گھل مل کر رہ سکے۔ وہ اپنے اس فن کی وجہ سے اعلیٰ شخصیتوں تک رسائی کے قابل ہوگیا۔ برنیر ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۴۷ میں اس نے جرمنی، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ ۱۶۵۴ میں برنیر ایشیا کے لئے روانہ ہوا۔ چند سال تک شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں گھوما اور ۱۶۵۸ میں ہندستان میں سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ یہ شاہ جہاں کا آخری زمانہ تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی۔

برنیر ہندستان میں چودہ سال تک رہا۔ یہاں وہ سورت سے لے کر کشمیر تک بے شمار بستیوں میں گیا اور ہندستانی زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے پلوٹارک کے اس قول پر عمل کیا ہے کہ جزئی اور معمولی باتوں کو بھی ضرور جاننا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے وہ بڑی بڑی باتوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ ہندستان سے واپس ہوکر برنیر جب فرانس پہنچا تو اس نے فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے سامنے اپنا سفرنامہ ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا: دریائے سین سے نکل کر دجلہ، فرات، سندھ یا گنگا جہاں بھی میں پہنچا، فرانس اور اس کے شہنشاہ کے بارے میں لوگوں کی بہت اونچی رائے پائی۔

ہندستان کے شہروں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد برنیر نے لکھا: یہاں کے شہر اور قصبے خواہ اس وقت بظاہر خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا شہر کوئی نہیں جس میں جلد تباہ اور خراب ہوجانے کی علامتیں نہ پائی جاتی ہوں (۲۲۷) ہندستان کی اس وقت کی فوجوں کے بارے میں اس نے لکھا: جب میں ان بے ترتیب فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف ۲۵ ہزار تجربہ کار سپاہ، پرنس کونڈی یا مارشل تورین کی قیادت میں ہندستان کی فوج پر، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں

نہ ہو، غالب آسکتے ہیں (۵۵) برنیر نے اپنے تقریباً ۵۰۰ صفحات کے سفرنامہ میں لکھا کہ ہندستان میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جانشینی کے واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے کسی شہزادہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ یا تو خود تخت حاصل کرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس نے لکھا کہ شاہی امرار کا اعزاز موروثی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ایک مستقل طبقہ امرار وجود میں نہیں آپاتا۔ جب تک ایسا نہ ہوگا سیاسی نظام کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ وغیرہ

مغربی ملکوں کے سیاح جس زمانہ میں اپنی قوموں اور بادشاہوں کو اس قسم کی معلومات دے رہے تھے ٹھیک اسی زمانہ میں ہمارے یہاں کیا حال تھا۔ عین اس زمانہ میں لال قلعہ کے حکراں کو اس کے قصیدہ خواں شاہ جہاں کا خطاب دے رہے تھے اور اس کے ذہن پر یہ تصور بٹھا رہے تھے کہ جو ہندستان کا بادشاہ ہے وہی سارے عالم کا بادشاہ ہے۔ اورنگ زیب کے استاد ملا محمد صالح اپنے شاگرد شہزادہ کو یہ بتا رہے تھے کہ یورپ بس ایک چھوٹے سے جزیرے کے برابر ہے، فرانس اور اندلس کے بادشاہ ایسے ہی ہیں جیسے ہندستان کے چھوٹے چھوٹے راجہ۔ وہ اورنگ زیب کو ایسے فلسفہ اور منطق کا ماہر بنا رہے تھے جو جنگی تقابلوں طرز حکمرانی اور قوموں کے ترقی و تنزل کو سمجھنے میں کام آنا تو درکنار اس قابل بھی نہ تھا کہ وہ آدمی کے اندر ایسا ذہن بنائے جو دلیلِ صحیح کے بغیر کسی چیز کو تسلیم نہ کرے اور اپنے اور غیر کے بارے میں حقیقی بنیادوں پر رائے قائم کر سکے۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں تفصیل سے بتایا ہے کہ مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کتنے غیر حقیقی انداز میں دی جاتی ہے (۵۶)

یہ تین سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی صورت حال ہمارے یہاں زیادہ مختلف نہیں۔ آج جب کہ دوسری قوموں کے رہنما اپنی قوموں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہے ہیں، مسلم قائدین ہر جگہ مسلمانوں کو جذبات کی شراب پلانے میں مشغول ہیں۔ کوئی پر اسرار عملیات میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے کوئی شاعری اور خطابت میں۔ کوئی جلسہ جلوس میں ترقی کا راستہ دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں۔ کوئی تجویزوں اور بیانات کے ذریعہ ملت کی تعمیر کا یقین دلا رہا ہے اور کوئی دوروں اور تقریروں کے ذریعہ ——— ہمارے یہاں "ملا محمد صالح"، تو بے شمار ہیں۔ مگر "ڈاکٹر برنیر"، کوئی ایک بھی نہیں۔ پوری ملت ایسے افراد سے خالی نظر آتی ہے جو آج کی دنیا کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور خالص واقعاتی انداز میں وقت کے حقائق سے ملت کو باخبر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا محمد صالح بننے کے لئے تو صرف ابن الوقتی کا سرمایہ کافی ہے، جب کہ ڈاکٹر برنیر بننے کے لئے پُر مشقت عمل درکار ہے، اور اپنے کو مشقت میں ڈالنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

جدوجہد نام ہے اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کرنے کا

ہندستان میں مغربی قوموں کے لئے داخلہ کا راستہ سب سے پہلے واسکوڈی گاما (۱۵۲۴-۱۴۶۰) نے پیدا کیا۔ اس کے بعد پرتگالی اور فرانسیسی قومیں اس ملک کے ساحلی علاقوں میں داخل ہوئیں۔ آخر میں انگریز آئے اور ڈیڑھ سو برس کے اندر انھوں نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا۔ ہند، پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون، برما، تبت، نیپال، سب انگریز کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ ہندستان پر اپنے قبضہ کو دائمی بنانے کے لئے انھوں نے نہر سوئز پر قبضہ کیا اور اس کے بیشتر حصے مہنگی قیمت پر خرید لئے۔

انگریزوں نے نہ صرف ہندستان کی سیاست اور معیشت پر قبضہ کیا بلکہ یہاں کی سرکاری زبان بدل دی۔ تعلیمی نظام ایسا بنایا جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو لارڈ میکالے کے الفاظ میں "پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو"۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت کی مدد سے مسلح ہو کر پورے ملک کو عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ایک ایسی حکومت جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ "اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا" اپنے تمام وسائل اور تہذیبی طاقت کے ساتھ ملک کے اوپر چھا گئی اور اپنے اقتدار کو مستقل بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس مادی دنیا میں اور وہ بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی کر سکتا ہے۔

مگر اگست ۱۹۴۷ کا انقلاب بتاتا ہے کہ بات وہیں ختم نہیں ہو جاتی جہاں کوئی اپنے طور پر اسے ختم سمجھ لیتا ہے۔ کوئی قوم خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر دوسری قوم کے اوپر غالب آجائے، پھر بھی کچھ ایسے گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے جدوجہد کر کے دبی ہوئی قوم دوبارہ نئی زندگی حاصل کرے۔ پھر اس انقلاب ہی کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ کام محض جھنجھلاہٹ کے ساتھ سر ٹکرانے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور حریف کے اس نازک گوشہ کو تلاش کیا جائے جہاں سے مؤثر جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے —— خدا نے اپنی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر بار گرنے کے بعد اس کے بندوں کے لئے دوبارہ ابھرنے کا ایک نیا امکان باقی رہے۔ مگر یہ امکان اسی کے لئے واقعہ بنتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو اپنی خود ساختہ راہوں پر دوڑنا شروع کر دے، اس کے لئے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

گھڑی کی سوئی بظاہر جہاں سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ اس کا شیشہ ہے۔ لیکن گھڑی کی سوئی گھمانے کے لئے کوئی شخص اس کے شیشہ پر زور آزمائی نہیں کرتا بلکہ اس کی چابی پر اپنا ہاتھ لے جاتا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمارے تمام لیڈر "گھڑی" کے شیشہ پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ سوئی تو نہ گھومے البتہ غلط طریق عمل کی وجہ سے مسائل میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔

فساد کا ذمہ دار

منتخب التواریخ علامہ عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب ہے۔ موصوف شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ہیں۔ اور اس کے دربار میں رہے ہیں۔ وہ اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ تھا جو حق کا طالب تھا اور اپنے اندر نفیس جوہر رکھتا تھا (بادشاہے کہ جوہر نفیس داشت و طالب حق) اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں بڑا دیندار اور عبادت گزار تھا۔ اس نے سات عالم صرف نماز کی امامت کے لئے مقرر کر رکھے تھے جن میں ایک خود ملّا عبدالقادر بدایونی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر کے دربار میں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ہوتی تھی جس میں بادشاہ خود شریک ہوتا تھا (ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند) اکبر جب سفر کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے اس دیندارانہ مزاج کا یہ قدرتی نتیجہ ہوا کہ اس کے دربار میں علمار جمع ہونے لگے۔ اکبر کو حدیثیں سننے اور مسائل دین پر گفتگو کرنے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ علمار کی صحبتوں میں دیر دیر تک بیٹھتا تھا، ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ اکبر کے گرد جمع ہونے والے علمار کی تعداد ایک سو سے بھی اوپر تک پہنچ گئی تھی (جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلد از صد نفر متجاوز بودند) بادشاہ کے گرد جمع ہونے والے یہ علمار قدرتی طور پر بادشاہ کی عنایتوں میں حصہ پانے لگے۔ بس یہیں سے وہ حالات پیدا ہوئے جس نے ایک دیندار بادشاہ کو بے دین بنا ڈالا۔

ظاہر ہے کہ سو آدمی بیک وقت بادشاہ کے قریب نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ پہلا جھگڑا نشست گاہوں پر شروع ہوا۔ ہر ایک اس کوشش میں رہتا کہ وہ بادشاہ کے قریب بیٹھے۔ اب جس کو قریب جگہ نہ ملتی وہ جلن میں مبتلا ہوتا۔ اسی طرح بادشاہ کے انعامات میں جس کو کم حصہ ملتا وہ اس سے حسد کرنے لگتا جس کو اتفاق سے زیادہ انعام مل گیا ہو۔

علمار کا حال یہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو گرانے کے لئے ایک دوسرے کی برائیاں کرنے لگے۔ ملّا بدایونی کے الفاظ میں علمار کے گروہ سے بہت سی بیہودگی ظاہر ہوئی (بدنفسی ہا ازیں جماعت ظاہر شدند) ایک نے دوسرے کے خلاف زبان کی تلوار نکالی، ایک دوسرے کی نفی اور تردید میں لگ گیا۔ ان کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک نے دوسرے کو کافر بنایا، ایک نے دوسرے کو گمراہ ثابت کیا (ہر یک دیگر تیغ زبان کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہمدگر می نمودند) نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں ان علمار کی گردنوں کی رگیں پھول آئیں، آوازیں بلند ہوئیں اور زبردست شور برپا ہوا

(رگ گردن علمار زماں بر آمدہ آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد)

علمار کی ان نازیبا حرکتوں سے بادشاہ کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اس کو سخت گراں گزرا (برخاطر اشرف گراں آمد) اس کے بعد بادشاہ نے پہلی کارروائی یہ کی کہ ملا بدایونی کو حکم دیا کہ اس قسم کے نامعقول عالموں کو آئندہ بادشاہ کی مجلس میں آنے نہ دیں۔ اس کے باوجود علمار کی حرکتیں بند نہ ہوئیں۔ ان کی باتیں بادشاہ کے لئے ایمانی قوت کے بجائے بدگمانی اور برگشتگی میں اضافہ کا سبب بنتی رہیں۔ علمار کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی ضد میں کوئی عالم ایک چیز کو حرام کہتا اور دوسرا اس کو حلال بتاتا۔ ان چیزوں نے بادشاہ کو شک میں ڈال دیا۔ اس کی حیرانی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل مقصد ہی سامنے سے جاتا رہا (در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میاں رفت)

درباری علمار میں سے ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ ان کا سرکاری لقب مخدوم الملک تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے جو دولت جمع کی تھی اس کا حال ملا بدایونی نے ان الفاظ میں لکھا ہے " ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ کے حکم سے ان کے مکان کا جائزہ لیا گیا جو لاہور میں تھا۔ اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ممکن نہ تھا۔ حتٰی کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے برآمد ہوئے جنھیں مُردوں کے بہانے سے زمین میں دفن کیا گیا تھا۔"

شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ملا عبدالنبی تھے جو اکبر کے زمانہ کے سب کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ پورے ملک کے خطبار اور ائمہ کے درمیان جاگیر تقسیم کرنے کا انھیں اختیار تھا۔ شہنشاہ اکبر ان کا اتنا زیادہ احترام کرتا تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مگر مذکورہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کے درمیان رقیبانہ کشمکش شروع ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو جاہل اور گمراہ ثابت کرنے کے لئے رسالے لکھے۔ ایک نے دوسرے کی بابت لکھا کہ چونکہ انھیں بواسیر ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرے نے لکھا کہ تم اپنے باپ کے عاق کئے ہوئے بیٹے ہو اس لئے تمھارے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ اس قسم کی لایعنی بحثوں سے شاہی کیمپ صبح و شام گونجتا رہتا تھا۔

شہنشاہ اکبر ابتداءً نہایت دین دار تھا اور دینی شخصیتوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مگر دین کے نمائندوں کی خرافات کو مسلسل دیکھنے کے بعد وہ دین سے بھی بیزار ہوگیا اور دینی شخصیتوں سے بھی۔ علمار کا یہ حال تھا کہ جانوروں کی طرح آپس میں لڑتے۔ ایک عالم ایک فعل کو حرام بتاتا اور دوسرا عالم اسی فعل کو حلال قرار دیتا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں :

علمار عہد خویش را بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند۔ رکاکت ہائے ایشاں را دیدہ قیاس غائب بر شاہد	اکبر اپنے زمانہ کے علمار کو غزالی اور رازی سے بہتر سمجھتا تھا۔ جب اس نے ان کی پست حرکتوں کو دیکھا تو حال

کردہ سلف را نیز منکر شدند   پر ماضی کو قیاس کرکے سب کا منکر ہوگیا۔

اس کے بعد اکبر کے دربار میں علمار کا وقار ختم ہوگیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ دربار شاہی میں ہیبت اختیار کر گئے۔ اکبر کو علمار کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ ابوالفضل اکبر کے سامنے علمار کا مذاق اڑاتا اور اکبر اس کو سن کر خوش ہوتا۔ ملا بدایونی کے الفاظ میں: کسی بحث کے درمیان اگر ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں کفش دوز اور فلاں چرم ساز کے قول سے تم میرے اوپر حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔

حسد اور کبر یہودی علمار کا عام مرض تھا۔ یہی ہمارے علمار کا بھی سب سے زیادہ عام مرض بن گیا ہے۔

صحابہ کرام بھی دین کے عالم تھے۔ مگر ان کے درمیان حسد اور کبر کا وجود نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعد کے زمانہ کے علمار کے اندر یہ اخلاقی برائی اس قدر عمومی طور پر پیدا ہوگئی۔ اس کی وجہ خود علم کا فرق ہے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور تھا اور بعد کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور۔ صحابہ کرام کا نصاب تعلیم صرف قرآن و حدیث تھا، اس کے برعکس بعد کے زمانہ میں دینی نصاب کے نام سے جو تعلیمی نصاب رائج ہوا اس میں قرآن و حدیث برائے نام رہ گئے اور اصل اہمیت دوسرے فنون نے لے لی۔ اس فرق کا نتیجہ لازماً ظاہر ہونا تھا، کیونکہ قرآن و حدیث کے علم سے آدمی کے اندر خشیت پیدا ہوتی ہے (فاطر ۲۸) اور فنی علوم سے احساس برتری (غافر ۸۳)

علم کے ساتھ عام طور پر بڑائی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف خدا کا علم ہے۔ خدا کا علم ایک ایسا علم ہے جس میں آدمی مالک کائنات کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی علم آدمی کے اندر خاکساری پیدا کرتا ہے، جبکہ دوسرے علوم آدمی کے اندر عجب اور گھمنڈ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

خدائی علم ابتدائی زمانہ میں صرف خدا کی کتاب اور رسول کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو فنی بنانے کی کوشش شروع ہوجاتی ہے۔ فنی بنانے کی کوشش میں سادہ خدائی علم اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جو عام دنیوی علوم کی سطح ہے۔ مشکل اصطلاحیں، پیچیدہ اسلوب، منطقی ترتیب، دور از کار بحثیں وغیرہ مل کر دینی علم کو ایسی شکل دے دیتے ہیں کہ وہ کہنے کے لئے بظاہر ایک دینی علم ہوتا ہے۔ مگر اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے وہ ایک عام علم بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آدمی کے اندر نہ کوئی ربانی شعور جاگتا اور نہ اس کے دل میں خوف خدا کا کوئی قطرہ ٹپکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے ماہرین وہی کچھ کریں گے جس کی ایک تصویر اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

خدا کی مدد

عالم اسلام پر مغرب کے حملہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت اس علاقہ سے کاٹ دی۔ سترہویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید ٹکنالوجی کا وجود میں آنا یورپ کے لیے طاقت وقوت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا سمندری راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہونچ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا اور افریقہ کا کوئی مسلم ملک نہ تھا جو بالواسطہ یا براہ راست طور پر مغربی استعمار کے قبضہ میں نہ آچکا ہو۔

مادی قوت کے اعتبار سے مسلم اقوام اور مغربی اقوام کا فرق صرف مقداری نہ تھا بلکہ نوعی تھا۔ یعنی عالم اسلام اگر "دستی ہتھیاروں" سے مسلح تھا تو عالم مغرب "دور مار ہتھیاروں" سے۔ ایسی حالت میں لوگوں کا یہ تاثر بظاہر بیجا نہ تھا کہ مغرب کا غلبہ اب ختم ہونے والا نہیں۔ مگر قدرت کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (۴۱-۱۹۳۹) میں مغربی طاقتیں خود آپس میں لڑ گئیں۔ تاریخ انسانی کی اس سب سے زیادہ بھیانک جنگ نے ان کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات سے واپس چلی جائیں۔

تاہم ایک شدید تر محاذ ابھی باقی تھا۔ یہ مغرب کی صنعتی برتری تھی۔ مسلم اقوام اپنے محدود وسائل اور ناکافی ٹکنکل صلاحیت کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ایلون ٹافلر کے الفاظ (۱۹۷۰) میں سوال یہ تھا کہ مسلم قومیں جب بہزار دقت اپنے آپ کو انڈسٹریل ایج میں پہونچانے میں کامیاب ہوں گی، اس وقت مغرب سپر انڈسٹریل ایج میں پہونچ چکا ہوگا۔ عین اس وقت "پٹرو ڈالر" ایک خدائی کرشمہ بن کر ظاہر ہوا اور اس نے نہ صرف مسلم اقوام کی صنعتی پسماندگی کی تلافی کر دی بلکہ بہت سے پہلوؤں سے ان کو جدید اقتصادی دنیا میں برتری عطا کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کتاب محفوظ کی حامل ہے۔ اس کے طفیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کی دنیوی حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اسی خدائی حفاظت نے تاتاری حملے اور صلیبی لڑائیوں کے وقت مسلمانوں

کو محفوظ رکھا۔ اور اسی نے موجودہ زمانہ میں ان کو جدید طاقتوں کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

تاہم حفاظت کا یہ معاملہ صرف دنیوی پہلو سے ہے۔ آخرت کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ آخرت کی نجات کا تمام تر انحصار، ذاتی اصلاح کے بعد، اس پر ہے کہ ہم خدا کی امانت کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچاتے ہیں یا نہیں۔ رسول نے جس طرح اپنے زمانہ کے لوگوں پر خدا کے دین کی گواہی دی، ٹھیک اسی طرح ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس کا گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو صرف ذاتی اصلاح بھی ان کو خدا کے یہاں بازپرس سے نہیں بچا سکتی۔

ختم نبوّت کے بعد امت مسلمہ نبوّت کی قائم مقام ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی اسی کارِ شہادت کی ادائیگی پر موقوف ہے جس پر نبی کا معاملہ موقوف ہوتا تھا۔ نبی اگر خدائی پیغام رسانی کے کام کو انجام نہ دے تو خدا کی نظر میں اس کی حیثیت رسالت ہی متحقق نہیں ہوتی تھی (مائدہ۔ ۶۷) اسی طرح ہم اگر اپنے زمانہ کی قوموں پر دین کی گواہی دینے کا فریضہ ادا نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ ہمارا امت محمدی ہونا ہی مشتبہ نہ ہو جائے اور آخرت میں ہم ناکام و نامراد قرار پائیں۔ اگر تمام مسلم قومیں اس کام کے لیے نہیں اٹھتیں تو کم سے کم کسی ایک قوم یا کسی ایک جماعت کا دعوت الی اللہ کے اس کام کے لیے اٹھنا ضروری ہے۔

قدیم زمانہ میں جب کہ سیاست کی بنیاد مذہب پر ہوتی تھی۔ ایک بے ضرر دعوتی تحریک کو بھی حکمراں طبقہ اپنے خلاف ایک خطرہ سمجھنے لگتا تھا۔ اور بہت جلد اس کو مٹانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس مقصد کے لیے اٹھنے والے لوگ آروں سے چیرے گیے۔ اور آگ میں جلائے گیے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مذہب اور سیاست کی علٰحدگی نے ہم کو دعوتی کام کا انتہائی قیمتی موقع فراہم کر دیا ہے اگر ہم مناظرہ بازی سے بچیں اور سیاسیات میں اُلجھنے کی غلطی نہ کریں تو آزادی فکر اور سائنسی طریق مطالعہ کے اس زمانہ میں ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ رہ کر ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جدید افکار نے اسلام کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ ان امکانات کو استعمال کیا جائے تو اسلام کو معجزاتی استدلال کے ساتھ جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کے نام پر

عثمانی ترکوں میں سلطان سلیم نہایت بیدار مغز بادشاہ گزرا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب اس کو اقتدار ملا تو ایک طرف یورپ زبردست ترقی کے مقام کو پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف ترکی تقریباً ڈھائی صدی کے عروج کے بعد زوال کا شکار ہو کر "یورپ کا مرد بیمار" بن رہا تھا۔ ان حالات میں سلطان نے ترکی کو از سر نو طاقت ور اور ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی۔

اس وقت سلطان سلیم کی زبردست مخالفت کی گئی۔ یہ مخالفت کرنے والے ملک کے علمار تھے۔ سلطان نے فوجوں کی جدید تنظیم کے لئے سنگین والی رائفلیں منگوائیں تو علمار نے کہا کہ یہ کافروں کا ہتھیار ہے اور اس بنا پر اس کا استعمال حرام ہے۔ اس نے سپاہیوں کے استعمال کے لئے جدید طرز کی فوجی وردیاں بنوائیں تو علمار نے کہا کہ یہ تشبہ بالنصاریٰ ہے اور تشبہ بالنصاریٰ سے ہم کو منع کیا گیا ہے وغیرہ۔

سلطان سلیم کے عمل کو بے دینی قرار دیا گیا اور یہ کہہ کر عوام کے اندر اس کے خلاف نفرت پھیلائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے اندر کافروں کے طریقے رائج کر کے اسلام کو بگاڑ رہا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الاسلام عطار اللہ آفندی نے یہ فتویٰ دیا کہ سلطان سلیم قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے اور جو بادشاہ قرآن کے خلاف عمل کرے وہ بادشاہ بننے کے قابل نہیں۔

اس زمانہ میں ترکی عوام پر علمار کا بہت اثر تھا۔ ان کی اس قسم کی باتوں سے سلطان کے خلاف زبردست شورش پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۷ میں سلطان کو تخت سے معزول ہونا پڑا۔

ترک علمار جدید دنیا کی سرحد پر ہونے کے باوجود جدید تبدیلیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اپنے خیال کے مطابق اخلاص سے مگر حقیقۃً سراسر نادانی کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ترک قوم سات سو سال پہلے کی فضا سے نہ نکلنے پائے۔ سلطان سلیم کے بعد سلطان محمود نے ۱۸۲۶ میں دوبارہ عسکری تنظیم میں جدید طریقوں کو رائج کیا۔ مگر ترک عالموں اور درویشوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ بدعت ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر وہ اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہیں تو فوج میں بھرتی نہ ہوں۔

اس قسم کے واقعات نے ترکی کی نئی نسل میں ردعمل پیدا کیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکے۔ ۱۹۰۸ میں نوجوانوں کی جماعت کے ہاتھوں سلطان عبد الحمید خاں کا اقتدار سے بے دخل کیا جانا اسی اسلام بیزاری کا نتیجہ تھا جس نے بالآخر کمال اتاترک کے دور کو پیدا کیا۔

سبق آموز

فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ آگرہ سے ۵۴ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دوسری بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاہی "عبادت خانہ" بھی تھا۔ یہ عبادت خانہ اکبر کے بعد زمین کے نیچے دب گیا اور اس کے اوپر گھاس اور درخت اگ آئے۔ حال میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مشترک منصوبہ کے تحت اس کی کھدائی کی گئی ہے اور اس کو باہر نکالا گیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۸ جون ۱۹۸۴)

اس عبادت خانہ میں شہنشاہ اکبر علماء کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور ان سے مذہب کے موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ یہیں اس نے اپنا مشہور" دین الٰہی" وضع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لئے کسی ایک مذہب کی بنیاد پر یہاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے یہ رائے قائم کی کہ اس ملک میں مغل سلطنت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کے لوگوں کا مذہب ایک نہ ہو جائے۔ تبلیغ کے ذریعہ مذہب کو بدلنا اس کو مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مذہب (دین الٰہی) ایجاد کیا۔ جس میں بزعم خود اس نے تمام مذاہب کی خصوصیات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب اپنی مشترک خصوصیات کی بنا پر ملک کے تمام باشندوں کے لئے قابل قبول ہو جائے گا۔

دین الٰہی کی تصنیف کے دوران اس کو عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھا کہ اس کو انجیل کے فارسی ترجمے کی ضرورت ہے۔ شاہ پرتگال نے یہ فارسی ترجمہ بھیج دیا۔ تاہم اس کا مطالعہ اکبر کے لئے کافی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اکبر نے پوپ (روم) کو لکھا کہ مسیحیت کی تعلیم کے لئے اس کے پاس معلم بھیجے جائیں۔ پوپ نے فوراً دو تربیت یافتہ افراد ہندستان روانہ کر دئے۔

ایک فادر اکوا ویوا (Fr. Acquaviva) اور دوسرا فادر مانسریٹ (Fr. Monserrate) یہ دونوں صاحبان ۲۸ فروری ۱۵۹۰ کو فتح پور سیکری پہنچے۔ "اکبر نامہ" کی ایک پینٹنگ میں اکبر ان عیسائی معلمین سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔

اکبر نے ان دونوں عیسائی معلمین کو شاہی عبادت خانہ کے پاس "خوشبو خانہ" میں ٹھہرایا۔ مگر یہ دونوں مسیحی صرف "معلم" نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے مذہب کے تربیت یافتہ مبلغ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خوشبو خانہ کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا گرجا گھر تھا جو اکبر کے زمانہ میں قائم ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فادر اکواد یوا نے پوپ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں اس نے لکھا کہ میرا احساس یہ ہے کہ اکبر ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو قبول کرے۔ مگر اس سے اکبر کا اصل مقصد (سلطنت کا استحکام) حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اکبر ایسے اقدام سے باز رہا۔

اس واقعہ میں دو بڑے سبق ہیں۔ ایک سبق یہ کہ دولت اور اقتدار کا حصول اکثر عقل سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کو جب دولت اور اقتدار مل جاتا ہے تو اکثر اس کو وہ ایسے کاموں میں ضائع کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی خوش خیالی تحت "دین الٰہی" وضع کیا تھا۔ اس پر اس نے سلطنت کے بے پناہ وسائل خرچ کئے۔ حالاں کہ اس کا انجام بالآخر یہ ہوا تھا کہ وہ تاریخ کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ جائے اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے سوا کسی اور کو اس سے دل چسپی نہ رہے۔

دوسرا سبق دعوتی ہے۔ اکبر نے پوپ سے مسیحی معلم مانگے اور اس نے فوراً دو تیار شدہ افراد اس کے پاس بھیج دئے۔ جب کہ مسلمانوں سے جدید دور میں بار بار یہی تقاضا کیا گیا ہے مگر وہ اس تقاضے کو کبھی پورا نہ کر سکے۔ مسیحی ادارے اپنی مشنری اسپرٹ کی وجہ سے سیکڑوں سال سے اس پوزیشن میں ہیں کہ مشرق و مغرب میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھیج سکیں۔ جب کہ مشنری اسپرٹ سے محروم ہو کر مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان کے پاس نہ مشرقی ضرورت کے مطابق خدا کے دین کے مبلغ موجود ہیں اور نہ مغربی ضرورت کے مطابق۔

دور جدید میں مسلمانوں کی بربادی کا واحد سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت خدا کے گواہ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں کا اصل نشانہ صرف ایک ہے اور وہ دعوت ہے۔ جن لوگوں کی نظریں اس نشانہ پر جمی ہوتی ہوں وہ اپنے لئے عمل کا صحیح میدان پالیں گے اور جب نظریں اس نشانہ سے ہٹ جائیں تو تمام قوتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی قوم بن جاتے ہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ وہ ایسا گروہ بن جاتے ہیں جس کا کوئی اقدام نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

تاریخ پکارتی ہے

مغل بادشاہ اورنگ زیب (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے آخر عمر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھ سے بے اختیار آنسو جاری ہو گیے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پاس ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا۔ عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر دکن تک لہرا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان آپ کے دل میں باقی ہے جس کے لیے آپ رو رہے ہیں۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا:

سعد اللہ، مردے خواہم — سعد اللہ میں ایک مرد چاہتا ہوں۔

اورنگ زیب کے سامنے وہ کون سا مسئلہ تھا جس نے انھیں گھلا رکھا تھا۔ اور وہ ایک مرد کو حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ان کو نظر آرہا تھا کہ ان کے بعد جو لوگ عظیم مغل سلطنت کے وارث بننے والے ہیں وہ سب خود غرض لوگ ہیں۔ وہ اونچی سطح سے معاملات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑیں گے اور عظیم مغل سلطنت کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ نصف صدی تک حکومت کرنے کے بعد ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس وقت اورنگ زیب کے تین لڑکے تھے جن کا نام معظم، اعظم اور کام بخش تھا۔ اورنگ زیب کے آخر وقت میں شہزادہ معظم کابل کا گورنر تھا۔ شہزادہ اعظم گجرات کا گورنر تھا اور شہزادہ کام بخش بیجاپور کا گورنر تھا۔ اورنگ زیب نے مسئلہ کا آخری قابل عمل حل یہ نکالا کہ اس نے ایک وصیت چھوڑی۔ اس وصیت کے مطابق اس نے مغل سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں لڑکوں کو دیدیا تاکہ اس کے لڑکے اپنے اپنے دائرہ میں رہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہ کریں۔

مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کے مرتے ہی تینوں شہزادے دہلی کے تخت کے دعویدار بن کر کھڑے ہو گیے۔ تقریباً دو سال تک آپس میں لڑائیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش اس میں مارے گیے۔ شہزادہ معظم اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کر کے ۱۷۰۸ء میں دہلی کے تخت پر

بیٹھا اور اپنے لیے شاہ عالم کا لقب اختیار کیا۔

مگر شاہ عالم کو یہ معلوم نہ تھا کہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دہلی کے تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی اس کو چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۷۱۲ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے جن کے نام یہ تھے: جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ، رفیع الشان۔ ان لڑکوں کے سامنے اپنے باپ کا اسوہ تھا۔ چنانچہ چاروں لڑکوں میں دوبارہ جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ بالآخر ان میں سے تین لڑکے قتل ہو گیے اور جہاں دار شاہ تخت پر بیٹھا۔ مگر اس کو ایک سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے مقتول بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کے دل میں اپنے باپ کے لیے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آخر کار اس نے سازش کر کے جہاں دار شاہ پر قابو پا لیا۔ اس نے جہاں دار شاہ کو تخت سے اتار کر لال قلعہ میں اس کو سولی دے دی۔ یہ ۱۷۱۳ء کا واقعہ ہے۔

فرخ سیر نے اگرچہ اپنے چچا کو مار کر دہلی کا تخت حاصل کر لیا مگر وہ خود بھی صرف چھ سال دہلی کے تخت پر بیٹھ سکا۔ لال قلعہ کے اندر جلد ہی اس کے مخالفین پیدا ہو گیے۔ بالآخر ۱۷۱۹ء میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک روز بھرے دربار میں لوگوں نے فرخ سیر کو تخت سے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد اسے مار مار کر جیل کے اندر ڈھکیل دیا گیا۔ وہ جیل کے اندر ہی رہا یہاں تک کہ گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد شہزادہ رفیع الدرجات دہلی کے تخت پر بیٹھا مگر اس کی مدت حکومت اور بھی کم ثابت ہوئی۔ وہ ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بیٹھا اور ۴ جون ۱۷۱۹ء کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد وہ مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تپ دق کا مریض تھا۔

مغل شہزادوں کی آپس کی جنگ نے دہلی کی مرکزی حکومت کو بالکل کمزور کر دیا۔ صوبوں پر مرکز کی مضبوط گرفت باقی نہ رہی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں آزادی اور خود مختاری کا ذہن پیدا ہو گیا۔ صوبوں کے حاکم دہلی کے برائے نام بادشاہ سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرنے لگے:

> On the decline of the central authority at Delhi, the inevitable centrifugal tendency was manifest in different parts of the Empire, and the provincial viceroys made themselves independent of the titular Delhi Emperor.
>
> *An Advanced History of India,* (1978) p. 529

چنانچہ دکن کا صوبہ ۱۷۲۴ء میں میر قمرالدین خاں (نظام الملک) کے تحت آزاد ہوگیا۔ صوبہ اودھ میں سعادت خاں نے ۱۷۵۴ء میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ صوبہ بنگال میں سرفراز خاں نے ۱۷۲۹ء میں آزاد ہوکر نواب بنگال کا لقب اختیار کرلیا۔ اسی طرح راجپوت ریاستوں (اودے پور، جودھ پور، جے پور، وغیرہ) نے دہلی کی سیاسی وفاداری ترک کرکے آزاد حیثیت حاصل کرلی۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جو عظیم سلطنت بنائی تھی وہ اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر رہ گئی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت بظاہر ڈیڑھ سو سال تک باقی رہی۔ مگر یہ ڈیڑھ سو سال صرف باہمی قتل وخون کے سال تھے۔ مغل شاہزادے اور امراء اور وزراء ذاتی اقتدار کے لیے مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اور مغل سلطنت دن بدن کمزور اور منتشر ہوتی چلی گئی۔ انگریز اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ملک میں دخیل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ لال قلعہ میں بظاہر مغل تاج دار موجود تھا، مگر عملاً سارا اقتدار انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ :

حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم۔

اور یہ کہ تخت بہادر شاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔

آخرکار ۱۸۵۷ کا انقلاب برپا ہوا اور یہ نام کی مغل سلطنت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

مغل سلطنت کی یہ کہانی تمام مسلمانوں کی کہانی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کی ایک تصویر اوپر کی مثال میں نظر آتی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کا حال یہ رہا کہ جس شخص کو بھی کوئی موقع ملا وہ ذاتی بڑائی قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ ملے ہوئے مواقع کو اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر چھوٹی چھوٹی بڑائیاں تو قائم ہوئیں۔ مگر ملت کی عظیم تر بڑائی قائم نہ ہوسکی۔

ایک فرد جب اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی ہوتا ہے اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ پورے مجموعہ کی بڑائی قائم ہو۔ فرد کی قربانی ہی مجموعہ کی بڑائی کی اصل قیمت ہے۔ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے دوڑے، ایسی قوم کبھی عظمت کا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہوسکتا ہے۔

اتفاق کا نتیجہ

حماسہ کے معنی عربی زبان میں شجاعت وحمیت کے ہیں۔ شجاعت وحمیت قدیم عربی شاعری کے خاص موضوعات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدیم عربی شاعری کے جو منتخبات تیار کیے گئے ہیں ان کو الحماسہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں

سب سے مشہور حماسہ ابو تمام الطائی کا ہے جو سب سے پہلے تیار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو تمام الطائی (م ۲۲۰ ھ) ایک بار خراسان گیا ہوا تھا۔ جب وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں شدید برفباری شروع ہو گئی۔ چنانچہ وہ ھمدان میں اپنے ایک دوست ابو الوفا بن سلمہ کے یہاں ٹھہر گیا۔ ابو فا کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں قدیم عرب شعراء کا کلام بہت بڑی مقدار میں موجود تھا۔ یہ کتب خانہ اس نے ابو تمام کے لئے کھول دیا۔ چنانچہ ابو تمام نے جاڑے کا پورا موسم انہیں کتابوں کے مطالعہ میں گزار دیا۔

اس مطالعہ کے بعد ابو تمام الطائی نے جاہلی دور اور آغاز اسلام کے شعراء کے کلام کا ایک انتخاب (دیوان الحماسہ) تیار کیا جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ انتخاب اتنا جامع اور اتنا نفیس تھا کہ اس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد اسی انداز پر بہت سے منتخبات تیار کئے گئے۔ ابو تمام کا حماسہ ادب عربی کے نصاب کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ادب عربی کی یہ کتاب محض اتفاق (صدفہ) کے نتیجہ میں تیار ہوئی۔

تاریخ کے بہت سے اہم واقعات محض اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آئے۔ مگر اس قسم کے اتفاق سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے سے کچھ ضروری شرطوں کو پورا کر چکے ہوں۔ مثال کے طور پر ابو تمام الطائی اگر عربی زبان کا ماہر نہ ہوتا اور اس کو شعر فہمی کا عمدہ ذوق نہ ہوتا تو مذکورہ اتفاق پیدا ہونے کے باوجود وہ کتاب الحماسہ تیار نہیں کر سکتا تھا۔ ابو تمام اگرچہ خود بھی شاعر تھا۔ مگر اس کے اشعار سے زیادہ اس کا انتخاب مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شعر گوئی کے مقابلہ میں شعر فہمی کی صلاحیت اس میں زیادہ تھی۔ چنانچہ تبریزی نے اس کے بارہ میں کہا ہے:

ان ابا تمام فی حماسته اشعر منه فی شعره (شرح حماسة ابی تمام، المقدمة)

پہچان

اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام نے بھول کر پہلی رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھ دی۔ قل اعوذ برب الناس قرآن کی آخری سورہ ہے، اور نماز کے لیے حکم ہے کہ اگلی رکعت میں آگے کی سورہ پڑھی جائے نہ کہ پیچھے کی سورہ۔

اب امام صاحب کے سامنے سوال یہ تھا کہ اگلی رکعت میں وہ قرآن سے کیا پڑھیں۔ امام صاحب جب اگلی رکعت میں کھڑے ہوئے تو انھوں نے سورہ الم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس طرح قرآن کی ترتیب باقی رہی کیونکہ آدمی جب قرآن کو پڑھتے ہوئے سورہ قل اعوذ برب الناس تک پہنچتا ہے تو وہ دوبارہ قرآن کے ابتدائی حصہ سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر امام صاحب کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے۔ نماز کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کا عہدہ بڑھا دیا۔

بعض مرتبہ ایک چھوٹا سا واقعہ آدمی کی شخصیت کا تعارف بن جاتا ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ آدمی غبی ہے یا ذہین۔ وہ جوہر والا ہے یا بے جوہر والا۔

اسی سے اس حدیث کو سمجھا جا سکتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ بعض اوقات آدمی کا چھوٹا سا عمل اس کے لئے بڑے بڑے انجام کا سبب بن جاتا ہے۔ امام بخاری کی روایت کے مطابق اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ان العبد لیتکلم بالکلمة من رضوان الله تعالی ما یُلقی لها بالاً یرفعه الله بها درجاتٍ وان العبد لیتکلم بالکلمة من سخط الله تعالی لا یلقی لها بالاً یهوی بها فی جهنم

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ اللہ کی رضا کا کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کر دیتا ہے۔ اور بندہ اللہ کی ناراضگی کا ایک کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی وجہ سے اللہ اس کو جہنم میں ڈال دیتا ہے۔

بڑاپن

شہنشاہ اکبر نے اپنے لڑکے شہزادہ سلیم کی شادی جے پور کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی تھی۔ اس سلسلہ میں اکبر خود بارات لے کر جے پور گیا۔ نکاح کے بعد جب دولہن کا ڈولا باہر نکلا تو راجہ بھگوان داس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

ما رچیری تہار گھر کی باندی ہم باند غلام رے

(ہماری لڑکی آپ کے گھر کی کنیز ہے اور ہم آپ کے غلام ہیں)

یہ سن کر اکبر تڑپ اٹھا۔ وہ بے تابانہ کھڑا ہو گیا اور راجہ بھگوان داس کو گلے لگا کر کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یوں ہے:

تہار چیری مار گھر کی رانی تم صاحب سردار رے

(تمھاری لڑکی ہمارے گھر کی رانی ہے اور تم ہمارے سردار ہو)

یہ کہہ کر اکبر نے دولھن کے ڈولے میں خود کاندھا لگا دیا۔ اس کے بعد ساری فضا ہی دوسری ہوگئی، تمام شہزادے اور امرار دوڑ پڑے۔ ہر ایک دولھن کا ڈولہ اٹھانے میں سبقت کرنے لگا۔ کچھ دور تک یہی لوگ ڈولہ لے کر چلتے رہے، اس کے بعد اس کو کہاروں نے سنبھالا۔

خلیفہ ہارون رشید کا قول ہے کہ شریف آدمی وہ ہے جو اپنے سے بڑے کو دبائے اور چھوٹے سے خود دب جائے۔ اکبر کا مذکورہ واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکبر ایک بے حد بلند فطرت انسان تھا، اگرچہ وقت کے علمار کے غلط کردار نے اس کو بگاڑ دیا۔

جو لوگ پست طبیعت کے ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت وروں کے ساتھ اخلاق برتتے ہیں اور جس کو کمزور پاتے ہیں اس کو ذلیل کرنے لگتے ہیں۔ مگر اونچی طبیعت والے آدمی کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ دو قسم کا اخلاق برتے۔ وہ ایک کے مقابلہ میں کچھ ہو اور دوسرے کے مقابلہ میں کچھ۔ وہ ہر حال میں سچائی کے سامنے جھکنے والا ہوتا ہے۔ وہ معقولیت کے سامنے بھی اسی طرح دبتا ہے جس طرح قوت کے سامنے۔ وہ کمزور کا بھی اتنا ہی لحاظ کرتا ہے جتنا طاقت ور کا۔ اس کا کردار اصول کے تابع ہوتا ہے نہ کہ لالچ اور خوف کے تابع۔

بڑا آدمی اپنی بڑائی جتا کر حقیقۃً چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اونچی حیثیت والا جب گھمنڈ کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ اپنے کو نیچے گرا لیتا ہے۔

جاننا کافی نہیں

بوعلی سینا (۴۳۰-۳۷۰ھ) بہت عالم فاضل شخص تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے زمانہ کے ایک بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ملے اور ان کے یہاں چند دن گزارے۔ بوعلی سینا جب واپس جانے لگے تو انھوں نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کی خدمت میں رہنے والے ایک شخص سے کہا: آج میں یہاں سے جارہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ میرے بعد شیخ میرے بارے میں جو کچھ کہیں وہ تم ایک خط میں لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شیخ کا خیال میرے بارے میں کیا ہے۔

بوعلی سینا کی واپسی کو کئی دن گزر گئے مگر شیخ ابوسعید ابوالخیر نے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کہی۔ اچھا یا برا کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بالآخر کئی دن کے انتظار کے بعد مذکورہ شخص نے شیخ سے سوال کیا کہ حضرت، آپ کے پاس بوعلی سینا آئے تھے، وہ آپ کی نظر میں کیسے آدمی ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا کہ وہ ایک اچھے حکیم ہیں اور ان کے پاس بہت علم ہے۔ مگر وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

مذکورہ شخص نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کا یہ تبصرہ ایک کاغذ پر لکھا اور اس کو بوعلی سینا کے پاس بھیج دیا۔ بوعلی سینا نے اس کو پڑھا تو ان کو بڑا جھٹکا لگا۔ انھوں نے مذکورہ شخص کو اس کا جواب لکھ کر بھیجا۔ اس جواب میں انھوں نے یہ لکھا کہ مجھے تمھاری تحریر پر تعجب ہے۔ میں نے مکارم اخلاق پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ پھر شیخ میرے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق نہیں جانتا۔ مذکورہ شخص نے بوعلی سینا کا یہ جواب شیخ ابوسعید ابوالخیر کو بتایا۔ وہ اس کو سن کر مسکرائے اور کہا:

من ایں نگفتم کہ مکارم اخلاق نہ داند، گفتہ ام کہ ندارد (فوائد الفواد) میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکارم اخلاق نہیں جانتے، میں نے یہ کہا ہے کہ وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

ایک چیز ہے "جاننا"، اور ایک چیز ہے "ہونا"۔ جاننا ذہن اور حافظہ کی سطح پر ہوتا ہے۔ اور ہوتا آدمی کے پورے وجود کی سطح پر۔ جاننے والا آدمی صرف جانتا ہے اور ہونے والا آدمی خود اس میں شامل ہوجاتا ہے۔ جاننا بہت آسان ہے۔ کوئی بھی شخص پڑھ کر اور سیکھ کر دین و اخلاق کی باتوں کو جان سکتا ہے۔ مگر ہونا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ ہونے کے لئے آدمی کو اپنے آپ کو پیس ڈالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پسا ہوا سفوف ہی پانی میں گھلتا ہے نہ کہ جمے ہوئے ٹکڑے۔ مگر اصل اہمیت اعتبار کی ہے۔ اور حقیقت کی دنیا میں جو کچھ اعتبار ہے وہ ہونے کا ہے نہ کہ جاننے کا۔

جس جاننے کے ساتھ ہونا نہ ہو، حقیقت کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

بربادی کے باوجود

"ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے" یہ ایک ابدی اصول ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس اصول کے بہت سے عملی نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی میں جن مسلمانوں کے اوپر اسپین کے دروازے بند کیے گئے تھے، انھیں کے ذریعہ افریقہ کے بربری قبائل میں اسلامی دعوت کے دروازے کھلے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بربری قبائل کے لوگ اپنے پہاڑوں کے حصار میں بند تھے اور اپنی خود مختاری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلہ کو کامیابی سے روکا۔ اور اس بنا پر ان کو مسلمان بنانے میں بہت دشواریاں حائل ہوئیں۔ قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمرا) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

بربری قبائل کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے۔ جو سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیئے گئے تھے۔ اور اس کے بعد افریقہ آکر اسی خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کو سر انجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کار خیر پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو ان کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیت اور نورِ ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ

روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل پکیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہونچاؤ۔ خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیئے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات انتخاب کر کے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبائل جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علم طب اور صنائع و حرفت اور تمدن کے دیگر فوائد کی بدولت بربری قبائل کے ہاں اپنا مطلوبہ اثر ورسوخ قائم کرلیا اور ہر ایک خانقاہ اسلامی تعلیم کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم و فضل کی کشش سے بہت سے طالب علم ان کے گرد و پیش جمع ہوگیے، اور کچھ عرصے کے بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کا مذہب ان قبائل کے تمام علاقوں اور صحرائے الجزائر کی بستیوں میں پھیل گیا۔" پریچنگ آف اسلام، صفحہ ۳۵-۱۳۴

پروفیسر آرنلڈ کا مذکورہ اقتباس بتاتا ہے کہ قدیم اسپین کی تاریخ سے دو قسم کے واقعات وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ عیسائیوں نے انھیں اسپین سے ظالمانہ طور پر نکالا۔ دوسرے یہ کہ ان نکلے ہوئے مسلمانوں نے باہر آکر اسلام کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص "پہلے اسپین" کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، "دوسرے اسپین" کو جاننے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جنھیں اندھیرے تو خوب نظر آئیں، مگر اجالے ان کو دکھائی نہ دے سکیں۔

قومی عظمت

ایڈورڈ گبن (Decline and Fall of the Roman Empire) رومی شہنشاہیت کا زوال کی مشہور کتاب ہے۔ انگریز مورخ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا خیال اس کو اس وقت آیا جب کہ اس نے روم کے کھنڈرات دیکھے۔ رومی شہنشاہیت کے کھنڈرات میں اس نے یورپ کی عظمتِ ماضی کا نشان دیکھا۔ اور اس کے برباد ہو جانے کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدہ نے ایڈورڈ گبن کے دل میں تڑپ پیدا کی۔ وہ اس موضوع کی تحقیق میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ کتاب لکھی جو کہ نہ صرف رومی سلطنت کی اہم تاریخ ہے بلکہ خود تاریخ نویسی پر خالص فنی اعتبار سے ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح تاریخ کے موضوع پر سرسید کی مشہور کتاب آثار الصنادید (۱۸۴۷) ہے۔ سرسید کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال بھی عظمت ماضی کے "کھنڈرات" کو دیکھ کر ہوا۔ دہلی کی منصفی کے زمانہ میں سرسید نے دہلی کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ان عمارتوں میں انھوں نے سنسان عظمت کا جو مشاہدہ کیا اس نے ان کے اندر ایک تڑپ پیدا کر دی۔ انھوں نے دہلی کی ایک ایک عمارت کی تحقیق شروع کر دی۔ چھٹیوں کو وہ اس طرح استعمال کرتے کہ دہلی کے اطراف کی عمارتوں کو دیکھنے نکل جاتے اور کئی کئی دن تک ان کی تحقیق میں مشغول رہتے۔

اس تحقیق میں انھوں نے غیر معمولی محنت کی۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس قدر بوسیدہ تھیں کہ ان کے کتبے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بہت سے کتبوں سے پوری معلومات حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ کتبے ایسے خطامیں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ کتبوں پر جو نام درج تھے ان کی تاریخی کتابوں سے تحقیق کرنی پڑتی تھی۔ انھوں نے ان تمام مشکلات کو جھیلا۔ انھوں نے ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش کی۔ اس کے حالات لکھے۔ کتبوں کے چربے اتارے۔ ہر عمارت کا نقشہ مصور سے بنوایا کیونکہ اس زمانہ میں کیمرہ موجود نہ تھا۔ اس طرح انھوں نے تقریباً سوا سو عمارتوں کی تفصیلات مرتب کیں۔

قطب مینار کی غیر معمولی بلندی قدیم زمانہ میں کسی محقق کے لئے زبردست مسئلہ تھی۔ سرسید نے قطب مینار کے اونچے کتبوں کو پڑھنے کے لئے دو بلیاں لگوا کر ان میں چھینکے لٹکوائے اور اس کے اندر بیٹھ کر اوپر گئے اور کتبوں کی نقل تیار کی۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی :

ویصعد حتی یظن الوریٰ　　　　بان لہ حاجۃ فی السماء

(وہ اس طرح اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان میں کچھ ضرورت ہے)

عظمت ماضی کے کھنڈر کو دیکھ کر جس طرح گبن اور سرسید مورخ بن گئے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جن کو عظمت ماضی کے کھنڈر نے لیڈر اور مفکر بنا دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوتے جب کہ مسلمانوں کو زوال آچکا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دور عظمت کے کھنڈر دیکھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔ کھوئی ہوئی عظمت کے شکستہ مناظر کو دیکھ کر ان کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔

قائدین کی بھیڑ میں کوئی نظر نہیں آتا جس نے جنت کے باغوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھا ہو اور جہنم کے شعلوں کی لپٹ محسوس کرکے تڑپ اٹھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں آخرت کی دعوت کی کوئی حقیقی تحریک نہ اٹھ سکی۔ البتہ قومی عظمت کو حاصل کرنے کی تحریکیں اتنی زیادہ ابھر آئیں کہ ان کے شور سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کان بہرے نہ ہو جائیں۔

عروج وزوال

عروج وزوال کے تاریخی قانون کو قرآن میں مختصر طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: اللہ کسی گروہ کے مابقوم (حالت قومی) کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے مابانفس (حالت نفسی) کو نہ بدلے (انفال ۵۳، رعد ۱۱)

ان آیات میں مابانفس کی تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو افراد کی سطح پر ہوتی ہے۔ کیونکہ "نفس" افراد ہی کی سطح پر پایا جاتا ہے نہ کہ اجتماع کی سطح پر۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے افراد میں بگاڑ آگیا ہو۔ اسی طرح قوموں کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب کہ افراد کی سطح پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ اس سنت الٰہی کے مطابق اصلاح قوم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اصلاح افراد سے شروع کیا جائے نہ کہ انقلاب حکومت سے۔ انقلاب حکومت کے نعرہ سے کام کا آغاز گویا کسی گروہ کے مابقوم کو مابقوم سے بدلنے کی کوشش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش ایک ایسی دنیا میں نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جس کے پیدا کرنے والے نے اس کے مابقوم کی تبدیلی کو اس کے مابانفس کی تبدیلی کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔ یہ باغ کو باغ سے نکالنے کی کوشش ہوگی۔ جب کہ اس دنیا میں باغ کو صرف بیج سے نکالا جا سکتا ہے۔

"تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا" ــــــ یہ قول جس طرح دوسری قوموں کے لئے صحیح ہے ٹھیک اسی طرح وہ ہمارے اوپر بھی صادق آتا ہے۔ ہماری طویل تاریخ ہر قسم کے سبق آموز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص جب کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو اکثر وہ انھیں ناکام تجربات کو دہراتا ہے جو اس سے پہلے بار بار پیش آچکے ہیں۔ وہ تاریخ کے قانون کو جانتے ہوئے اپنے آپ کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس سے الگ کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔

تاریخ مسلسل طور پر یہ سبق دیتی رہی ہے کہ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ اس کے افراد میں کیرکٹر کی طاقت پیدا ہو جائے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم افراد میں کیرکٹر پیدا کئے بغیر ترقی کی طرف چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ساری تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی سربلندی کا راز ابتدائی سطح پر تعمیر و استحکام ہے۔ مگر لوگ موقع ملتے ہی سیاسی ادارہ سے مقابلہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افراد قوم کے درمیان باہمی اتحاد، خواہ جس قیمت پر بھی ہو، باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ مگر معمولی معمولی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ حقیقت پسندی کسی بھی کامیابی تک پہنچنے کا واحد زینہ ہے۔ مگر ہمارے رہنما نہایت بے دردی کے ساتھ قوم کو جذباتی ہنگاموں میں مشغول کر دیتے ہیں۔ ملت کو اٹھانے کا کوئی منصوبہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ ملت کے افراد کو اٹھایا جا چکا ہو ــ ملت کی ترقی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو بولنے سے زیادہ چپ رہنا جانتے ہوں جو الفاظ سے زیادہ معانی کی زبان سمجھتے ہوں۔ جو طاقت سے زیادہ دلیل کے آگے جھکنے والے ہوں۔ جو کہنے سے زیادہ کرنا جانتے ہوں۔ جو آگے بڑھنے سے زیادہ پیچھے ہٹنے کے بہادر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جو دنیا سے زیادہ آخرت کو دیکھ رہے ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ملت کی سربلندی کا نعرہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے دلدل کے اوپر دیوار کھڑی کرنا۔

منفی تحریکیں

پروفیسر سی ایم جوڈ نے لکھا ہے: وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے اور جو عوام کے بڑے بڑے گروہوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں ہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی گروہ کے اوپر قیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے وہ گروہ نفرت کرے یا وہ کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کرلیں جس سے وہ گروہ ڈرے۔

Guide to Modern Wickedness, P. 153

نفرت اور خوف کے جذبات کو ابھار کر تحریکیں چلانا قرآن کے الفاظ میں عداوت (البقرہ ۳۶) کی بنیاد پر تحریک چلانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں اندھے جھنڈے اور جاہلی نعرہ کے تحت لڑنا کہا گیا ہے:

من قتل تحت رایۃ عمیۃ یغضب للعصبیۃ دیقاتل للعصبیۃ فلیس من امتی (مسلم)

جو شخص کسی اندھے جھنڈے کے تحت مارا جائے، وہ عصبیت کے لئے غصہ کرے اور وہ عصبیت کے لئے لڑے تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

کسی فرد یا گروہ کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے پیچھے پڑنا خود ایک بہت بڑی برائی ہے۔ پھر برائی کے بیج سے بھلائی کا پھل کیسے نکلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکیں، خواہ وہ حق وصداقت کے نام پر اٹھائی گئی ہوں، ہمیشہ منفی تحریکیں ہوتی ہیں۔ اور منفی عمل سے کبھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ خدا کی دنیا، زمین سے آسمان تک، مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ شہد کے چھتہ سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک، ہر جگہ مثبت اصولوں کی کارفرمائی ہے۔ ایسی دنیا میں وہی تحریک نتیجہ خیز ہوگی جو مثبت بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو۔ منفی بنیادوں پر کیا جانے والا شور وغل اور اکھیڑ پچھاڑ ایک قسم کا شیطانی عمل ہے، اور شیطانی عمل سے ملکوتی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔

منفی نعرے دے کر اٹھنا شخصی قیادت قائم کرنے کے لئے انتہائی مفید ہے۔ مگر اس قسم کی تحریک اصلاح کے مقصد کے لئے اتنی ہی بے فائدہ ہے۔ ہر تحریک اپنی دعوت اور سرگرمیوں کے مطابق اپنے متاثرین کا ذہن بناتی ہے۔ جو تحریک منفی بنیادوں پر اٹھے وہ یقیناً اپنے عمل کے دوران لوگوں کا ذہن بھی منفی انداز کا بنائے گی۔ پھر ایسے منفی ذہن کے لوگوں کا انجام خدا کی مثبت دنیا میں اس کے سوا کیا ہے کہ وہ یہاں بالکل بے جگہ ہو جائیں اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

چوتھا باب

تاریخ کا مقصد داستاں گوئی نہیں۔ تاریخ کا مقصد
انسانی تجربات سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق پر (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۹۴۶-۱۸۶۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا پہلا پیراگراف اہل اسلام کے درمیان مال اور خون کے تمام جھگڑے کو کالعدم کر رہا ہے۔ اس کا آخری حصہ ایک کالے حبشی کو خلیفہ کے برابر کا درجہ دے رہا ہے۔ انھوں نے دنیا میں باوقار اور منصفانہ معاملہ کی عظیم روایت قائم کی۔ انھوں نے لوگوں میں فیاضی کی روح پھونکی۔ انھوں نے ایک ایسا سماج بنایا جو تاریخ کے کسی بھی پچھلے سماج سے زیادہ بے رحمی اور اجتماعی ظلم سے پاک تھا:

The reader will note that the first paragraph sweeps away all plunder and blood feuds among the followers of Islam. The last makes the believing Negro the equal of the Caliph... they established in the world a great tradition of dignified fair dealing, they breathed a spirit of generosity, and they are human and workable. They created a society more free from widespread cruelty and social oppression than any society had ever been in the world before.

اس دنیا میں حقیقت سے انکار کی مثالیں ہیں اور اسی کے ساتھ حقیقت کے اعتراف کی مثالیں بھی۔

ماضی اور حال

مسیح الملک حکیم اجمل خاں (۱۹۳۰-۱۸۶۴) کو طب اور علاج میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ ۱۹۱۰ سے ۱۹۱۶ تک ہندستان کے وائسرائے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شہرت سے متاثر ہوکر وائسرائے نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو ان کے پاس طبی مشورہ کے لیے بھیجا۔ وہ دہلی میں ان کے مطب میں آئے تو دیکھا کہ وسیع مطب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سکریٹری پر اس کا بہت اثر ہوا۔ واپس جاکر اس نے وائسرائے سے اس کا ذکر کیا۔ وائسرائے نے کہا کہ وہ ہندستان کے مقناطیس ہیں:

He is the magnet of India.

حکیم اجمل خاں کی اسی عظمت و مقبولیت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب وہ قومی سیاست میں داخل ہوئے تو اس کے اندر انھوں نے مرکزی مقام حاصل کرلیا۔ دہلی میں ان کے مکان (شریف منزل) میں وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں۔ مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر محمد اقبال، وغیرہ۔ حکیم صاحب نے مسلم ملکوں کے علاوہ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا وغیرہ کے سفر بھی کیے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ جدید میڈیکل سائنس ابھی اپنے عروج کو نہیں پہونچی تھی۔ اس زمانہ میں ابھی طب کی اہمیت پوری طرح باقی تھی۔ اس وقت مسلمان فنِ طب کے امام تھے۔ آج ان کی یہ حیثیت ختم ہوچکی ہے۔ روایتی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے آگے تھے، سائنسی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے پیچھے ہوگیے۔

سائنس اور سائنسی طب میں مسلمانوں کی اس پسماندگی کی ذمہ داری تمام تر مسلم رہناؤں پر ہے۔ علماء نے مذہبی بنیاد پر اور لیڈروں نے سیاسی بنیاد پر اور کچھ "مفکرین" نے نظریاتی بنیاد پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم میں کم از کم ایک سو سال دنیا سے پیچھے ہوگیے۔

علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے بعد مشرک قیدیوں کے ذریعہ مسلمان بچوں کو تعلیم دلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہر حال میں مطلوب ہے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر علم سے روکنا ہرگز جائز نہیں۔

اخلاق کی طاقت

۱۹۳۲ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اتر پردیش) کے علاقہ میں سکھوا نامی ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی لوٹ مار بے پناہ ہوتی جارہی تھی۔ پولیس کے افراد تک کے لئے ممکن نہیں رہا تھا کہ اس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مگر عین اس زمانہ میں بھی ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی فہرستِ انتقام سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن آئی سی ایس (وفات ۱۹۶۳) تھے۔ صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کے خلاف پولس کی مہم انھیں کی ماتحتی میں چلائی گئی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد سکھوا ڈاکو گرفتار ہوا اور صدیق حسن صاحب نے اس کے مقدمہ کی سماعت کرکے اس کو سزا کا حکم سنایا۔ مگر عین اس زمانہ میں جب کہ صدیق حسن صاحب سکھوا ڈاکو کے خلاف مہم کی قیادت کررہے تھے، سکھوا ڈاکو نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اکثر رات کو صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر ان کی شرافت کا خیال کرکے کبھی ان پر گولی نہیں چلائی۔

سید صدیق حسن صاحب کی وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک ڈاکو بھی ان کی تعریف اور عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے جو خود سکھوا ڈاکو نے بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک بار پولس والے اس کو گرفتار کرکے سید صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر لائے۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے صدیق حسن صاحب سے کہا: "جنٹ صاحب آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے"۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً اندر گئے۔ اپنی نئی ریشمی قمیص اور کمبل لائے اور اس کو ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو اس کو استعمال کرو یہ تمھارے لئے ہے (۱۷ مئی ۱۹۶۸)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی نہتا ہو اس کے پاس ایک ایسا ہتھیار موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنے حریف کو جیت سکے۔ یہ اخلاق کا ہتھیار ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے۔ وہ شہر میں مطب کرتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن اپنے گاؤں آیا کرتے تھے۔ ان سے ان کے گاؤں کے بعض لوگوں کو دشمنی ہوگئی۔ انھوں نے ایک آدمی کو چند سو روپے دئے اور کہا کہ رات کو جب حکیم صاحب واپس آرہے ہوں تو ان کو پکڑ کر مار ڈالو۔ غریب آدمی روپے کے لالچ میں تیار ہوگیا اور گاؤں کے باہر پل کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب پل کے پاس پہنچے تو وہ جھپٹ کر سامنے آگیا۔ حکیم صاحب اس کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ان کو مار ڈالنا چاہتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "کیا تم کو وہ دن یاد نہیں جب تم اپنے چھوٹے بچّے کو ٹوکرے میں رکھ کر میرے پاس لائے تھے۔ بیماری نے اس کا برا حال کردیا تھا اور تمھارے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے تمھارے لڑکے کا مفت علاج کیا اور وہ اچھا ہوگیا۔ کیا میرے اس احسان کا بدلہ وہی ہے جو تم اب میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو"۔ یہ سنتے ہی آدمی نے اپنی لاٹھی پھینک دی اور حکیم صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے کہا: "آپ نے سچ کہا۔ میں روپے کے لالچ میں آپ کو مارنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ مگر اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے معاف کردیں"۔ ایک جانور کو کسی قسم کی اخلاقی دلیل حملہ کرنے سے روک نہیں سکتی۔ مگر انسان کو جیتنے کے لئے ایک اخلاقی دلیل بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں ایک اخلاقی دلیل ہو نہ کہ محض الفاظ کا ایک مجموعہ۔

اللہ کو بہت یاد کرو

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۸۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے خلیفہ مولانا سعید احمد صاحب مرحوم نے ایک بار حافظ صاحب قبلہ سے پوچھا کہ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثیر کرو (احزاب ۴۱) اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا کہ ذکر کثیر (بہت یاد) کا اطلاق کتنے عدد پر ہوتا ہے تو لوگوں نے مختلف اعداد بتائے۔ کسی نے کہا ۲۵ ہزار بار اللہ کا نام لینا ذکر کثیر ہے، کسی نے کہا ۵۰ ہزار بار ذکر کرنا ذکر کثیر ہے۔ مگر ۲۵ ہزار یا ۵۰ ہزار تو گنتی کی حد نہیں ہیں۔ ان سے آگے بھی گنتیاں ہیں۔ اس قسم کے کسی محدود عددی نصاب کو ذکر کثیر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ خدا لامحدود ہے، اس لئے اس کا ذکر کثیر بھی ایسی گنتی پر ختم ہونا چاہیے جو گنتی کی آخری حد ہو۔

حافظ حامد حسن علوی نے جواب دیا: ذکر کے معنی ہیں عدم نسیان۔ نہ بھولنے کی حالت۔ مثلاً ایک شخص کو حکومت کا افسر یہ حکم سنا دے کہ اتوار کے دن تم کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ تو اس خبر کو سننے کے بعد اگرچہ وہ آدمی روزمرہ کے معمولات میں مشغول نظر آئے گا۔ وہ کھائے پیئے گا، بیوی بچوں کے ساتھ رہے گا۔ مگر اس کا ذہن ہر لمحہ پھانسی کے ذکر (یاد) میں مشغول رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو پائے گا۔ بس اس مثال سے ذکر کی حقیقت سمجھ سکتے ہو۔

ذکر حقیقۃً ایک مستقل یاد کا نام ہے نہ کہ کوئی عددی نصاب پورا کرنے کا۔ جب آدمی اللہ کو پالیتا ہے تو وہ اس کی روح میں سما جاتا ہے، وہ اس کے خون میں تیرنے لگتا ہے۔ ہر موقع پر اس کو خدا کا خیال آتا رہتا ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ یاد کبھی سینہ کی کسک بن کر اس کو تڑپا دیتی ہے۔ کبھی اس کے دل کو پگھلا کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ کبھی خوف یا محبت کے کلمہ کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ کبھی شکر یا دعا بن کر اس کی زبان سے ٹپک پڑتی ہے۔

ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے، ذکر دل کی ایک حالت کا نام ہے۔ دل کے کے اندر اٹھنے والی یہ موجیں کبھی الفاظ کی صورت میں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں، یہ الفاظ ذکر و دعا کے معروف الفاظ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر معروف الفاظ بھی، وہ عربی میں بھی ہو سکتے ہیں اور آدمی کی اپنی مادری زبان میں بھی۔ مگر ذکر یقینی طور پر کسی قسم کے تکرار الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ اس قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں خدا کو یاد کرنے والے الفاظ زبان سے نکل پڑتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار کو ذکر کہنا ایسا ہی ہے جیسے ریکارڈ کی آواز کو ایک زندہ انسان کا کلام کہا جائے۔

کل اور آج کا فرق

فرانس کے شہر رائن (Rouen) میں ۱۲۰۰ اور ۱۲۲۵ء کے درمیان چھ بار آگ لگی۔ ہر بار پورا شہر جل کر خاک ہوگیا۔ کیوں کہ اس وقت فرانس میں آگ بجھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۱۲۰۰ء تک یورپ کے کسی شہر میں پختہ سڑکیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ لوگ گھر کا کوڑا سڑکوں پر ڈال دیا کرتے تھے جس کی صفائی کے لئے کوئی سرکاری انتظام موجود نہ تھا۔ رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے نکلتا تو وہ لالٹین لے کر نکلتا۔ کیوں کہ شہروں میں روشنی کا رواج نہ تھا۔ آج کی طرح پولس کا انتظام نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی۔ یہ دور جس کو "قرون وسطیٰ" کا دور کہا جاتا ہے، اس وقت یورپ کے شہروں میں بدنظمی عام تھی۔ مکانات معمولی مٹی کے ہوتے تھے۔ اس قسم کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد عالمی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"یہاں قرون وسطیٰ کے شہروں کی بابت جو کچھ لکھا گیا اس کا کوئی جزء اس شان دار تہذیب پر چسپاں نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین میں قائم کی تھی۔ مسلمانوں کا شہر قرطبہ قرون وسطیٰ میں یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا، اس کے باشندے اعلیٰ ترین معیار زندگی پر فخر کرسکتے تھے جو یورپ میں کہیں بھی سیکڑوں برس تک موجود نہ تھا"

World Book Encyclopedia (1963) Vol. 12(M) p. 429

مسلمان جو کسی وقت ساری دنیا میں سب سے آگے تھے، آج دنیا بھر میں سب سے پیچھے کیوں ہوگئے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے اندر تعمیری ذہن نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگرچہ بہت بڑے پیمانہ پر سرگرمیاں دکھا رہے ہیں۔ مگر یہ سرگرمیاں منفی ذہن کی پیداوار ہیں نہ کہ مثبت ذہن کی پیداوار۔ دور اول کے مسلمانوں کو قرآن کے ایجابی فکر نے متحرک کیا تھا، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ صرف وہ شکایتیں ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ شکایتی ذہن کے تحت کبھی تعمیری سرگرمیاں وجود میں نہیں آتیں۔ شکایت اور احتجاج کی زمین پر صرف شوروغل اور منفی ہنگاموں کی فصل اگتی ہے اور وہی آج بہت بڑے پیمانہ پر ہمارے یہاں اگی ہوئی ہے۔

جہاد کے نام پر

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں روہیل کھنڈ (شمالی ہند) میں روہیلہ خاندان کے نواب رحمت خاں کی حکومت تھی۔ یہ افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ہوش سے زیادہ جوش کے مالک تھے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کی مخالفت ہوگئی۔ کمپنی نے اودھ (لکھنؤ) کے نواب شجاع الدولہ کو نواب رحمت خاں سے لڑا دیا۔ اس جنگ میں نواب شجاع الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد حاصل تھی چنانچہ ان کو کامیابی ہوئی اور ۱۷۷۴ میں میرن پور کٹرہ کی جنگ میں نواب رحمت خاں مارے گئے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نواب شجاع الدولہ کی حکومت اودھ اور روہیل کھنڈ (لکھنؤ سے لے کر بریلی) تک قائم ہوگئی۔ تاہم یہ حکومت صرف ۲۷ سال باقی رہی۔ ۱۸۰۱ء میں ادائیگی قرض کے نام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے روہیل کھنڈ کو براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس زمانہ میں ایک مفتی محمد عیوض بدایونی تھے جو بریلی میں افتاء کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کا تقرر نواب رحمت خاں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ تاہم بعد کے زمانہ میں بھی وہ بدستور اپنے عہدہ پر باقی رہے۔ طویل خاندانی روایت کی وجہ سے عوام کے اندر ان کو بڑا ادب واحترام حاصل تھا۔ عوام کے علاوہ حکومت کے حلقے بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اس دوطرفہ مقبولیت کو اگر وہ حکمت کے ساتھ استعمال کرتے تو وہ کوئی بڑا دینی کام کرسکتے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے بے معنیٰ تصادم میں ضائع کر دیا۔

۱۸۱۴ کا واقعہ ہے جب کہ روہیل کھنڈ میں انگریزی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ انھوں نے نظم ونسق کو مضبوط بنانے کے لئے ایک اقدام کیا۔ انھوں نے ایک قانون پاس کیا جو "چوکیداری ٹیکس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت بڑے بڑے شہروں میں پولیس کی تنظیم قائم کی جائے اور اس خرچ کو چوکیداری ٹیکس وصول کر کے پورا کیا جائے۔

چوکیداری ٹیکس کا قانون روہیل کھنڈ کے علاقہ کے دوسرے مقامات پر کسی احتجاج یا مزاحمت کے بغیر نافذ ہوگیا۔ لیکن بریلی میں صورت حال برعکس تھی۔ بریلی نوابی دور سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں سابق نواب رحمت خاں کے بچے ہوئے افراد خاندان موجود تھے۔ انھوں نے چوکیداری ٹیکس کو بہانہ بنایا اور اس کے نام پر انگریزی حکومت کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ میں مفتی محمد عیوض نے ان کا پورا ساتھ دیا۔

اب سیاست اور مذہب دونوں ایک ہوگئے۔ مفتی محمد عیوض نے فتویٰ دیا کہ چوکیداری ٹیکس

سراسر ناجائز ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے اوپر جزیہ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے مسلم عوام اس ٹیکس کے خلاف ہوگئے۔ خاص طور پر افغانی پٹھان بڑی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جو پہلے سے انگریزوں سے بگڑے ہوئے تھے، کیونکہ انگریزوں نے ان کی افغان حکومت کو اس علاقے سے ختم کیا تھا۔

مفتی محمد عیوض کے فتوے کے بعد مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات ابھر آئے۔ شہر بریلی میں زبردست ہڑتال کی گئی۔

مسٹر ڈمبلٹن اس وقت یہاں ضلع مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ڈمبلٹن نے چوکیداری ٹیکس کی وصولی کے لیے ۱۶ اپریل ۱۸۱۶ء کی قطعی تاریخ مقرر کر دی اور اس کا اعلان کرا دیا۔ جب یہ تاریخ آئی تو بریلی کے مسلم عوام بڑی تعداد میں مفتی محمد عیوض کے مکان کے سامنے جمع ہوگئے۔ مفتی صاحب نے اس مجمع کی قیادت سنبھال لی۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی طرف آرہا ہے۔ انھوں نے عوام کو ہدایت کی کہ انگریز مجسٹریٹ کو آگے بڑھنے سے روکیں اور اس کو یہاں نہ آنے دیں۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا وہی ہوا۔ انگریز مجسٹریٹ نے بھی آگے بڑھنے پر اصرار کیا جس کی وجہ سے انگریزی پولیس اور مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے درمیان تصادم ہوگیا۔ اس کا نقصان مفتی محمد عیوض اور ان کے حامیوں کو پہنچا کیوں کہ ان کے پاس لاٹھی ڈنڈے کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا جب کہ انگریزی پولیس بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس نے مجمع پر اندھادھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں بہت سے افراد ہلاک ہوگئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

تاہم مفتی محمد عیوض نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے حسینی باغ (بریلی) میں مسلمانوں کو جمع کیا اور یہاں پرجوش تقریر کرتے ہوئے جہاد کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی حکومت سے اسلام کو خطرہ ہے۔ اس لیے اس سے لڑنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اطراف کے علاقوں سے بھی لوگ آنے لگے اور چند دن کے اندر تقریباً پانچ ہزار روہیلہ پٹھان تلواروں اور آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مفتی محمد عیوض کی سرداری میں جمع ہوگئے۔

انگریزوں نے مصالحت دکھائی اور گفت وشنید سے مسئلہ کو حل کرنا چاہا۔ مگر مفتی محمد عیوض صاحب جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف بریلی، رامپور، پیلی بھیت، بجنور، بدایوں، شاہجہاں پور تک کے پٹھان جہاد کا اعلان سن کر آتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً ۱۵ ہزار ہوگئی۔

مفتی محمد عیوض کے حوصلے اب بہت بڑھ گئے۔ انھوں نے صلح کے لیے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے مندرجہ ذیل چار شرطیں پیش کیں۔

۱ چوکیداری ٹیکس کو منسوخ کیا جائے۔

۲ بریلی کے انگریز کوتوال کو ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ ہم اس کے اوپر شرعی سزا نافذ کریں۔

۳ پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کے وارثین کو معقول معاوضہ دیا جائے۔

۴ چوکیداری ٹیکس کے تمام مظاہرین کی عام معافی کا اعلان کیا جائے۔

انگریز حکومت تمام شرطوں کو مان سکتی تھی۔ مگر وہ دوسری شرط کو کسی قیمت پر نہیں مان سکتی تھی۔ دوسری طرف مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ گفت وشنید کے دوران بھی وہ پرامن نہ رہے۔ عین اس زمانہ میں ان میں سے کچھ لوگوں نے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کولیسٹر کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ بالآخر انگریز سپاہیوں کی بڑی تعداد نے ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ کو مفتی محمد عیوض کے حامیوں پر حملہ کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی مگر انگریزی بندوقوں کے مقابلہ میں روہیلے افغانوں کے روایتی ہتھیاروں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سو روہیلے جان سے مارے گئے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

اس کے بعد روہیلے افغانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ مفتی محمد عیوض کا تیاری کے بغیر جہاد ایک ہی دن کے مقابلہ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مفتی محمد عیوض بریلی چھوڑ کر رامپور چلے گئے جہاں صرف ایک سال میں ان کا انتقال ہو گیا ——— چوکیداری ٹیکس کو برداشت نہ کرنے والا بالآخر ملت کو اس سے بہت زیادہ بڑی بربادی کے حوالے کر کے اس دنیا سے چلا گیا۔

اس قسم کی بے معنی لڑائیاں جو ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ملت کے اندر جاری ہیں وہ ہرگز جہاد نہیں ہیں۔ یہ جہاد کے نام پر اپنے جان ومال کو ضائع کرنا ہے۔

جہاد دراصل اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے۔ اور اللہ کا کام دعوت الی اللہ ہے۔ اہل ایمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ممکن قوتوں کو دعوت الی اللہ کے میدان میں لگائیں۔ وہ دوسری قوموں کو ہدایت خداوندی کے راستہ پر لانے کی کوشش کریں۔ یہی اہل ایمان کا اصل جہاد ہے۔

مسلمانوں کو اس اصل جہاد کا صحیح احساس نہیں۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کو اپنے لئے حرام سمجھ لیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتوں میں الجھنے سے داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ختم ہوتی ہے اور معتدل فضا کے بغیر کسی کو کوئی دعوت نہیں دی جا سکتی۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ چھوٹی چھوٹی ناخوشگواریوں کو برداشت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ یقینی طور پر خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مدعو اقوام سے لڑ پڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ان کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ یہ یقینی طور پر نفسانیت ہے نہ کہ خدائی جہاد۔

تاریخ کا نوشتہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ کو تہران کے قصر گلستاں میں ایک بے حد شاندار جشن منایا گیا۔ یہ سابق شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی تھی۔ اس موقع پر جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا اس کے اخراجات کی مقدار اربوں روپے تک پہنچتی ہے۔ اس زمانے میں راقم الحروف نے "شاہ ایران کی تاج پوشی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں جشن کی مسرفانہ تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں لکھا تھا۔

"یہ شاہ قسم کے لوگ بھی حالات سے کتنا بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ عوامی انقلاب کے آتش فشاں پہاڑ کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے اس آتش فشاں کو کچھ اور چنگاریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو ان جھوٹے مظاہروں میں سرمایہ خرچ کرنے کے بجائے وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے خرچ کرتے۔ اس طرح اگرچہ ان کے اصلی عیش اور اقتدار میں کمی نہ ہوتی مگر عوام کو خوش کر کے وہ اپنی شہنشاہیت کی عمر کو ضرور طویل کر سکتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ اس دنیا میں حقیقی فکرِ آخرت تو نایاب ہے ہی، دانش مندانہ قسم کی دنیا پرستی بھی نایاب ہے۔ زیادہ تر لوگ بے سوچے سمجھے زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بے شعوری کے انجام سے دو چار ہوتے ہیں اس وقت انھیں ہوش آتا ہے۔ مگر اس وقت کا ہوش آنا کچھ کام نہیں دیتا" (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی ۳ نومبر ۱۹۶۷)

مذکورہ تحریر کے تقریباً ساڑھے گیارہ سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں یہ واقعہ ہوا کہ رضا شاہ پہلوی کو اپنا اقتدار اور اپنا تمام جاہ و حشمت چھوڑ کر ایران سے جانا پڑا۔ وہ نہایت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ایک مغربی اسپتال میں مر گئے۔

اس کے بعد ایران میں آیت اللہ خمینی کا دور شروع ہوا۔ فروری ۱۹۷۹ میں جب آیت اللہ خمینی چارٹرڈ ہوائی جہاز کے ذریعہ پیرس سے تہران پہنچے اور سارا ایران خمینی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خمینی اسلام کے نام پر ایران میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ ساری دنیائے اسلام میں اس بات پر خوشی منائی گئی کہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔

تاہم اس معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے عام لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ جس زمانہ میں
رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جدید حکمراں بھی بالآخر وہی ثابت ہوں گے جو ان سے پہلے کے حکمراں

اسلام کا عطیہ

فرانس کے حکمراں نپولین بونا پارٹ نے سوئز میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مصر میں اپنی فوجیں داخل کر دی تھیں۔ اور مصر کو فرانس کے قبضہ میں لے لیا تھا۔ ۱۷۹۸ میں جب نپولین اسکندریہ میں داخل ہوا تو اس نے عربی زبان میں ایک منشور شائع کیا اور اس کو مصر کے تمام شہروں میں تقسیم کیا۔ اس منشور کا آغاز حسب ذیل الفاظ سے ہوتا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، لا الٰہ الا اللہ، لا ولد لہ ولا شریک لہ فی ملکہ۔ من طرف الفرنساویۃ المبنی علی اساس الحریہ والتسویہ ---

یعنی شروع اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور اس کے اقتدار میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ (یہ منشور) فرانس کی طرف سے ہے جس کا نظام آزادی اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہے۔

الاسلام والفکر المعاصر للدکتور حلمی مرزوق، دار النھضۃ العربیہ، بیروت ۱۹۸۲، صفحہ ۲۹

نپولین نے بظاہر اپنے اس منشور میں (سیاسی مصلحت کے تحت) اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے توحید کو اسلامی عطیہ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے آزادی اور مساوات کو مغربی تہذیب کی دین قرار دیا ہے۔ گویا کہ دنیا کو اگر توحید اسلام کے ذریعہ ملی تو آزادی اور مساوات اس کو فرانس کے انقلاب کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح توحید کی نعمت انسان کو عملاً اسلامی انقلاب کے بعد ملی، ٹھیک اسی طرح آزادی اور حریت کا تحفہ بھی اس کو اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں ملا ہے۔

غیر اللہ کو عظمت دینے کا نام شرک ہے اور اسی غیر خدائی عظمت کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج آزادی اور حریت سے محروم تھا۔ شرک نے کچھ انسانوں کو پیدائشی طور پر برتر ٹھہرا کر دوسرے انسانوں کو ان کے مقابلہ میں پیدائشی طور پر کمتر ٹھہرا رکھا تھا۔ توحید نے ایک خدا کے مقابلہ میں سب کو یکساں حیثیت دیدی۔ توحیدی انقلاب کے بعد تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس نے بالآخر تمام انسانوں کو برابر ثابت کر کے انہیں اس ارتقائی مرحلہ تک پہنچایا جس کو انسانی آزادی اور انسانی مساوات کہا جاتا ہے۔

قدردانی

خلیفہ عبدالحکیم ابتدائے عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ طویل رخصت پر انگلستان گئے تو یہ جگہ خالی ہوگئی۔ مولانا عبدالباری ندوی (۱۸۹۰-۱۹۷۶) قائم مقام صدر کی حیثیت سے اس عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے پرائیوٹ طور پر انگریزی پڑھی تھی۔ مگر سند کے اعتبار سے ان کے پاس میٹرک کی سند بھی نہ تھی۔ ان کے تقرر میں خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا حصہ تھا جو اس وقت حیدر آباد میں صدرالصدور تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد میں ۱۹۲۲ سے لے کر ۱۹۴۵ تک رہے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

" حیدرآباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش ہوئی۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں گزیٹڈ پوسٹ پر استقلال کے لئے خود اعلیٰ حضرت کی منظوری ضروری تھی۔ ابھی غالباً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی میں (شروانی صاحب کے کسی مہربان) نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ شروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنوا دیا ہے جس کو فلسفہ تو کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے شیروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ شیروانی صاحب نے میرا رسالہ " مذہب اور عقلیات " کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کر کے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہٰذا کی چند سطروں سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے استقلال کی کارروائی پر اپنے دستخط کر دئے۔"

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸) کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ کے گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے ایک بار ان سے دریافت کیا " کیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا موزوں شخص ہے جس کو حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا جائے "۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے مولوی میر حسن کا نام تجویز کیا جو اس وقت مرے کالج سیالکوٹ میں استاد تھے۔ گورنر نے کہا " میں نے ان کا نام آج پہلی بار آپ کی زبان سے سنا ہے۔ کیا مولوی صاحب نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے "۔ علامہ اقبال نے جواب دیا " ان کی لکھی ہوئی تصنیف تو نہیں۔ البتہ ان کی ایک زندہ تصنیف ضرور موجود ہے "۔ گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ " یہ زندہ تصنیف کیا ہے "۔ علامہ اقبال نے کہا " میں ان کی زندہ تصنیف ہوں، وہ میرے محترم استاد ہیں "۔ گورنر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور جلد ہی ایک سادہ تقریب میں مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دے دیا گیا۔

منفی جوش

وکٹر ہیوگو (۱۸۸۵ — ۱۸۰۲) فرانس کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کے زمانہ میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرلیا۔ وکٹر ہیوگو ایک بار الجزائر گیا۔ وہ کسی ہوٹل میں تھا کہ وہاں کچھ الجزائری مسلمان آگئے۔ ان مسلمانوں کو فرانسیسی "کی صورت سے پہلے ہی سے نفرت تھی۔ وہاں اتفاق سے ایک الجزائری مسلمان اور وکٹر ہیوگو کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ فوراً دونوں کے درمیان اشتعال پیدا ہوگیا، یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آگئی۔ الجزائری مسلمان طاقت ور تھا۔ اس نے وکٹر ہیوگو کو خوب مارا۔

اس موقع پر وہاں اور بھی کئی الجزائری مسلمان موجود تھے۔ مگر انھوں نے وکٹر ہیوگو کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک "فرانسیسی" کے مارے جانے پر وہ خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے رہے۔ آخر میں وکٹر ہیوگو نے کہا —— اب تو میں اپنے ملک واپس جارہا ہوں۔ مگر جلد ہی ایک ایسا کام کردوں گا جو نہ صرف تم سے بلکہ تمھاری نسلوں تک سے اس کا انتقام لیتا رہے۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وکٹر ہیوگو کی لکھی ہوئی سیرت کی کتاب شائع ہوئی جس کے ایک ایک فقرے میں پیغمبر اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کے سابق سفیر برائے فرانس مسٹر قدرت اللہ شہاب نے اس کی تردید میں ایک کتاب لکھی اور اس کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

مسلمان اس کے لئے بہت جلد تیار ہوجاتے ہیں کہ وہ "معاندین اسلام" کو ذلیل کریں اور ان سے کفر و اسلام کے نام پر لڑائی لڑیں۔ اسی طرح ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی مخالفانہ تحریروں کا تیز و تند زبان میں جواب دیں۔ مگر ایسے لوگ ان کے درمیان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جو ان "معاندین اسلام" کو اسلام کا مدعو سمجھیں اور مثبت انداز میں دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو اسلام کی طرف بلائیں۔

اس قسم کی "خدمت اسلام" سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ یہ بہت بڑا نقصان ہوتا ہے کہ وہ معتدل فضا ختم ہوجاتی ہے جس میں دوسری قومیں اسلام پر غور و فکر کریں۔ دوسری قومیں جب ہمارے لئے نفرت کا موضوع بن جائیں تو ان کے لئے ہمارا دین محبت کا موضوع کیوں بنے گا۔

تھوڑا وقت زیادہ کام

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ — ۱۸۱۷) نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا: وقت کم ہے اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوجاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں (لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین، ۱۸۹۰، صفحہ ۲۴۲)

سرسید نے جو بات اپنے لئے کہی وہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے۔ ہر انسان اس مسئلہ سے دوچار ہے کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہے۔ مگر اس کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ کام کرنا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ اپنے اوقات کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ ہوجائے، نہ صرف غیر ضروری بلکہ کم ضروری کاموں سے بھی دور رہ کر وہ صرف انتہائی ضروری کاموں میں مشغول رہے۔

پھر اگر اس معاملہ کو آخرت تک لے جائیے تو معاملہ اور زیادہ نازک ہوجاتا ہے۔ آخرت ایک ابدی جگہ ہے وہاں آدمی کو ہمیشہ ہمیش تک رہنا ہے۔ مگر آخرت کے لئے کام کرنے کا موقع آدمی کو صرف اس محدود مدت تک ملتا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس دنیا سے اٹھتے ہی آخرت کے لئے عمل کرنے کا موقع ختم ہوجائے گا۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی عمر کتنی کم ہوتی ہے اور اس کا انجام اس کو کتنی زیادہ لمبی مدت تک بھگتنا ہے، آدمی کو اگر واقعی معنوں میں اس کا احساس ہوجائے تو وہ اتنا زیادہ محتاط اور سنجیدہ ہوجائے کہ اپنے اوقات کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی اس کو ایسا معلوم ہو کہ جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

ایک مزدور کے پاس صرف اتنا پیسہ ہو جس سے وہ اپنی دو وقت کی روٹی کا انتظام کر سکے تو وہ اس پیسہ کو محفل رقص کا ٹکٹ خریدنے میں ضائع نہیں کرے گا۔ کسی پیدل مسافر کے پاس اگر اتنا ہی وقت ہو کہ وہ رات کے اندھیرے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے تو وہ راستہ کی تفریح میں مشغول ہو کر یہ خطرہ مول نہیں لے گا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔

مگر آدمی جس بات کو اپنی دنیا کے معاملہ میں بخوبی جانتا ہے اسی کو وہ آخرت کے معاملہ میں بالکل بھول جاتا ہے۔ آدمی کے پاس آخرت کے عمل کے لئے تھوڑا وقت اور بہت معمولی اثاثہ ہے۔ مگر ہر ایک اس کو وقتی تماشوں میں اِس طرح ضائع کر رہا ہے جیسے کہ اسے آخرت کی کوئی خبر ہی نہیں۔

بے فائدہ باتیں

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ – ۱۹۴۳) کو ایک شخص نے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ فلاں شرعی مسئلہ کی حکمت کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا: حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا کے فعل کی حکمت ہم سے پوچھتے ہو، ہم خود تمھارے فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنا احتساب کریں، اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دیں۔ البتہ خارجی مسائل میں موشگافیاں نکالنے اور ان کی حکمتیں معلوم کرنے کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ذہن قطعاً غیر اسلامی ہے۔ جن لوگوں کا ذہنی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے وہ کبھی حق کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کمانے اور گھر بنانے کا معاملہ ہو تو ہر آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی کمائی اچھی ہو جائے اور اس کا مکان اچھا بن جائے۔ مگر دین اور آخرت کا معاملہ ہو تو ہر آدمی ایسے مسائل پر بحث کرنا پسند کرتا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو۔

ایک بزرگ جنھوں نے ایک بڑے ادارہ میں ۳۰ سال فتویٰ نویسی میں گزارے تھے، انھوں نے کہا کہ اس پوری مدت میں ہمارے پاس جو استفتار آتے رہے وہ زیادہ تر دوسروں کے بارے میں تھے۔ اپنے بارے میں بہت کم ہم سے کسی نے سوال کیا۔ فلاں کی جائداد میں میرا کتنا حصہ بنتا ہے۔ فلاں شخص جو ایسا اور ایسا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز، وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات تو بہت آتے رہے مگر کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ اس کی اپنی شرعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ اپنے صاحب معاملہ کے حقوق کس طرح ادا کرے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ اختلاف اور شکایت کے موقع پر لوگوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔ فلاں شخص جس کو وہ ستا رہا ہے اس کو ستانا اس کے لئے جائز ہے یا ناجائز۔ فلاں آدمی جس کا اس نے پیسہ دبا رکھا ہے وہ اس کو دبانا چاہئے یا نہیں دبانا چاہئے۔ فلاں شخص جس کو وہ بے عزت کر رہا ہے وہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں۔

آدمی دوسروں میں گم رہتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے آپ میں گم ہونا چاہئے۔ وہ خارجی مسائل میں جیتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے اندرونی مسائل میں جینا چاہئے۔ وہ دوسروں کے دین وایمان کو ناپتا ہے حالاں کہ اس کو وہ پیمانہ حاصل کرنا چاہئے جس میں وہ اپنے دین وایمان کو ناپ سکے ——— باہر دوڑنے والے بدجانور کی خبر ہر ایک کو ہے مگر اپنے دماغ میں بغض اور انتقام کے جو بدجانور بسیرا لئے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں۔ عبادت گاہ کے باہر کا تماشا ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے مگر عبادت گاہ کے اندر ہونے والا تماشا کسی کو نظر نہیں آتا۔

کتنا فرق

۱۹۲۸ میں کلکتہ میں ایک ہی زمانہ میں دو اجلاس ہوئے۔ ایک کانگریس کا، دوسرا تحریک خلافت کا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور مولانا محمد علی تحریک خلافت کے۔ خان عبدالغفار خاں اپنے کچھ پٹھان ساتھیوں کو لے کر کلکتہ گئے اور دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ خان عبدالغفار خاں اپنا ایک تاثر اپنی خودنوشت سوانح عمری میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"گاندھی جی (کانگرس کے اجلاس میں) تقریر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بار بار کھڑا ہو جاتا تھا اور گاندھی جی پر سخت حملے کرتا تھا۔ گاندھی جی بالکل غصہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ منھ کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس پڑتے تھے۔ اس کا میرے اوپر بڑا اثر ہوا۔ جب میں واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگذشت اپنے ساتھیوں کو سنائی اور کہا کہ دیکھو یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنے مسلمان لیڈروں کے اخلاق کو دیکھو۔

اس وقت ہم کچھ پٹھان لوگ (خلافت کانفرنس میں) محمد علی کے پاس گئے کہ یہ ہمارا لیڈر ہے، اس کے ساتھ اس بارہ میں چند باتیں کریں۔ محمد علی باہر آئے تو ہم نے ان سے اس طریقہ سے اپنی بات کہنی شروع کی کہ محمد علی صاحب، آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کل ہم کانگرس کے اجلاس میں گئے تھے تو وہاں گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بعض نوجوان اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی وجہ سے ان کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا نہیں ہوئی۔ پھر میں نے کہا کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں تو یہ بہت ہی اچھا ہو گا۔

محمد علی صاحب ہماری باتیں سنتے ہی بڑے ناراض اور غضب آلود ہوئے اور کہا کہ دیکھو، یہ جنگلی پٹھان ہمیں سمجھانے آئے ہیں اور پھر ہم کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم ان کے اس رویہ سے بڑے مایوس ہوئے اور ناراض بھی۔ اور میں تو پھر اس کے بعد خلافت کے ان جلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوا اور چلا آیا۔ واپس اپنے گاؤں جا کر میں نے اپنے پختون ساتھیوں سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ کلکتہ میں میں خلافت اور کانگرس دونوں کے جلسوں میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہمارے مسلمان لیڈروں اور ہندوؤں کے لیڈروں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایک طرف غصہ کے جذبات بھڑکتے دکھائی دئے اور دوسری طرف محبت اور پریم سے باتیں کی جاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی واقعی ہندوؤں کے ہی لیڈر نہیں رہیں گے بلکہ وہ مسلمانوں کی لیڈری بھی کریں گے۔ ان کا مزاج گرم نہیں۔ بلکہ ان کے جذبات ٹھنڈے ہیں۔ وہ گالیاں کھا کر بھی ہنس دیتے ہیں۔

صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۷۷ ۱۹ ـــ ۱۸۹۶) مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ ـــ ۱۸۸۷) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا سہیل کی علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے زمانہ کا ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ کا واقعہ ہے۔ یونین میں "ام الالسنہ عربی" پر پروفیسر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔ مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے۔ یونین میں مجمع دیکھا تو کہا: مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سننے چلیں۔ مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے، جلد اٹھ آئیں گے۔ سب لوگ یونین میں آئے۔ مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے۔ سر پر اونی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا پچھا (شیڈ) لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک تقریر کی۔ حاضرین محو حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچا دیا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میز کے پاس کھڑے کیے گئے۔ تھوڑی سی ناک، اس سے ذرا بڑی تھوڑی اور ہاتھ کی صرف انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کر دی۔ اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لیے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا سہیل نے بھی "ام الالسنہ عربی" پر تقریر شروع کی۔ پون گھنٹہ تک تقریر کی۔ نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی۔ نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دل نشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ کمال الدین نے بے اختیار ہو کر مولانا کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا: "تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں" (مضامین رشید، صفحہ ۳۴)

مولانا اقبال احمد سہیل ایم اے، ایل ایل بی غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ سارو دکے علاوہ ان کو عربی، انگریزی اور فارسی پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر یہ ہیں:

اگر کچھ مرتبہ چاہے تو اس ہستی کو پامال کر — کہ دانہ بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر
اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو — ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرِقو کی

اسلامی دعوت کا کام وہ انتہائی اعلیٰ معیار کے ساتھ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی تمام صلاحیتیں شاعری اور وکالت کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جو فطرت سے اعلیٰ درجہ کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے۔ مگر ان کی اعلیٰ صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے لگے رہے یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے گئے۔

ایک اہم کتاب

مستشرقین کے جواب میں موجودہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر ان کا اصل جواب یہ ہے کہ علوم اسلام پر ایسی اعلیٰ کتابیں تیار کی جائیں جو اپنی تحقیق اور معلومات کے اعتبار سے مستشرقین کی باتوں کا مثبت جواب بن جائیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ہم عظیم ترکی عالم فواد سیزگین (Fuad Sezgin) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اس میدان میں انتہائی قابل قدر کام انجام دیا ہے۔

موصوف نے ۲۵ سالہ مطالعہ کے بعد حسب ذیل کتاب جرمن زبان میں تیار کی ہے:

Geschichte des Arabischen, Schrifttums, Leiden, 1967

اس کتاب کا معیاری عربی ترجمہ دکتور محمود فہمی حجازی اور دکتور فہمی ابو الفضل نے کیا ہے۔ اس کا نام تاریخ التراث العربی ہے۔ وہ تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کو الھیئۃ المصریۃ العامہ للکتاب، قاہرہ نے ۱۹۷۸ میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد تین حصوں پر مشتمل ہے اور اسی طرح دوسری جلد بھی:

المجلد الاول: علوم القرآن

علم الحدیث

التدوین التاریخی الی غایۃ سنۃ ۴۳۰ ہجریۃ تقریباً

المجلد الثانی: الفقہ

العقائد

التصوف الی غایۃ سنۃ ۴۳۰ ہجریۃ تقریباً

کتاب کی تیسری جلد تاریخ شعر عربی سے متعلق ہے۔

ہر فصل کے شروع میں نہایت قیمتی مقدمہ ہے جس میں خالص علمی اور تاریخی انداز میں متعلقہ فصل کا تعارف ہے۔ اس کے بعد صحابہ سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی نصف تک ایک ایک اسلامی شخصیت کے حالات اور کارنامہ کا محققانہ تذکرہ ہے جو ان موضوعات پر مستند حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ کتاب بلاشبہ اپنی قسم کی واحد کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ تمام اسلامی اداروں کے کتب خانوں میں کتب حوالہ کی الماری میں موجود ہو۔ اس موضوع پر ماضی میں متعدد قیمتی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ابن الندیم کی الفہرست (۳۷۷)، طاش کبری زادہ (م ۹۶۸ھ) کی مفتاح السعادۃ۔ حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) کی کشف الظنون۔ اسماعیل البغدادی (م ۱۳۳۹ھ) کی ہدیۃ العارفین۔

ملت کا سرمایہ

ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (پیدائش ۱۹۴۵) عربی اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی طور پر جانتے ہیں اور ایک زبان سے دوسری زبان کا برجستہ ترجمہ کر سکتے ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں میں نے انھیں قلم کاغذ دیا اور کہا کہ میں ایک انگریزی عبارت بولتا ہوں، اس کو آپ اس کاغذ پر لکھیں اور پھر اس کا ترجمہ عربی زبان میں کریں۔ یہ انگریزی عبارت الرسالہ جولائی ۱۹۸۲ (صفحہ ۱۴) کی تھی جو کہ حسب ذیل ہے:

You've removed most of the roadblocks to success when you've learnt the difference between motion and directon

میں رک رک کر انگریزی عبارت بول رہا تھا اور وہ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے بولنا ختم کیا، انھوں نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میرے ذہن میں تھا کہ انھوں نے انگریزی عبارت لکھی ہے اور اب مطابقت دیکھنے کے لئے کاغذ مجھے دے رہے ہیں تاکہ اس کے بعد اس کا عربی ترجمہ کریں۔ مگر میں نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ کاغذ پر صرف عربی ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ میں جب انگریزی عبارت بول رہا تھا اسی وقت وہ ساتھ ساتھ اس کا عربی ترجمہ لکھتے جا رہے تھے۔ ان کا عربی ترجمہ یہ تھا:

لقد عزلتم معظم عوائق الشارع نحو النجاح عند ما عرفتم الفرق بين الحركة والاتجاه

ملت کے اندر اس طرح کے کتنے نوجوان ہیں جو نادر صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ ملت کا اثاثہ ہیں۔ مگر یہ اثاثہ ملت کے کام نہیں آتا، اس قسم کے تمام لوگوں کو اغیار مہنگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور ان کو دوسرے دوسرے کاموں میں لگا دیتے ہیں، اسلام کے فرزند اسلام کے کام نہیں آتے۔

اسلام کے محاذ پر ہر طرف کمتر صلاحیت کے لوگ لگے ہوئے ہیں اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ دوسرے محاذوں پر اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اسی مسئلہ کے حل پر ملت کے نئے مستقبل کا راز چھپا ہوا ہے۔

کام سے پہلے کام کی بنیاد تیار کیجئے

علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ۱۸۷۵ میں ہوا۔ ۱۹۲۰ میں مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ مگر مسلمانوں کے اس سب سے بڑے تعلیمی ادارہ میں تجارتی تعلیم (کامرس) کا شعبہ پہلی بار ۱۹۴۵ میں قائم ہو سکا۔ یعنی ادارہ کے ابتدائی قیام کے ۷۰ سال بعد۔

یونیورسٹی میں تجارتی شعبہ کے قائم ہونے کا لطیفہ بڑا سبق آموز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) مجوزہ میڈیکل کالج کے چندہ کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کان پور پہنچے۔ وہاں چندہ کی مہم کے دوران ایک تاجر نے پوچھا "آپ کو اپنے میڈیکل کالج کے لئے سب سے زیادہ چندہ کس طبقہ سے ملا" ڈاکٹر ضیاء الدین نے بتایا کہ تاجروں سے۔ تاجر نے کہا: جب قومی منصوبوں میں زیادہ تعاون آپ کو تاجروں سے ملتا ہے تو قوم کو تجارتی ترقی کی راہ پر لانے کے لئے آپ اپنی یونیورسٹی میں تجارتی تعلیم کا شعبہ کیوں نہیں کھولتے۔ اس واقعہ سے سابق وائس چانسلر کو احساس ہوا اور واپس آکر انھوں نے اس کی کوشش شروع کی یہاں تک کہ ۱۹۴۵ میں پہلی بار مسلم یونیورسٹی میں کامرس کا شعبہ کھولا گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر صرف جزئی طور پر صادق آتا ہے۔ مگر ہماری عام قیادت کی وہ مکمل تصویر ہے۔ ہمارے لیڈروں کا یہ حال ہے کہ ان کی ساری بنیاد قومی چندہ پر قائم ہے۔ وہ آئے دن قوم سے چندہ مانگنے کے لئے نئی نئی اسکیمیں لے کر اٹھتے رہتے ہیں۔ مگر یہ لیڈر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو چندہ دینے کے قابل بنانے کے لئے بھی ان کے درمیان کوئی منصوبہ چلائیں اور اس کے لئے جدوجہد کریں۔

کسی منصوبہ کی کامیابی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قوم کو اس کے لئے تیار کیا جا چکا ہو۔ اگر آپ "مسلمانوں کا انگریزی اخبار" وجود میں لانا چاہتے ہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہو جو انگریزی میں اخبار کے مطالعہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک مسلم یونیورسٹی حقیقی معنوں میں مسلم یونیورسٹی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ آپ مسلم نوجوانوں میں محنت اور جدوجہد کا اتنا حوصلہ پیدا کر دیں کہ وہ امتیازی لیاقت پیدا کر کے مسلسل اس پر اپنا قبضہ باقی رکھ سکیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اردو زبان باقی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ عوام میں اردو لٹریچر کی طلب اتنی بڑھ جائے کہ خود اپنے بل پر اس کے تحفظ کا انتظام ہو جائے۔

یہی معاملہ ملی تعمیر کے تمام شعبوں کا ہے۔ اگر آپ ملت کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے فرد کو اٹھانے کا انتظام کیجئے۔ اگر آپ ملی ترقی کے لئے کوئی اقدام کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے ابتدائی سطح پر ضروری تیاریاں کر لیجئے۔ "چھت" والے آپ اسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ "بنیاد" کی سطح پر آپ نے اپنے حصہ کا کام پورا کر لیا ہو ——

● صلاحیتیں جو سیاست کی نذر ہوگئیں

مولانا شبلی نعمانی کی کوششوں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی پہلی عمارت بنی تو مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اس کی صدارت کے لئے سید رشید رضا مصری کو بلایا۔ رشید رضا نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی جو ڈھائی گھنٹہ تک جاری رہی۔ تقریر کے ترجمہ کے لئے پہلے سے کسی کو تیار نہیں کیا گیا تھا۔ آخر میں مولانا شبلی نے کھڑے ہوکر کہا "کون اس تقریر کا اردو ترجمہ کرے گا" مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت ڈائس پر موجود تھے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ مولانا شبلی نے یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ مولانا آزاد نے ڈھائی گھنٹہ کی اس عربی تقریر کا ترجمہ ڈھائی گھنٹہ میں کیا۔ ان کے حافظہ نے ٹیپ ریکارڈ کی طرح پوری تقریر کو محفوظ کر لیا تھا اور انھوں نے مسلسل اس کو اپنی زبان میں بیان کر دیا۔

● آخرت کے بجائے سیاست

مولانا عبیداللہ سندھی (۱۹۴۴ - ۱۸۷۲) ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک اردو مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کو ایک اردو کتاب پڑھنے کو ملی۔ یہ مولانا محمد لکھنوی کی احوال الآخرت تھی۔ اس کتاب نے ان کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ انھوں نے بار بار اس کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۸۸۷ میں اسلام قبول کر لیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جس کو آخرت کے احوال نے اسلام کی طرف کھینچا تھا، وہ اپنی تمام عمر لوگوں کو سیاست کے احوال بتانے میں مشغول رہا۔ یہاں تک بہتر سال کی عمر میں اس دنیا سے چلا گیا۔

● غیر پختہ نوجوان ان کی تحریک کا سرمایہ تھے

انیسویں صدی کے ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خلاف جن لوگوں نے سیکولر قومی تحریک چلائی، وہ بعد کو انجمن اتحاد و ترقی کی صورت میں منظم ہوگئے۔ کمال اتاترک (۱۹۳۸ - ۱۸۸۱) اس کے لیڈر تھے۔ خالدہ ادیب خانم اس انجمن کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> "اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے۔ ابتدا میں ان میں ایک شخص بھی نہ تھا جو اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب تھے اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں" (ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش)

خالدہ ادیب خانم نے جو بات ترکی کے بارے میں لکھی ہے، وہی موجودہ زمانہ کی اکثر مسلم تحریکوں پر صادق آتی ہے۔

جذباتی نہ بنو

۱۹۸۲ کے آخر میں دہلی میں ایشیائی کھیلوں کے مقابلے ہوئے جن کو عام طور پر ایشیاڈ (ASIAD) کہا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں مجموعی طور پر انڈیا نے تیرہ سونے کے میڈل حاصل کئے اور پاکستان نے صرف تین۔ مگر خود انڈیا اور پاکستان کے درمیان یکم دسمبر ۱۹۸۲ کو جو مقابلہ ہوا اس میں پاکستان کے مقابلہ میں ہندستانی ٹیم بری طرح ہار گئی۔ یہ دونوں کے درمیان ہاکی فائنل کا مقابلہ تھا اور انڈیا ایک اور سات کے تناسب سے پاکستانی ٹیم سے ہار گیا۔

ایشیاڈ کے تمام کھیلوں کے مقابلہ میں یکم دسمبر کا یہ کھیل سب سے زیادہ ہندستانیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس دن غیر معمولی زور و شور رہا۔ چنانچہ جب نتیجہ سامنے آیا تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں نے خوب خوب تبصرے کئے۔ ان تبصروں میں ایک تبصرہ خاص طور پر بہت سبق آموز تھا۔

ایوننگ نیوز (۲ دسمبر ۱۹۸۲) نے کل کے دن کیا غلطی ہوئی (What went wrong yesterday) کے عنوان سے ایک رپورٹ چھاپی تھی۔ اس میں رپورٹر نے بہت سے ہندستانیوں کے تبصرے درج کئے تھے۔ ایک سینئر جرنلسٹ کے حوالے سے یہ جملہ نقل کیا گیا تھا:

Whenever Indians play against Pak they are all nerves and this affects their game.

جب بھی ہندستان والے پاکستانیوں سے کھیلتے ہیں تو وہ بالکل جذباتی ہو جاتے ہیں اور یہ چیز ان کے کھیل کو متاثر کرتی ہے۔

کامیابی ہمیشہ اس کا نام ہوتی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو بخوبی طور پر کام میں لائے۔ مگر جب آدمی کسی معاملہ میں جذباتی ہو جائے تو اس کے جذبات اس کی عقل پر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔ اور مقابلہ کی اس دنیا میں عقل کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے ہی کا دوسرا نام ناکامی ہے۔

اگر آج کسی سے آپ کو تکلیف پہنچے تو سوچ سمجھ کر کل اس کا جواب دیجئے۔ کسی کی ایک کارروائی سے آپ کے اندر غصہ پیدا ہو تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے اور اس کے بعد اس کے مقابلہ کے لئے اٹھئے۔ کوئی شخص آپ کو حقیر معلوم ہو تو اپنے ذہن میں اس کو برابر کی سطح پر لائیے اور پھر اس کے خلاف کارروائی کیجئے ——— یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

عبرت ناک

قاضی نذرالاسلام بنگلہ زبان کے مشہور شاعر تھے۔ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کو جب نوبل انعام ملا تو نذرالاسلام نے ان کو مبارک باد کا خط بھیجا۔ اس کے جواب میں ٹیگور نے جو خط لکھا تھا وہ ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔ اس میں ٹیگور نے نذرالاسلام کو لکھا: نوبل انعام کے اصل مستحق تم تھے، میں نہیں۔

نذرالاسلام نہایت پرجوش انقلابی شاعر تھے۔ وہ آزادی کی حمایت میں اور انگریزی استعمار کے خلاف شعلہ بار نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے نوجوانوں میں آزادی کے جذبات بھڑکتے تھے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے نذرالاسلام کو گرفتار کرکے رانچی کے جیل میں قید کر دیا۔ وہاں ان کو جس کمرہ میں رکھا گیا وہ قلم، سیاہی اور کاغذ جیسی چیزوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کے لئے بظاہر ناممکن بنا دیا گیا کہ وہ کچھ لکھ سکیں۔

قاضی نذرالاسلام کے دماغ میں آزادی کے ترانے ابلتے تھے مگر وہ اپنے قید کے کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے تھے جس سے وہ ان کو لکھ سکیں۔ بالآخر انھوں نے یہ کیا کہ شیو بنانے کے بلیڈ سے اپنی انگلی کو زخمی کیا جس کے نتیجہ میں انگلی سے خون جاری ہوگیا۔ اب انھوں نے اپنی انگلی کو قلم بنایا اور خون کو روشنائی اور پھر جیل کی دیواروں پر آزادی کے اشعار لکھ ڈالے۔

غالباً یہی واقعہ ہے جس کے بارے میں فیض احمد فیض نے اپنا شعر کہا:

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے ۔۔۔ کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ مگر یہ تمام قربانیاں حقیقۃً قوم اور وطن اور سیاست کی راہ میں تھیں۔ اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کے لئے انھوں نے اپنے خون کو روشنائی بنا ڈالا۔ اور قومی مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے جان ومال کو لٹا دیا۔ مگر پوری جدید تاریخ میں کوئی بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے دعوت کی راہ میں اپنے آپ کو ہلکان کیا ہو۔

مسلمان کا اصل مقصد اقوام عالم تک خدا کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اسی ایک کام کو نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں ان کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔ یہی واحد سب سے بڑی کوتاہی ہے جس کی بنا پر مسلمان موجودہ زمانہ میں خدا کی نصرت کے مستحق نہ ہو سکے۔

خبر غلط تھی

نیل آرم اسٹرانگ مشہور امریکی خلاباز ہیں۔ وہ تاریخ کے پہلے انسان ہیں جنہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو چاند پر قدم رکھا۔ وہ اس سے پہلے امریکہ کے خلائی ادارہ ناسا (NASA) سے متعلق تھے۔ اب اس سے الگ ہو کر وہ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

پچھلے دنوں ملیشیا کے اخبار اسٹار (۱۰ جنوری ۱۹۸۳) اور سری لنکا کے ڈیلی نیوز پیپر (۲۹ جنوری ۱۹۸۳) میں ایک خبر چھپی جو بہت جلد دوسرے مسلم اخبارات میں نقل ہو کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یہاں ہم اسٹار کی خبر اور اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

دنیا کے مشہور خلاباز آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنہوں نے چاند پر قدم رکھا۔ وہ اس کے بعد سے مسلمان ہو گئے ہیں اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جب پہلی بار انہوں نے چاند پر قدم رکھا تو انہوں نے وہاں ایک آواز سنی جو ان کے لئے اور ان کے ساتھیوں کے لئے بہت صاف تھی۔ اس وقت ان کو خیال آیا کہ ان کے کانوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس وقت وہ چاند کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اور ان پر ایک استعجاب کی کیفیت طاری تھی۔ بعد میں وہ مختلف ملکوں میں لیکچر دینے کے لئے گئے۔ اس دوران وہ قاہرہ (مصر) بھی گئے۔ وہاں انہوں نے وہی آواز دوبارہ سنی جو انہوں نے چاند پر سنی تھی۔ انہوں نے اپنے قریب کے مصری ساتھی سے پوچھا کہ یہ آواز کیا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ اذان ہے جو عبادت کی پکار ہے اور اس میں خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ آرم اسٹرانگ کو بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ ان کے حافظہ کے مطابق وہی آواز اور وہی الفاظ تھے جو انہوں نے چاند پر سنے تھے۔ اس وقت انہوں نے اسلام کے متعلق جاننے کا

فیصلہ کیا اور بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی قابل رشک ملازمت کھودی۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ میں نے خدا کو پالیا ہے۔ اور اب کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہ خبر دوسرے اخبارات میں نقل ہوئی تو اس میں مزید اضافے بھی کر دیئے گئے۔ مثلاً یہ کہ آرم اسٹرانگ نے چاند کی آواز کو ٹیپ ریکارڈ کرلیا تھا اور زمین پر آکر اذان کی آواز کو اس سے ملایا۔ وغیرہ۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک خط مسٹر آرم اسٹرانگ کو لکھا تھا۔ انہوں نے اس خبر کی تردید کی ہے اور اس کو بے بنیاد بتایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ذاتی دستخط سے جو جواب موصول ہوا ہے اس کا عکس علٰحدہ صفحہ پر دیا جارہا ہے۔ آرم اسٹرانگ اپنے جواب میں لکھتے ہیں:

آپ کے خط کا شکریہ۔ میرے اسلام قبول کرنے کی خبریں، اذان کی آواز کو چاند پر اور اس کے بعد قاھرہ میں سننا، سب خلاف واقعہ ہیں۔ میں کبھی مصر نہیں گیا۔ ملیشیا، انڈونیشیا اور دوسرے مقامات کے کچھ رسالوں اور اخبارات نے یہ خبریں بغیر تصدیق کئے ہوئے چھاپی ہیں۔ اس نااہل صحافت نے آپ کو جو بھی زحمت دی ہو اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں ———

خلوص کے ساتھ، آرم اسٹرانگ

خبر کے مطابق اس واقعہ میں حکومت امریکہ بھی ملوث تھی۔ کیونکہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مسٹر آرم اسٹرانگ کی سرکاری ملازمت ختم کر دی گئی ہے۔ اس بنا پر خود حکومت امریکہ نے بھی اس کی تردید کا اہتمام کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے امریکن سینٹر میں ایک خصوصی ٹیلی پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اخبارات کے نمائندوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ٹیلی فون کے ذریعہ براہ راست آرم اسٹرانگ سے بات کریں۔ اس ٹیلی پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے امریکی خلاباز نے اپنے قبول اسلام کی تردید کی (ہندستان ٹائمس ۱۳ مئی ۱۹۸۳) مزید انہوں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات کبھی ان کے سامنے نہیں آئیں اور نہ انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے:

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے آرم اسٹرانگ اور ان جیسے دوسرے بندگان خدا کے سلسلہ میں اپنی تبلیغی ذمہ داریوں کو تو پورا نہیں کیا۔ البتہ فرضی کہانیاں بناکر خوش ہورہے ہیں کہ چاند سے لیکر امریکی خلاباز تک سب کو ان کے دین اعظم نے فتح کر رکھا ہے۔

نظام تعلیم

چارلس ایڈمس ایک امریکی عیسائی تھے۔ انھوں نے مصر میں رہ کر وہاں کی اسلامی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے:

Islam and Modernism in Egypt

اس کتاب میں ایک جگہ وہ جامعہ ازہر (قاہرہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "روایت پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ متعلقہ علوم کو ترقی دی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قدما کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے، بعینہٖ اسی حالت میں جیسا کہ اسلاف نے اپنے بعد والوں کو دیا تھا۔ آزادانہ تحقیق اور آزادانہ رائے قائم کرنے کا دروازہ اسلام میں تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لئے مذہب کے مستند شارحین صرف دورِ ماضی میں ملتے ہیں اور بعد والوں کے لئے صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی شرح کرتے رہیں۔"

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مصنف کا تبصرہ اب اس پر صرف جزئی طور پر ہی صادق آتا ہے۔ تاہم ہندستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے اسلامی مدارس کے لئے یہ الفاظ آج بھی پوری طرح درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیم کا معاملہ عام سیکولر تعلیم سے مختلف ہے۔ سیکولر تعلیم مطلق طور پر آزادانہ تحقیق کی قائل ہے۔ جب کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہمیشہ قرآن و سنت پر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے مدارس میں آج جو تعلیم دی جارہی ہے اس کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر نہیں بلکہ ایک خاص دور میں پیدا ہونے والے کتاب و سنت کے شارحین پر ہے۔ کتابوں کی ایک خاص فہرست ہے جن کو مقدس مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب قرآن و حدیث بھی انھیں کتابوں کی روشنی میں پڑھائے جاتے ہیں نہ کہ ان کتابوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھایا جائے۔

اس طرز تعلیم کا براہ راست نتیجہ جمود اور تنگ نظری ہے۔ یہ جمود اور تنگ نظری آج مسلم قوم کا سب سے بڑا خاصہ بن چکی ہے اور ہم اس کے وہ تمام نتائج بھگت رہے ہیں جو ایسی ذہنیت سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

کیسی عجیب غفلت

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴-۱۸۷۲) ایک نومسلم تھے۔ وہ پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن سے غیر معمولی ذہین تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام "عبید اللہ" اس لئے رکھا کہ وہ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس کتاب سے متاثر ہوئے وہ "تحفۃ الہند" تھی جس کے مصنف کا نام "عبید اللہ" ہے۔

اس کتاب میں اسلام کا تقابل دوسرے مذاہب سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سکھ مذہب اور ہندو دھرم سے غیر مطمئن ہو گئے۔ اس کتاب نے ان کے اندر اسلام کی طرف ابتدائی رجحان پیدا کر دیا۔ تاہم ابھی وہ قطعی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ بعد کو انھوں نے بتایا کہ "میں سوچتا تھا کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے۔ مگر مسلمان اپنے بزرگوں کی قبروں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے"۔ یہ سوال ان کے لئے اسلام قبول کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اپنے دل کی یہ کھٹک انھوں نے کچھ مسلمانوں سے بیان کی۔ چنانچہ ایک مسلمان نے انھیں شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" دی اور اس کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کا موضوع شرک کی مختلف صورتوں کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ انھوں نے جب اس کتاب کو پڑھا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسلام توحید خالص کا دین ہے۔ انھوں نے جانا کہ مسلمانوں کی قبر پرستی مسلمانوں کے اپنے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ قبر پرستی کا بھی ویسا ہی مخالف ہے جیسا وہ بت پرستی کا مخالف ہے۔

ان دو کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کا نظریاتی سفر بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ تاہم آبائی مذہب کو چھوڑ کر نئے مذہب کی طرف بڑھنے کے لئے جس طاقت ور محرک کی ضرورت ہے وہ ابھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ایک اور کتاب کے مطالعہ سے انجام پا گیا۔ یہ "احوال الآخرت" تھی۔ اس کتاب میں قیامت کی ہولناکی اور جنت دوزخ کی باتیں درج ہیں۔ پچھلی کتابوں کے مطالعہ سے اگر ان کا دماغ ہلا تھا تو آخری کتاب کے مطالعہ سے ان کا دل ہل گیا اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔

سال پہلے کے ہندستان میں یہ ممکن تھا کہ اردو زبان کو غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ کیسا عجیب اور کیسا قیمتی امکان تھا جس کو ہمارے تمام اصاغر و اکابر نے بے فائدہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو دیا۔ قانون قدرت کے مطابق اس کی سزا ہمیں یہ ملی ہے کہ اب غیر مسلموں میں دین پہنچانے کے لئے ہمیں کئی اجنبی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کرنا ضروری ہوگیا ہے اور اردو زبان کا یہ حال ہوا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار اب خود مسلم نسلوں تک بھی اس کے ذریعہ دین کا پیغام پہنچانا ممکن نہیں۔ جو کام پہلے صرف ایک زبان کے ذریعہ ہوسکتا تھا اس کے لئے اب ہم کو کئی زبانیں کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی جدوجہد کا کم از کم ایک نمایاں عنوان اردو رہا ہے۔ اردو کے خاتمہ کا مرثیہ پڑھنا ہمارے تمام لیڈروں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جب آزادی ہند سے پہلے ملک کی سب سے زیادہ عام زبان اردو تھی تو آزادی ہند کے بعد وہ یہاں اجنبی کیسے بن گئی۔

زبان ان چیزوں میں سے ہے جس کا تسلسل اگر تاریخ میں ایک بار قائم ہوجائے تو اس کو توڑنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ تسلسل قائم ہونے کے بعد وہ خود اپنے زور پر قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بہت بڑا اجتماعی بھونچال ہی اس کو توڑ سکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں اس کا تسلسل تاریخ میں جاری رہے گا۔ وہ ختم نہیں ہوسکتا۔

ہندستان میں اردو کے خاتمہ کے واحد ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں دو قومی سیاست چلائی اور اس کو اس اجتماعی بھونچال تک لے گئے جس کا دوسرا نام تقسیم ہے۔ تقسیم ملک کا بھونچال ہی دراصل وہ واقعہ ہے جس نے اردو کے تسلسل کو ہندستان میں ختم کر دیا۔ اگر مسلمانوں کی احمقانہ سیاست سے یہ بھونچال پیش نہ آتا تو ناممکن تھا کہ اس ملک میں اردو کا اس طرح خاتمہ ہوجائے جو آج ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔

اس کی ایک مثال ہندستان کی فلمی صنعت ہے۔ ہندستانی فلموں کی دنیا میں اردو زبان آج بھی زندہ ہے جب کہ ملک کے بقیہ حصہ میں وہ موت سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "فلم" کی حیثیت ہر ملک میں اور اسی طرح ہندستان میں بھی، ایک جزیرہ کی ہے۔ فلم کی دنیا عام طور پر سیاسیات اور قومی ہنگاموں سے الگ الگ زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی فلموں کے جزیرہ میں اردو آج بھی "پہلے کی طرح" زندہ ہے۔ جب کہ بقیہ ملک میں وہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکی ہے۔

آہ یہ بے شعوری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کا ایک اخباری رپورٹر علی گڑھ پہنچا اور اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو میں مذکورہ پروفیسر نے یونیورسٹی کے اندرونی نظام کی بعض خرابیوں کا ذکر کیا جس کے نتیجہ میں وہاں ہنگامہ پسند لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعلیمی معیار مسلسل گر رہا ہے۔ یہ انٹرویو چھپا تو یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ مشتعل ہو گئے اور یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور ادھم بازی شروع کر دی۔ حالاں کہ ان کا پُرتشدد ردعمل صرف یہ ثابت کر رہا تھا کہ پروفیسر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر موجود ہیں۔

مسلم صحافت اور قیادت نے حسب معمول اس معاملہ میں طلبہ کا ساتھ دیا۔ مسلم اخبارات نے اس انٹرویو کو انتہائی قابل اعتراض (۱۶ مئی ۱۹۸۱) قرار دے کر اس کے خلاف پرشور مضامین لکھے۔ مگر اردو یا انگریزی کے کسی بھی اسلام پسند اخبار نے انٹرویو کے اصل الفاظ شائع نہیں کئے۔ جن لوگوں نے اصل انٹرویو کو انڈین اکسپریس میں پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اس یک طرفہ لفظی طوفان کی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ مسلم اخبارات اصل انٹرویو شائع کر دیتے تو قارئین پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ وہ یقینی طور پر "انتہائی قابل اعتراض" نہیں تھا۔ وہ بس ایسا ہی تھا کہ یا تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا یا اس کے جواب میں ایک وضاحتی مضمون مرتب کر کے شائع کر دیا جاتا ——

یہ ہے ہماری وہ غیر عادلانہ سیاست جس پر ہم یقین کئے بیٹھے ہیں کہ خدائے عادل ہمارے اوپر اپنی نصرتوں کی بارش برسائے گا۔

اس قسم کے لایعنی ہنگاموں کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کے طلبہ کے یہ ہنگامے جو اسلام کے نام پر کئے گئے ان پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے تین قسطوں میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ مسٹر جے۔ ڈی سنگھ نے اپنی اس رپورٹ میں جو باتیں کہی ہیں ان میں سے ایک بات ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> Why do the AMU students raise the cry of 'Islam in danger' at the slightest pretext ? Is Islam which has withstood major onslaughts on it in the past, become so fragile as to be seen to crumble before a mere newspaper article by a marxist.

ایسا کیوں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ انتہائی معمولی باتوں کو لے کر "اسلام خطرہ میں" کی چیخ پکار بلند کرنے لگتے ہیں۔ اسلام جو ماضی میں اپنے اوپر بڑے بڑے حملوں کے مقابلہ میں قائم رہا کیا اب اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک اخبار میں کسی مارکسسٹ کا محض ایک مضمون چھپ جانے سے وہ منہدم ہوتا ہوا نظر آنے لگے (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ مئی ۱۹۸۱)

اس سے اندازہ کیجئے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے علم بردار کس طرح اسلام کے نادان دوست ثابت ہوئے ہیں

مسلم یونیورسٹی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے جس میں ان تمام سرگرمیوں کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے جو ہمارے یہاں ملت کے نام پر جاری ہیں۔ نیز اسی مثال سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری ملی سرگرمیاں اپنی ساری دھوم کے باوجود اس قدر ناکام کیوں ہیں۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ ایجی ٹیشن پروفیسر عرفان حبیب کے ایک انٹرویو کے نام پر شروع کیا گیا۔ اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اس انٹرویو کو انگریزی میں مکمل طور پر پڑھا ہے۔ زیادہ تر لوگ بس سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس کے خلاف مجاہد بنے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن کے اس حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے کہ:

یا ایھا الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبأٍ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (حجرات ۶)

اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو پھر اپنے کئے پر تم کو پچھتانا ہو

۲۔ پروفیسر موصوف نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف ایک اخباری مضمون کی اشاعت تھی۔ مگر اس کے جواب میں جو کچھ کیا گیا وہ مارپیٹ، ہنگامہ اور توڑ پھوڑ تھا۔ یہ بھی قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی کہ:

والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (شوریٰ ۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر سرکشی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی

۳۔ پروفیسر موصوف کا انٹرویو یونیورسٹی کے نظم ونسق کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک عام تعلیمی بات تھی مگر اس کو غلط طور پر اسلام اور کفر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ اپنی دنیوی سیاست کے لئے دین کا نعرہ استعمال کرنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے:

ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا (بقرہ ۴۱)

اور میری آیتوں پر تھوڑی پونجی نہ خریدو

۴۔ پروفیسر موصوف نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی میں انتظام اور تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ خاموش تعمیری جدوجہد کے ذریعہ انتظام اور تعلیم کے معیار کو بلند کر دیا جاتا۔ یہ مذکورہ بیان کی نہایت کامیاب تردید ہوتی۔ اس کے برعکس شور وغل اور ہنگامہ بازی شروع کر دی گئی۔ یہ قرآن کے الفاظ میں ایسے کام کا کریڈٹ لینا تھا جس کو آدمی نے کیا نہیں۔ یہ حضرات اپنے آپ کو یونیورسٹی کے خادم کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔ حالانکہ یونیورسٹی کی جو اصل خدمت تھی اس کو انھوں نے انجام ہی نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کو قرآن کے اس انتباہ سے ڈرنا چاہئے:

لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنھم بمفازۃ من العذاب ولھم عذاب الیم (آل عمران ۱۸۸)

جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو تو ان کو تم عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

وہ مواقع جو استعمال نہ ہو سکے

فریڈرک ٹوکر (۱۹۲۹-۱۸۵۲) ایک انگریز آئی سی ایس تھا۔ وہ کمشنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ اس کے اندر مذہبی اور روحانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انگلستان میں اس وقت جنرل ولیم بوتھ کے تحت سالویشن آرمی (نجات دہندہ فوج) کی تحریک چل رہی تھی۔ اس نے جنرل بوتھ کو آمادہ کیا کہ اس تحریک کی ایک شاخ ہندستان میں قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۲ کو اس کی پہلی شاخ بمبئی میں قائم ہوئی۔

فریڈرک ٹوکر (Frederick Tucker) نے اپنا نام فقیر سنگھ رکھ لیا۔ وہ پنجاب کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گھومتا اور لوگوں کو روزگار پر لگانے کی کوشش کرتا۔ اس نے دیہی بنک قائم کئے۔ گھریلو صنعتیں رائج کیں اور کالونیاں بنائیں، وغیرہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ مارچ ۱۹۷۹)

"استعمار" کے زمانہ میں اس طرح کے بہت سے انگریز تھے جن کی فطرت زندہ تھی اور جن کے اندر دین حق کا بیج ڈالا جاسکتا تھا۔ مگر تمام قائدین سیاسی ہنگاموں میں لگے رہے۔ خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کی ضرورت کسی کو محسوس نہ ہوئی۔ اس قسم کے لوگ اگر آخرت میں کہیں کہ خدایا ہم حق کی تلاش میں تھے۔ مگر حق کے امانت داروں نے ہم کو حق سے آشنا نہیں کیا۔ وہ تو ہم سے صرف سیاسی لڑائی لڑتے رہے تو مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے قائدین کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

یہ ان مواقع کی ایک مثال تھی جو انفرادی اعتبار سے ہمارے لئے پیدا ہوئے۔ حالیہ زمانے میں اسی قسم کے مواقع اجتماعی سطح پر بھی بار بار سامنے آئے۔ مگر مسلمان ان سے کوئی دعوتی فائدہ حاصل نہ کر سکے

خاندان ہیپس برگ (Hapsburgs) ایک زمانہ میں آسٹریا و ہنگری پر حکومت کرتا تھا۔ ترکی کے سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶-۱۵۲۰) کے زمانہ میں اس کے تخت پر شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V) حکمراں تھا۔ اس وقت وہ یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تسلیم کیا جاتا تھا۔ یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر اس کی سلطنت پھیل چکی تھی۔

اس حکومت کے تعلقات فرانس سے اچھے نہ تھے۔ فرانس کی یہ کوشش تھی کہ اس وسیع سلطنت کو مغرب کی سمت بڑھنے سے روکے۔ اسی طرح مشرق میں عثمانی سلطنت ہیپس برگ حکمرانوں کے لئے سد راہ بنی ہوئی تھی۔ فرانس نے محسوس کیا کہ وہ اور سلطنت عثمانیہ دونوں ہیپس برگ کے مشترک حریف ہیں۔ اس نے اپنے محاذ کو مضبوط کرنے کے لئے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات بڑھانا چاہا ــــ چنانچہ فرانس کی حکومت نے ۱۵۳۴ میں اپنے سفیر کو قسطنطنیہ بھیج کر خود ہی اس کی طرف پہل کی۔ دونوں میں اچھے سیاسی تعلقات قائم ہوگئے۔ ایک سال بعد جب شاہ فرانس (Francis I) اور شاہ چارلس پنجم میں جنگ چھڑی تو فرانس نے سلطان سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان نے اس جنگ میں نہ صرف فرانس کی فوجی مدد کی بلکہ اس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ بھی کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق فرانسیسیوں کو صرف پانچ فی صد محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ فرانسیسی تاجروں کے

دیوانی و فوجداری مقدمات ان کے اپنے قونصل کے سپرد کر دئے گئے۔ ان کو ترکی میں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور ترکی میں واقع عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کی نگرانی بھی ان کا حق تھا۔ اس دوستانہ معاہدہ کی وجہ سے فرانس اور ترکی کے تعلقات تقریباً تین صدیوں تک بہت خوش گوار رہے۔ ان تعلقات سے فرانس میں بہت بڑے پیمانہ پر تبلیغ کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا۔ مگر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا جاسکا۔

اسی طرح ترکی اور روس قدیم زمانہ میں ایک دوسرے کے روایتی حریف تھے۔ اگست ۱۹۱۴ میں جب یورپ کی عالم گیر جنگ چھڑی تو ایک طرف روس، برطانیہ اور فرانس تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کمال اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ ترکوں کو اس جنگ سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ اس وقت ترکی کے اقتدار پر انور پاشا اور ان کے پرجوش ساتھیوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے روس اور برطانیہ کی دشمنی میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شرکت نے اتحادیوں کے لئے سخت دشواریاں پیدا کر دیں۔ ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ اس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہوگیا۔ روس اس وقت ایک غیر صنعتی ملک تھا اس لئے جب تک برطانیہ اور فرانس کے کارخانوں سے اس کو کافی مقدار میں سامان جنگ فراہم نہ ہوتا رہے وہ جدید طرز کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ تاہم ترکی کے لئے یہ پالیسی بہت مہنگی پڑی۔ جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے بعد ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا قسطنطنیہ کے تخت پر اگرچہ برائے نام سلطان باقی رہا مگر عملاً ترکی کے تمام معاملات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے —— یہ سب کچھ ہوا۔ مگر جرمنی سے اتنے لمبے قریبی تعلق کے باوجود جرمنی میں تبلیغ اسلام کا کوئی کام نہ کیا جاسکا۔

اس قسم کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کی مثالیں مسلم حکومتوں کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گی۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں جب کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد کی خاطر کسی سے اتحاد کیا گیا ہو۔ یا سیاسی اتحاد کے ذریعہ پیدا شدہ حالات سے دعوتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اگر دعوتی مزاج ہوتا تو اس قسم کے اتحاد سے غیر معمولی دعوتی فائدے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مگر تعلقات میں اضافہ کا یہ فائدہ حاصل نہ ہوسکا کہ مسلمان نئے مواقع کو دوسرے لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے میں استعمال کرتے۔ انفرادی روابط اور قومی تعلقات دونوں ہی اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ حال تھا کہ وہ ربط و تعلق کے ہر موقع کو دعوت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر آج مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں صرف دو باتوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں۔ معاشی فائدہ حاصل کرنا یا سیاسی جھگڑے کھڑے کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ حقوق طلبی اور قومی محاذ آرائی کا۔ مسلمان اپنی لڑائی جھگڑے کی سیاست سے دوسری قوموں کو اسلام سے متوحش کرنے کا کام تو بہت بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں مگر ان کو اسلام کے قریب لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ■

کیسا عجیب

گاندھی جی کی مشہور شاگرد میرا بہن ایک انگریز خاتون تھیں، جن کا اصل خاندانی نام میڈلین سلیڈ (Madeleine Slade) تھا۔ وہ سر ایڈمنڈ سلیڈ کی لڑکی تھیں۔ ان کو اپنے لئے ایک "زندہ خدا" کی تلاش تھی۔ ابتداءً انھوں نے مشہور موسیقار بیتھوون میں اپنی اس تلاش کا جواب پایا۔ تاہم ان کی فطرت اس پر پوری طرح مطمئن نہ تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات مشہور فرانسیسی مفکر رولینڈ رولاں سے ہوئی۔ رولینڈ رولاں گاندھی جی سے بہت متاثر تھا۔ اس نے مس سلیڈ سے کہا "کیا تم نے گاندھی جی کے بارے میں نہیں سنا"۔ مس سلیڈ نے کہا "نہیں"۔ رولینڈ رولاں نے کہا "وہ دوسرے مسیح ہیں"۔

He is another Christ

اس کے بعد مس سلیڈ نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی اتنی گرویدہ ہوئیں کہ اپنا وطن چھوڑ کر مستقل طور پر ہندستان آنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

یہ ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ مس سلیڈ نے سمندری جہاز پر اپنے لئے ایک برتھ رزرو کی تاکہ وہ جلد سے جلد ہندستان پہنچ سکیں۔ اس کے بعد اچانک انھیں خیال آیا کہ میں گاندھی جی کے ملک میں جا رہی ہوں مگر میں گاندھی جی کے ملک کی زبان نہیں جانتی۔ انھوں نے ہندستان کی زبان کے بارے میں معلومات کیں تو انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کی عام زبان اردو ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان سیکھنے کے لئے اپنے سفر ہند کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا۔ وہ اس سے پہلے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں جانتی تھیں، انھوں نے دوبارہ محنت کر کے اردو سیکھی اور پھر ۱۹۲۵ میں ہندستان آئیں۔

گیٹا سرینی (Gitta Sereny) نے میرا بہن (سابق مس میڈلین سلیڈ) کے حالات لکھے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ دسمبر ۱۹۸۲) انھوں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> In the fall of 1924, four months into her training included learning Urdu and converting to vegetarianism.

۱۹۲۴ کی موسم خزاں کے چار مہینے مس سلیڈ کے لئے تربیتی مہینے تھے، ان میں اس نے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو سبزی خوری کا عادی بنایا ——— پچاس سال پہلے ملک کی عام زبان اردو تھی۔ یہ دین کی عمومی اشاعت کا بہت بڑا موقع تھا، مگر اس کو مسلمانوں نے لایعنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے یہ موقع ان سے چھین لیا۔ اب اردو کے ذریعہ یہاں نہ سیاست کا کام کیا جا سکتا ہے اور نہ اشاعت دین کا۔

فلسطین: ایک علامت

فلسطینی مسلمان ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن فلسطین سے بے گھر کئے گئے۔ اس کے بعد وہ اطراف کے علاقوں مصر اور شام اور اردن سے نکالے گئے۔ لبنان ان کا آخری مرکز تھا، اب ۱۹۸۲ء میں وہ یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ پچھلے ۳۵ سال سے ان پر جتنا ظلم ہو رہا ہے اتنا ظلم شاید اسلامی تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی مسلم گروہ پر نہیں ہوا۔

یہ معاملہ کوئی سادہ یا مقامی معاملہ نہیں۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس کا تعلق ساری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک انتباہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان بحیثیت مجموعی خدائی عتاب کی زد میں ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کا معاملہ اس کی ایک علامت ہے۔ خدا مسلمانوں کو رد کر چکا ہے۔ اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ان کے درمیان ایسے بزرگ موجود ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر کھڑے ہو کر یہ تقریر کر رہے ہیں کہ اکتشفت الامۃ العربیۃ نفسھا (عرب قوم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا) ان میں ایسے مفکرین اسلام موجود ہیں جو موجودہ عہد کو اسلام کا عہد بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کے درمیان آج اسلام کے نام پر اتنی سرگرمیاں جاری ہیں کہ وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ہم نے سارے عالم میں اسلام کی ہوائیں چلا دی ہیں۔

ظہور آیات کا مقام

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پچھلے انبیاء کی نبوتیں عملی طور پر منسوخ ہو گئیں۔ اب صرف آپ کی نبوت خدا کی نظر میں مستند نبوت ہے اور صرف آپ کی پیروی سے کسی کو نجات مل سکتی ہے۔ پیغمبر اسلام کے ظہور کے ذریعہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کا ایک حسی مظاہرہ یا علامتی نمونہ دکھائے۔ چنانچہ اس کے لئے معراج میں یہ کیا گیا کہ سابقہ انبیاء کو ایک مقام پر جمع کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کی ہدایت پر ان کی امامت فرمائی اور تمام انبیاء نے آپ کی قیادت میں آپ کے پیچھے نماز ادا کی (وقد رأیتنی فی جماعۃ من الانبیاء ... فحانت الصلوٰۃ فاممتھم، صحیح مسلم)

امامت انبیاء کا یہ واقعہ کعبہ (عرب) میں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے لئے معراج ہوئی اور آپ کو بیت المقدس (فلسطین) لے جایا گیا۔ اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے ——— تاکہ ہم پیغمبر کو اپنی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من آیاتنا، اسراء ۱) بیت المقدس تاریخی طور پر وہ مقام بن چکا تھا جہاں امت یہود کے سلسلہ کی خدائی نشانیاں پچھلے ہزاروں سال سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ اب معراج کے موقع پر

خود نبی آخرالزماں کو خدائی نشانی دکھانے کے لئے وہاں لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی وراثت اب آپ کی امت کو دے دی گئی۔ پھر جب بیت المقدس مسلمانوں کے حصہ میں آیا تو اس کی وہ دینی اور آیاتی حیثیت بھی انھیں کی طرف لوٹ آئے گی جو قدیم انبیا کے زمانہ میں انھیں حاصل تھی۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جب خدا کی رحمت ہوتی تو وہ فلسطین میں فارغ البال اور ذی اقتدار بنا دئے جاتے۔ اور جب ان پر خدا کا عتاب ہوتا تو فلسطین ان سے چھن جاتا اور وہ سخت مصیبتوں کی زد میں آجاتے۔ فلسطین بنی اسرائیل کے مرحوم یا معتوب ہونے کی علامت تھی۔ یہی معاملہ خدا کا اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین مسلمانوں کے حق میں حکم خداوندی کی علامت ہے۔ اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل ہو اور وہاں وہ امن کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ خدا ان سے خوش ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ عتاب خداوندی کی زد میں آگئے ہیں (احبار، باب ۲۶، استثنا، باب ۲۸)

نبی آخرالزماں کے ظہور کے بعد بیت المقدس اور کعبہ دونوں کی وراثت آپ کی امت کو دی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے امت مسلمہ کے بارہ میں مرحومیت یا معتوبیت کا اظہار کعبہ کی سطح پر بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کعبہ دین محفوظ کا قبلہ اور اس کا قیامت تک کے لئے مرکز ہے، اس لئے اس کو تخریبی فتنوں سے بچانا بھی ضروری ہے۔ کعبہ محفوظ نہ رہے تو دین کی محفوظیت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ امت مسلمہ کے بارے میں آیات رحمت یا آیات غیر رحمت کے ظہور کے لئے بیت المقدس کو بدستور اپنی سابقہ حیثیت پر باقی رکھا جائے۔

فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو امریکہ اور اسرائیل کی جارحیت سمجھنا خدا کی سنت سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ یہ دراصل خدا کا وہ معاملہ ہے جو وہ حاملین کتاب کے ساتھ اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ حامل کتاب ہونے کی ذمہ داری کو ادا نہ کر رہے ہوں۔ پہلے یہود کتاب الٰہی کے حامل تھے۔ اس لئے پچھلے زمانہ میں یہود کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا رہا۔ اب مسلمان کتاب الٰہی کے حامل ہیں، اس لئے اب خدا کا وہ معاملہ فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ ہوگا جو پہلے فلسطین کے یہود کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

پھر یہ کام یہود سے کیوں لیا جا رہا ہے، اس کی خاص مصلحت ہے۔ یہود کا فلسطین میں جمع ہونا اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو ذلت کی سزا دینا بیک وقت دو مقاصد کا حامل ہے۔ ایک طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو ایک مقام پر جمع کر کے بالآخر انھیں کوئی سخت اجتماعی سزا دی جانے والی ہے۔ دوسری طرف ایک "مغضوب" قوم کے ذریعہ مسلمانوں کو سزا دینا اس شدت عتاب کو بتا رہا ہے جس کا مورد اس وقت

مسلمان بن رہے ہیں اور اس وقت تک بنتے رہیں گے جب تک وہ دوبارہ اپنے آپ کو کتاب الہٰی کی بنیاد پر کھڑا نہ کریں۔

آج تمام دنیا کے مسلمان فلسطینیوں کی حمایت پر متحد ہیں۔ شاید عالم اسلام کا دوسرا کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں جس پر ان کے درمیان اتنا زیادہ اتفاق پایا جاتا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کے تمام اصاغر و اکابر اس معاملہ میں یکساں طور پر امریکہ اور اسرائیل کی مذمت کر رہے ہیں اور مجاہدین فلسطین کے نام اپنے حمایتی الفاظ نشر کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح فلسطین کا مسئلہ، عملاً، تمام دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بن گیا ہے۔ فلسطینی مسلمانوں کی عزت تمام مسلمانوں کی عزت ہے اور فلسطینی مسلمانوں کی بے عزتی تمام مسلمانوں کی بے عزتی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عمومی حمایت کسی بھی درجہ میں فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ فلسطینی مسئلہ دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ کسی اور مقام پر پیدا ہوا ہے اور مسلمان اس کا حل کسی اور مقام پر تلاش کر رہے ہیں۔

یہ مسئلہ امریکہ اور اسرائیل کی سطح پر نہیں ہے بلکہ خدا کی کتاب کی سطح پر ہے۔ اگر یہ امریکہ کا مسئلہ ہوتا تو ہم اس کو اسی طرح حل کر چکے ہوتے جس طرح ویت نام نے اس کو بہت پہلے حل کر لیا۔ خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اور خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی کو ختم کرکے ہی یہ مسئلہ دوبارہ ختم ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ مزید اس بات کی علامت ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان جو کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے وہی وہ چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کو ان سے مطلوب ہو یا جو کتاب الہٰی کی اقامت کے ہم معنی ہو۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں اتنی بڑی بڑی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور اتنے بڑے پیمانہ پر اسلامی کام ہو رہے ہیں کہ اگر یہی وہ چیز ہوتی جو خدا کو مطلوب ہو تو کبھی ممکن نہ تھا کہ مسلمان عتاب خداوندی کی زد میں آئیں کیونکہ یہ سب کام مقدار میں اتنے زیادہ ہیں کہ اگر وہ صحیح اور مطلوب ہوں تو ان پر نصرت خداوندی کا نزول ہونا چاہئے نہ کہ عتاب خداوندی کا۔

یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر آج تمام دنیا کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ خدا اگر انھیں رد کر دے تو پھر ان کے لئے نہ دنیا میں کوئی جگہ ہے اور نہ آخرت میں۔ غیر مطلوب سرگرمیاں، خواہ وہ دین کے نام پر کی جا رہی ہوں، کسی کو خدا کی نظر میں رحمت و نصرت کا مستحق نہیں بناتیں۔

اسلام کے نام پر اسلام کا قتل

پورواکارتا (انڈونیشیا) کے مسلم اسکول میں طالب علموں نے ایک تصویری پوسٹ کارڈ چھپوایا۔ اس میں ایران کے مذہبی قائد آیات اللہ خومینی کی تصویر تھی۔ پوسٹ کارڈ کی تقسیم سے پہلے حکومت کو اس کی خبر ہوگئی اور انڈونیشی پولس نے تمام پوسٹ کارڈ ضبط کر لئے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ فروری ۱۹۷۹) اس قسم کی خبریں دوسرے مسلم ملکوں سے بھی مل رہی ہیں۔ مسلم حکمراں خومینی کے زیر اثر قائم شدہ ایرانی اسلامی حکومت کو اگرچہ سرکاری طور پر مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں مگر خود اپنے ملک میں "خومینی افکار" کی درآمد کو وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بظاہر کامیاب اسلامی تحریک عملاً الٹا اثر پیدا کر رہی ہے۔ وہ اسلام کی کامیابی کے نعروں کے جلو میں اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع کو برباد کر رہی ہے۔

پاکستان، ایران اور بعض دوسرے ملکوں میں مسلم رہنماؤں نے اپنے سیاسی عزائم کے لئے "اسلامی حکومت" کے لفظ کو ایک کامیاب عوامی نعرہ پایا ہے۔ مگر اسلام کو سیاسی نعرہ بنانا اسلام کو اسلام کے نام پر قتل کرنا ہے۔ موجودہ حالات میں کوئی بھی مسلم ملک اپنے معاشرتی حالات کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ اسلامی حکومت کے قیام کی زمین بن سکے۔ مزید یہ کہ جو لیڈر اس قسم کی تحریک چلا رہے ہیں وہ خود بھی اسلامی قیادت کے اوصاف سے بالکل خالی ہیں۔ ایسی حالت میں اسلامی حکومت کا نعرہ صرف تخریبی کارروائیوں کے لئے ایک کامیاب ہتھیار بن سکتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تحریکوں کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اسلام کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لئے اسی طرح سیاسی خطرہ کے ہم معنی بنتا جا رہا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم کا لفظ امریکی حکمرانوں کے لئے بنا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر کوئی دیرپا کام کرنا دن بدن مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین اگرچہ اسلام کے نعرہ پر اٹھے ہیں مگر وہ جس زمین پر کھڑے ہوئے ہیں وہ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین ہے نہ کہ حقیقۃً اسلام کی طلب کی زمین۔ آزادی اور جمہوریت اور سوشلزم کے علم برداروں جس عوامی بے چینی کو استعمال کر کے اپنی سیاسی تحریکیں چلا رہے ہیں، اسی بے چینی کو مسلم قائدین اسلام کے نام پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اس قسم کی تحریکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفروضہ غیر اسلامی حکومت کو اکھاڑنے کے بعد جب مطلوبہ اسلامی حکومت بنانے کا سوال ہوتا ہے تو قائدین اور ان کا ساتھ دینے والی بھیڑ دونوں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو مادی سیاسی تحریکیں اٹھیں انھوں نے ہر ملک میں "عوام دشمن" حکومتوں کو اکھاڑ پھینکا مگر وہ حقیقی عوامی حکومت قائم نہ کر سکیں۔ یہی انجام اسلامی تحریکوں کے لئے بھی مقدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی تحریک صالح دینی نظام قائم کر سکتی ہے جو دینی محرکات کے تحت اٹھی ہو۔ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین سے ابھرنے والی تحریکیں صرف نیا فساد برپا کریں گی، وہ ہرگز کوئی صالح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ منفی بنیادوں پر جو اتحاد پیدا ہو وہ ہمیشہ انتشار پر ختم ہوتا ہے اور مخالفانہ قسم کا سیاسی شور و شر بالآخر بدترین بے عملی پر۔ ایران کے واقعات میں جن لوگوں کو اسلام کا سورج ابھرتا ہوا نظر آ رہا ہے، بہت جلد وہ دیکھ لیں گے کہ ان کی یہ رائے سطحی خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ (۲۲ فروری ۱۹۷۹)

موجودہ زمانہ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اپنی حکومت کے استحکام کی یہ آسان تدبیر دریافت کی ہے کہ اسلام کے نام پر کوڑے مارو اور خوفناک سزائیں جاری کرو، تاکہ عوام اور انقلاب پسند عناصر سہم جائیں اور ان کی آمریت کے خلاف اٹھنے کی ہمت نہ کریں۔ قدیم زمانہ میں بادشاہوں کو ایسے علماء مل جاتے تھے جو ان کی ہوس ناکی کے منصوبوں کے لئے شرعی سند عطا کرتے رہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے ان حکمرانوں کی خوش قسمتی سے ان کو ایسے افراد اور ادارے مل گئے ہیں جو ان کے تاریک منصوبوں کے حق میں یہ فتوی دے سکیں کہ یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے، صرف اس قیمت میں کہ ان کو کچھ نذرانے اور اعزازی عہدے حاصل ہوجائیں۔

مگر اسلام کوڑے مارنے اور ہولناک سزائیں جاری کرنے کا نام نہیں۔ اس قسم کی حدود اور تعزیرات اسلام کے پورے بامعنی وجود سے بس اتنی ہی نسبت رکھتے ہیں جیسے ایک زندہ انسان کا اپنے بڑھے ہوئے ناخن کو کاٹنا۔ اسلام خدا کی رحمتوں کا دین ہے۔ وہ جنتی فضاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ وہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا موت سے پہلے والی دنیا میں مظاہرہ ہے۔ یہ جنت کے شہریوں کا دنیا میں اتر آنا ہے۔ وہ ملکوتی اوصاف جو کسی بندۂ خدا کو جنت کی ناقابل بیان خوشیوں کا مستحق بناتے ہیں، جب ایسے اوصاف کے لوگ اقتدار کے مناصب پر قبضہ پالیں تو اسی کا دوسرا نام اسلامی نظام ہے۔ اسلامی نظام وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو آسمانوں والے خدا کو زمین پر کھڑا ہوا دیکھتے ہوں۔ جو اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس حد تک گم کرچکے ہوں کہ اپنی ذات کے منصوبے ان کے لئے باقی نہ رہیں۔ اسلامی نظام برپا کرنے والے وہ ہیں جو دوسرے کے درد پر تڑپتے ہوں۔ جو دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہوں۔ جن کا حال یہ ہو کہ ذمہ داریوں کا احساس ان سے زندگی کی خوشیاں چھین لے۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا فکر ان کے لئے اقتدار کی کرسی کو کانٹوں کی کرسی بنادے۔ جو حکومتی مواقع کے ملنے پر آنسو بہانے والے ہوں نہ کہ قہقہہ بلند کرنے والے۔

زمین کے اوپر جب ایک درخت کھڑا ہوتا ہے اور اپنی سرسبز ٹہنیوں میں پھول اور پھل لگاتا ہے تو یہ ایک پیچیدہ ترین کائناتی منصوبہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام گویا انسانی سماج میں خدا کا شرعی پھول اور پھل اگانا ہے۔ یہ ایک انتہائی لطیف اور انتہائی مشکل منصوبہ ہے۔ جس طرح ایک درخت طویل مدت تک خاموش عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس قابل بنتا ہے کہ وہ اپنے ہریالے تنہ کے اوپر رنگ اور مزہ اور خوشبو کا وہ فرحت بخش مجموعہ ظہور میں لائے جس کو پھول اور پھل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کا قیام بھی ایک بے حد سنجیدہ اور بے حد طویل منصوبہ ہے۔ یہ نہایت گہری جدوجہد کا طالب ہے۔ کچھ زندگیاں درخت کے بیج کی مانند اپنے آپ کو عظیم مقصد کی خاطر قربان کردیتی ہیں۔ کچھ روحیں عالم حقائق میں گم ہوکر خدا کے چھپے ہوئے خزانوں کو اجتماعی سطح پر بکھیرتی ہیں تو اس کے بعد وہ واقعہ رونما ہوتا ہے جس کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جو جیتے جی اپنے آپ کو آخرت میں پہنچا چکے ہوں، جب وہ آخرت کی ابدی تجلیوں کو دنیا میں اتارتے ہیں تو اسی انعکاس نور کا نام اسلامی نظام ہوتا ہے۔ اسلامی نظام خدا کی اخروی نعمتوں کا زمینی ظہور ہے۔ جو لوگ اپنی جاہ طلبی کے تماشوں کو اسلامی نظام کا نام دیتے ہیں، ایسے لوگ اسلامی نظام قائم کرنے کا کریڈٹ تو کیا پائیں گے، البتہ یہ اندیشہ ہے کہ خدا کے یہاں وہ دھوکہ بازی کے مجرم قرار دئے جائیں، کیونکہ انھوں نے اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز و شاداب درخت کہنے کی جسارت کی تھی۔ (۴ اپریل ۱۹۷۹)

اسلامی تخریب کاری

ایک خبر پڑھئے: نائجیریا کی احمد وبیلو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں عرصہ سے شراب کی ایک کینٹین قائم تھی۔ یونیورسٹی کے "اسلام پسند" طلبہ اس کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انتظامیہ اس کو نہیں مان رہی تھی۔ معاملہ اسی طرح ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکوں نے نوٹس دے دیا کہ شراب خانہ اگر ہال سے ہٹایا نہیں گیا تو وہ اس کو توڑ ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے حکام نے اس کے جواب میں کہا کہ جو لوگ ایسا کریں گے ان کو سخت نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ طلبہ اور انتظامیہ کی یہ کشمکش بالآخر ۵ مئی ۱۹۸۱ کو بھڑک اٹھی۔ طلبہ نے دھاوا بول کر شراب خانہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد انتظامیہ نے اس تخریبی کارروائی میں ملوث ۳۴ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد اور آگ بھڑکی۔ طلبہ نے یونیورسٹی حکام کے "غیر اخلاقی رویہ" کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یونیورسٹی کے در و دیوار کو اسلامی نعروں سے بھر دیا۔ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کی دو طالبات نے قومی ترانہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے مطابق قومی ترانہ میں "خدا پرستی کے بجائے قوم پرستی کا ذکر ہے"۔ اب حکومت نے مزید ۲۷ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں ہزاروں طلبہ کا تعلیمی نقصان ہوا اور مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ (۷ اگست ۱۹۸۱)

عرب کے لوگ شراب پیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سالوں تک ان کو سمجھاتے رہے اور ان کے دل کو نرم کرتے رہے تاکہ وہ شراب کی برائی کو سمجھ جائیں اور خود اپنے ہاتھ سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالیں۔ آج ان کے ماننے والے ان کے نام پر تخریب کاری کے ذریعہ شراب کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عین اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "شراب پینے والوں" کے پاس ایک دن بھی اس جذبہ سے نہیں گئے کہ ان کو دل سوزی اور خیر خواہی کے انداز میں سمجھائیں۔ ان کی ایک رات کی نیند بھی ان کے حق میں دعائیں کرنے میں خراب نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک بار بھی اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ فی الواقع اپنے بھائیوں کی گمراہی پر تڑپ رہے ہیں اور ان کے برے انجام کے غم میں ان کا یہ حال ہو رہا ہے گویا کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ ان کا سارا شوق بس یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ خدا کی نظر میں داعی اور مصلح بننا چاہتے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک دن بھی دعوت اور اصلاح کا عمل نہیں کیا۔

اس قسم کی اسلامی تخریب کاری آج بہت بڑے پیمانہ پر مسلم دنیا میں جاری ہے۔ مگر ان چیزوں کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ سراسر لیڈری ہے۔ کچھ لوگ اس نام پر لیڈری کے ہنگامے برپا کئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اس نام پر۔ کچھ لوگ ایک عنوان پر اپنے حریف کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ دوسرے عنوان پر۔ جو لوگ اس تخریبی سیاست میں مصروف ہیں وہ بلاشبہ مجرم ہیں اور جو لوگ اس تخریب کاری کے حق میں اسلامی جواز پیش کر رہے ہیں وہ مجرموں کے لیڈر۔

ان کا مکمل انقلاب جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا

جے پرکاش نارائن (۱۹۷۹-۱۹۰۲) اپنے علم اور صلاحیت کے اعتبار سے ہندستان کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے۔ ان کو عام طور پر مخلص اور سنجیدہ انسان سمجھا جاتا تھا اور ہر طبقہ کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ پٹنہ میں ان کے مکان کے سونے کے کمرہ میں دیوار پر یہ شعر لگا ہوا تھا:

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے   باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

وہ اپنے دل میں سماجی اصلاح کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے اور اپنے الفاظ میں سمپورن کرانتی Total Revolution کے علم بردار تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہندوستان کے لوگ ان کا مطلوبہ مکمل انقلاب لانے کے لئے بے قرار ہیں۔ صرف اندرا حکومت راستہ کی رکاوٹ ہے۔ اندرا حکومت ختم ہوجائے تو اس کے بعد مطلوبہ سماجی نظام نہایت آسانی سے قائم ہوجائے گا۔ ان کو اپنے اس اندازہ پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر فوج اور پولس کو بغاوت پر ابھارنے کو بھی جائز سمجھنے لگے۔ اندرا گاندھی کی بعض غلطیوں نے ان کو موقع دیا اور وہ ۱۹۷۷ میں اس حکومت کو ختم کرنے میں شان دار طور پر کامیاب ہوگئے۔ تاہم اس "کامیابی" کے معنی صرف یہ تھے کہ اقتدار اندرا اور سنجے کے ہاتھ سے نکل کر مرارجی ڈیسائی اور کانتی ڈیسائی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ مطلوبہ سماجی نظام کا قیام پھر بھی خیالی امید ہی بنا رہا۔ اقتدار کی تبدیلی کے بعد اگرچہ ذاتی طور پر جے پرکاش کا مقام اتنا بلند ہوا کہ ان کو "لوک نائک" کا پر فخر خطاب دیا گیا۔ تاہم اپنی تمام ظاہری کامیابیوں کے باوجود ۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو وہ دنیا سے اس احساس کے ساتھ چلے گئے کہ ان کا مکمل انقلاب اپنی تمام تر دھوم کے باوجود، جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا۔ مزید یہ کہ جنتا پارٹی میں بہت جلد پھوٹ پڑ گئی اور صرف ۲۸ ماہ بعد جنتا حکومت ٹوٹ گئی۔ اپنی محبوب جنتا پارٹی کا یہ انجام جب ان کے علم میں آیا تو ان کی زبان سے نکلا: "باغ اجڑ گیا" (ہندستان ٹائمس ۲۰ جولائی ۱۹۷۹) آخر میں وہ اتنے دل شکستہ ہوگئے تھے کہ موت سے ایک دن پہلے اچھوت پٹور دھن ان سے پٹنہ میں ملے اور ان کی خیریت پوچھی تو انھوں نے کہا: "میں کس طرح جی رہا ہوں، بس موت کا انتظار کر رہا ہوں" (ٹائمس آف انڈیا ۹ اکتوبر ۱۹۷۹)

جے پرکاش نارائن کا یہ واقعہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ وہ ایک عبرت کا آئینہ ہے جس میں آپ اسی قسم کی بہت سی دوسری تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک مصلح جب "ظالم حکومت" کو ہٹانے کا نعرہ لگاتا ہے تو مشترک دشمنی کا جذبہ بہت سے مختلف الخیال عناصر کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ اس طرح مصلح کی جماعت اقلیت میں ہونے کے باوجود متحدہ محاذ میں شامل ہو کر اکثریت حاصل کر لیتی ہے۔ مگر جب ظالم حکومت ہٹ جاتی ہے تو سب کا مفاد الگ الگ ہوجاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ اب مصلح کی جماعت اکیلی ہو کر دوبارہ اسی اقلیت کے مقام پر چلی جاتی ہے جہاں وہ متحدہ محاذ بننے سے پہلے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "ظالم" کو ہٹا کر بھی عادل کو اقتدار کی گدی پر بیٹھا نہیں پاتی۔ جے پرکاش نارائن اور ان کی قسم کے دوسرے مصلحین کی شاندار کامیابی کے معاً بعد عبرتناک ناکامی کا سبب یہی ہے۔

سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے تب وہ سوئی بن کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کر سکے۔ اب اگر ایک جلدباز آدمی ہتھوڑے کی پہلی ہی ضرب سے سوئی بنانا چاہے تو مطلوبہ سوئی تو نہ بنے گی البتہ لوہے کا ٹکڑا ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی کوششوں کا ہوا ہے۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت کے پرشور ہنگاموں کے باوجود آج بھی ہمارا قافلہ اسی مقام پر ہے جہاں وہ ایک سو سال پہلے تھا۔ بلکہ شاید کچھ اور پیچھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈر پہلی ہی ضرب میں ایک عمدہ چمک دار "سوئی" تیار کر لینا چاہتے ہیں، وہ "۲۰ مرحلوں" کے صبر آزما دور سے گزرنا نہیں چاہتے۔

انیسویں صدی میں کچھ لوگوں نے دیکھا کہ مغربی قومیں مسلم ملکوں کے اوپر قابض ہو گئی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس لڑ بھڑ کر کسی طرح ان اجنبی قوموں کو نکال دو اور اس کے بعد اسلام کی عظمت کا دور دوبارہ واپس آجائے گا۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد یہ مہم کامیاب ہو گئی، مگر اسلام اور مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں پہلے تھے وہیں اب بھی باقی رہے۔ کیوں کہ جدید دنیا میں بالادستی کا مقام حاصل کرنے کے لئے بہت سی علمی و عملی تیاریوں کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ہمارے پرجوش لیڈروں نے کچھ نہیں کیا تھا۔

غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں لوگوں نے دیکھا کہ برسر اقتدار پارٹی کے زیر انتظام مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ بس یہ پارٹی ہے جس کے ہاتھ میں بر وقت ملک کا اقتدار ہے۔ اگر اس پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو ہماری تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ الیکشن کے موقع پر دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے سیاسی طوفان مچایا اور بالآخر برسر اقتدار پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسری پارٹی منتخب ہو کر اقتدار کے منصب پر بیٹھی اس کے تحت بدستور اسلام اور مسلمان ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ کیوں کہ نئی منتخب پارٹی بھی اسی غیر مسلم اکثریت کے افراد سے بنی تھی جس سے پہلی پارٹی بنی تھی۔ پھر وہ پہلی پارٹی سے مختلف کیوں ہوتی۔

یہی سیاسی ڈراما مسلم اکثریت کے ملکوں میں ایک اور شکل میں دہرایا گیا ہے۔ یہاں اسلامی مفکرین اور ملی قائدین نے دیکھا کہ جو مسلم شخصیت یا مسلم جماعت ان کے ملک میں حکومت کر رہی ہے اس کے زیر حکومت بہت سی غیر اسلامی چیزیں رائج ہو رہی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس اس شخص کو کسی طرح مار ڈالو یا اس جماعت کو اقتدار سے ہٹا دو تو اس کے بعد ہر طرف نظام اسلام اور نظام مصطفیٰ کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مختلف اندرونی و بیرونی عناصر کے اشتراک سے یہ مہم کامیاب ہو گئی۔ سب سے بڑے "مخالف اسلام" کو ختم کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسرا نظام آیا وہ بھی پہلے ہی کی طرح غیر اسلامی نظام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کو چلانے والے افراد ہمیشہ اپنے سماج سے نکل کر آتے ہیں نہ کہ آسمان سے۔ اور جب سماج بگڑا ہوا ہو تو محض کسی فرد یا کسی سیاسی پارٹی کے بدلنے سے نظام نہیں بدل سکتا۔

اس کے نتیجہ میں قوم کے اندر حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت پیدا ہوتی ہے۔ تعمیری مزاج کے بجائے سیاسی مزاج بنتا ہے۔ پُرامن طریقوں کے بجائے تخریبی طریقے پرورش پاتے ہیں، اور جو مقصد ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

انقلابی خوش خیالیاں

شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستانی حکمرانوں سے شکایت تھی۔ انھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک چلائی۔ مگر جب بنگلہ دیش آزاد ہو چکا اور وہ اپنے بنائے ہوئے ملک کے سربراہ اعلیٰ بن گئے تو ۱۵ اگست ۱۹۷۵ کو خود ان کے ہم وطنوں نے ان کو اور ان کے سارے خاندان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنگلہ دیش میں فوجی انقلابات کا سلسلہ چل پڑا۔ آخر، نومبر ۱۹۷۵ کو کرنل ابوطاہر ایک خونین انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ صدر ضیاء الرحمٰن اگرچہ اس وقت جیل میں تھے مگر یہ انقلاب کرنل طاہر اور ضیاء الرحمٰن کے مشترکہ منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ انقلاب کے بعد ضیاء الرحمٰن تخت اقتدار پر بٹھا دئے گئے۔ انقلاب سے پہلے ضیاء اور طاہر ایک دوسرے کے دوست تھے۔ مگر ضیاء الرحمٰن نے جب اقتدار حاصل کر لیا تو کرنل طاہر کا وجود ان کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ نظر آنے لگا۔ ضیاء الرحمٰن نے کرنل طاہر کو گرفتار کر لیا۔ ان پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا اور بالآخر انھیں گولی مار دی گئی۔ ایک مصنف اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ معنی خیز سوال اٹھاتا ہے:

Was his support to Zia a good revolutionary strategy or revolutionary romanticism that was bound to misfire.

کرنل طاہر کا ضیاء الرحمٰن کی مدد کرنا ایک اچھی انقلابی تدبیر تھی یا وہ ایک انقلابی تخیل پسندی تھی جس کے لئے یہی مقدر تھا کہ اس کا نشانہ خطا کر جائے (ہندستان ٹائمس ۴ نومبر ۱۹۷۹)

اس سوالیہ جملہ کو مثبت جملہ بنا دیا جائے تو یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم انقلابیوں کے منصوبہ پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اقدامات کئے حتیٰ کہ بعض اوقات پورے پورے ملک کو ہلا ڈالا۔ مگر ان کا انقلاب جب اپنے آخری نتیجہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس انقلاب کا سارا فائدہ دوسروں کے حصہ میں چلا گیا ہے۔ کامیابیوں کے ہجوم میں اس ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ انقلابی تدبیریں نہ تھیں بلکہ انقلابی خوش خیالیاں تھیں۔ اور حقائق کی اس دنیا میں خوش خیالیوں کی کوئی قیمت نہیں، خواہ ان خوش خیالیوں کے مصنف ایسے لوگ ہوں جن کے معتقدین نے ان کو قائد اکبر اور مفکر اعظم کے خطابات دے رکھے ہوں۔

سیاست، سیاست، سیاست

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس سے پہلے وہاں زار کی شاہی حکومت قائم تھی۔ انقلاب سے پہلے وہاں جو اشتراکی تحریک چل رہی تھی اس کا ایک لیڈر جوزف اسٹالن تھا جو لینن کے مرنے کے بعد روس کا کمیونسٹ حکمراں بنا۔ اپنی تحریک کی کامیابی سے پہلے جوزف اسٹالن نے اشتراکی کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "انقلاب لانے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول اسلحہ، دوم اسلحہ، سوم اسلحہ، اور آخر میں پھر اسلحہ۔" موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے اس جملہ کو یوں بدل دیا: اسلام کو سربلند کرنے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول سیاست، دوم سیاست، سوم سیاست، اور آخر میں پھر سیاست۔ مگر سیاسی طریق کار کے پیچھے اگر ضروری طاقت موجود نہ ہو تو وہ صرف سیاست برائے سیاست ہو کر رہ جاتی ہے وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

عبرت کے لئے

اخبار الاہرام (قاہرہ) کے سابق ایڈیٹر محمد ہیکل کی ایک ۲۸۵ صفحات کی کتاب ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں دی روڈ ٹو رمضان کے نام سے چھپی ہے اور اس کا عربی ترجمہ الطریق الی رمضان کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اکتوبر ۱۹۷۳ کی مصر۔ اسرائیل جنگ اور اس سے چھ سال پہلے کے حالات پر اپنی معلومات پیش کی ہیں۔ پوری کتاب دل چسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں چند واقعات یہاں عبرت کے لئے نقل کئے جاتے ہیں

وہ ایٹم بم خریدنے گئے

(لیبیا کے فوجی انقلاب ستمبر ۱۹۶۹ کے بعد صدر معمر قذافی قاہرہ آئے) ایک موقع پر جب کہ صدر ناصر ان کو بتا رہے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ میں طاقت کی نسبت کیا ہے۔ قذافی نے بھڑک کر کہا: نہیں، نہیں۔ ہمیں سیدھے ایک بھرپور جنگ کرنا چاہئے اور اسرائیل کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ ناصر نے ضبط کرتے ہوئے کہا یہ ناممکن ہے۔ بین اقوامی صورت حال ہم کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ نہ روس اور نہ امریکہ ایسی صورت حال پیدا ہونے کی اجازت دیں گے جس سے ایٹمی جنگ چھڑ سکتی ہو۔ قذافی نے پوچھا: "کیا اسرائیل کے پاس ایٹم بم ہیں"۔ ناصر نے کہا: ہاں اس کا غالب امکان ہے۔ قذافی نے دوبارہ پوچھا: کیا ہمارے پاس بھی ایٹم بم ہیں۔ ناصر نے کہا: نہیں۔ ہمارے پاس نہیں ہیں۔

دو یا تین ماہ بعد لیبیا کی دوسرے درجہ کی بڑی شخصیت میجر جالود اچانک مصر آئے اور ناصر سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا یہ سفر بہت خفیہ ہے اور ان کا واحد مقصد صدر ناصر سے ملنا ہے۔ صدر ناصر نے ملاقات کے وقت پوچھا کہ ان کو کیا مشورہ درکار ہے۔ جالود نے کہا: ہم ایک ایٹم بم خریدنے جا رہے ہیں۔ ناصر نے پوچھا وہ کہاں سے اس کو خریدنے جا رہے ہیں۔ جالود نے کہا کہ ان کو معلوم ہے کہ امریکی اور روسی ہمارے ہاتھ ایٹم بم بیچنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ مگر امید ہے کہ چینی اس کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ناصر نے کہا کہ جہاں تک وہ جانتے ہیں ایٹم بم خرید کر کبھی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ جالود نے کہا: ہم کوئی بڑا ایٹم بم نہیں چاہتے۔ بس جنگی تدبیر کے طور پر ایک (اوسط درجہ کا) بم کافی ہوگا۔ ہم نے چینیوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ ہم اپنا ایک آدمی وہاں ملاقات اور گفتگو کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم خیر مقدم کے لئے تیار ہیں۔ اب میں چین جا رہا ہوں۔

جالود بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ انھوں نے لیبی پاسپورٹ کے بجائے مصری پاسپورٹ لیا اور پاکستان اور ہندوستان کے راستے سے سفر کر کے پیکنگ پہنچے۔ چینیوں کو خبر نہ تھی کہ اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ مگر چو این لائی کے ساتھ ملاقات کا ایک وقت مقرر ہو گیا۔ اس ملاقات میں لیبیا کی انقلابی کونسل کے نائب صدر نے بتایا کہ وہ ایک بہت ضروری معاملہ کے لئے پیکنگ آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چین تمام ایشیائی ملکوں کے لئے باعث فخر ہے۔

آپ لوگوں نے پس ماندہ ملکوں کی مدد کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگ اتنے ہی طاقت ور ہیں جتنا کہ مغرب۔ اس لئے ہم لیبیا سے آپ کی مدد حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ چیزیں بہت زیادہ داموں میں تیار ہوتی ہیں۔ ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں" چاؤ این لائی نے اس کے جواب میں نہایت نرم لہجہ اختیار کیا۔ انھوں نے معیاری چینی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ایٹم بم فروخت نہیں کئے جاتے۔ چین کو یقیناً اس سے خوشی ہوگی کہ وہ ریسرچ کے کام میں لیبیا کی مدد کرے جس طرح چند سال پہلے چین نے مصر کو تحقیقاتی مدد دینے کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی۔ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری لیبیا کو خود اپنے آپ کرنی ہوگی۔ ہر قوم کو خود کفیل بننے کی کوشش کرنا چاہئے۔ وغیرہ۔ چنانچہ میجر جالود چین سے خالی ہاتھ واپس آگئے (صفحہ ۷۷-۷۶)

کہا جاتا ہے کہ صدر ناصر جب مصر میں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بھی ایٹم بم کی خریداری کے لئے ایک وفد روس بھیجا تھا اور وہاں ان کو وہی جواب دیا گیا جو لیبی وفد کو چین میں جواب دیا گیا۔

ایک تسبیح کے بدلے ۲۰ ملین پونڈ

لیبیا میں یکم ستمبر ۱۹۶۹ کے انقلاب کے نتیجہ میں شاہ ادریس کی حکومت ختم ہوگئی اور موجودہ حکومت قائم ہوئی۔ اس واقعہ کی خبر جب پہلی بار صدر جمال عبدالناصر کو دی گئی تو حاضرین نے اس پر مختلف انداز سے تبصرہ شروع کیا۔ صدر ناصر نے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا: مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر جب کہ ہم کو ہتھیار خریدنے کے لئے رقم کی فوری ضرورت تھی۔ میں نے حسن صبری الخولی کو شاہ ادریس کے پاس بھیجا اور ان سے اس موقع پر تعاون کی درخواست کی۔ شاہ ادریس نے فوراً وعدہ کر لیا کہ وہ ہم کو ۲۰ ملین پونڈ دے دیں گے، صرف ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ ہم ان کو وہ تسبیح واپس کر دیں جو ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے الازہر کی مسجد کے لئے دی تھی اور جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ اب بھی مسجد کی کسی کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے حسن الخولی سے کہا کہ وہ الازہر جائیں اور مذکورہ تسبیح حاصل کریں اور اس کو شاہ ادریس تک پہنچا دیں۔ حسن الخولی نے فوراً ایسا کیا اور شاہ ادریس نے وعدہ کے مطابق ہم کو ۲۰ ملین پونڈ کی رقم پیش کر دی (صفحہ ۶۹-۶۸)

ہارنے والے کو خوش آمدید!

۱۹۶۷ کی مصر-اسرائیل جنگ میں مصر کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۶۷ میں خرطوم کانفرنس ہوئی۔ ناصر کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچے تو خرطوم کے ہوائی اڈے پر تقریباً پانچ لاکھ آدمی ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ امریکی میگزین نیوز ویک نے اپنی رپورٹ میں اس کا عنوان قائم کیا: مفتوح کو خوش آمدید (Hail to the Conquered) تاہم اسی اجلاس میں شرکت کے لئے اگلے دن شاہ فیصل مرحوم آئے تو ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کرنے کے لئے کوئی بھیڑ موجود نہ تھی۔ تھوڑے سے لوگ جو آئے انھوں نے بھی جو نعرہ لگایا وہ یہ تھا "ناصر کا ساتھ دو" (صفحہ ۵۲)

یہ خوش خیال مفکرین

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ ـ ۱۸۷۷) ایک آفاقی شاعر تھے۔ نہ صرف چین و عرب بلکہ سارا جہان ان کا وطن تھا۔ ان کا سبق تھا: زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز (زمانہ اگر تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے لڑ کر زمانہ کو اپنے موافق بناؤ) انھوں نے مسلمانوں کو اس قسم کے نغمے دئے:

کافر کی یہ تعریف کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ تعریف کہ گم اس میں ہیں آفاق

مگر یہی اقبال تھے جنھوں نے ۱۹۳۱ میں ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ شاعری کی دنیا میں اقبال سارے آفاق کو اپنے اندر گم کئے ہوئے تھے۔ مگر عمل کی دنیا میں وہ پوری زمین تو درکنار ایک ملک کو بھی اپنے اندر گم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ وہ ملک کے کنارے ایک ایسا چھوٹا ٹکڑا حاصل کرنے پر قانع ہو گئے جہاں مسلمان پہلے سے اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب ہوں۔ وہ شخص جو شاعری کی سطح پر "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کا ترانہ گا رہا تھا وہ عمل کی سطح پر ملک کے اکثریتی فرقہ کو بھی اپنے اندر ضم کرنے کا منصوبہ نہ بنا سکا۔ اس سے نجات کی صورت اس کی سمجھ میں صرف یہ آئی کہ بٹوارہ کر کے اپنے لئے علیحدگی کا ایک گوشہ تلاش کر لے ـــــ یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان مفکرین اور مصلحین کا حال نظر آتا ہے۔ تقریر اور تحریر میں ان کی منزل چرخ نیلی فام سے بھی پرے ہوتی ہے۔ الفاظ کی دنیا میں آسمان کے ستارے بھی ان کی گرد راہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر آتے ہی ان کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ایک پھولا ہوا غبارہ تھا جو واقعات کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گیا۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ ـ ۱۸۷۸) عالمی اسلامی خلافت کے لئے اٹھے۔ ان کی شان دار اسلامی تقریروں سے ایک پورا براعظم گونج اٹھا۔ شعری فضاؤں میں وہ "یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے" کی سطح پر پرواز کر رہے تھے۔ مگر ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۴ میں خلافت کا ادارہ ختم کر دیا تو ان کی قیادت بے زمین ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ان کے لئے کرنے کا کام اس کے سوا کچھ اور نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ایک مشترک وطن کی آزادی پر قربان کر دیں۔ جو شخص عالمی اسلامی خلافت پر جان دینے کے لئے اٹھا تھا اس نے ایک ایسی وطنی آزادی پر جان دینا پسند کر لیا جو عملاً مسلم اقلیت کے اوپر غیر مسلم اکثریت کے غلبہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اسلامی خلافت کا مینار گاندھیائی خلافت کی بنیاد کی ایک اینٹ بن کر رہ گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ ـ ۱۸۸۸) نے اپنی زندگی کا آغاز الہلال اور البلاغ کی پرشور تحریروں اور مسلم اجتماعات میں اپنی عالی شان تقریروں سے کیا۔ اس وقت وہ قرآن سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ انھوں نے "پیغمبرانہ زبان" میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ خدا کی کتاب لے کر اٹھیں اور خیر الامم کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سارے عالم کے لئے آفتاب و ماہتاب بن جائیں۔ مگر قرآنی انقلاب کا پیغام دینے والا بالآخر ہندستانی قومیت کا پیغام دینے والا بن گیا۔ وہ شخص جس نے "حزب اللہ" کے قیام کو اپنا مقصد بتایا تھا وہ حزب الوطن کی سطح پر آکر ٹھہر گیا۔ ۱۹۴۷ میں ان کی دعوت پر سارے ملک کے مسلمان لکھنؤ کنونشن میں جمع ہو گئے۔ مگر اس نازک تاریخی موڑ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ہندستانی مسلمانوں کے لئے جو پیغام تھا وہ صرف یہ کہ ـــــ سارے مسلمان انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ - ۱۹۰۳) کی مثال اور بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد حاکمیت خدا پر رکھی۔ انھوں نے کہا کہ زمین پر صرف خدا کے قانون کی حکمرانی قائم ہونی چاہئے۔ اس کے سوا جتنے قانون انسان نے بنائے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ مسلمان کے لئے ایسی زندگی حرام ہے جب کہ وہ غیر خدائی قانون پر راضی ہو جائے۔ اس کو یا تو خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے یا اس کے نفاذ کے لئے لڑتے ہوئے مرجانا ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون - - - ھم الظالمون - - ھم الفاسقون (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا تھا کہ غیر خدائی قانون کو بنانے والا قانون ساز، اس کے تحت فیصلہ کرنے والا جج، اس کو نافذ کرنے والی حکومت، سب کے سب فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک شخص مسلّمہ طور پر مجرم ہو اور اس کو انسانی قانون کے تحت سزا دی جائے تب بھی وہ جرم کی سزا نہیں ہوتی بلکہ خود ایک جرم ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی زمین پر کسی کو یہ طے کرنے کا حق نہیں کہ کسی جرم پر کسی کو کیا سزا دی جائے نہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بطور خود کسی سزا کو نافذ کرے۔ گویا کہ وہ شخص جو انسانی قانون کے تحت ایک قاتل کو قتل کرتا ہے وہ خود بھی ایک قاتل ہے۔ کیوں کہ اس نے خدا کی زمین پر خدا کی اجازت کے بغیر خدا کی پیدا کی ہوئی ایک جان کو ہلاک کیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ساری عمر قانون اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے۔ عمر کے آخری حصہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو پاکستان میں فوجی انقلاب آیا اور جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم ہوگئی جس کو نہ صرف مولانا مودودی کی مکمل تائید حاصل تھی بلکہ ان کی اپنی جماعت کے کئی افراد اس میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے۔ اس حکومت کے تحت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چلایا گیا جو خود مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے مطالبہ "پہلے احتساب پھر انتخاب" کے مطابق تھا۔ ان کے لئے پورا موقع تھا کہ وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو شرعی قانون کی عدالت میں کھڑا کریں اور اسلامی احکام کے مطابق ان پر باقاعدہ مقدمہ چلائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ساری دنیا کے سامنے اسلام کی وہ "عملی شہادت" پیش کر دیتے جس کے وہ زندگی بھر مبلغ رہے تھے اور جس کے بغیر ان کے نزدیک دعوت اسلامی کا کام مکمل نہیں ہوتا —— مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی پوری جماعت کی مکمل تائید و حمایت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلایا گیا۔ پاکستان میں اس وقت تین قسم کی عدالتیں ہیں۔ ایک فوجی عدالت، دوسرے شرعی عدالت، تیسرے برطانوی قانون کے تحت قائم شدہ عدالت جو تقسیم کے پہلے سے چلی آرہی ہے۔ وہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ کو شرعی عدالت میں جاری کرا سکتے تھے۔ بالفرض اگر شرعی عدالتوں کے اختیارات محدود ہوں تو صدارتی فرمان کے ذریعہ اس کے اختیار کو وسیع بنا کر اور حسب ضرورت قاضیوں کا تقرر کر کے یہ کام عمل میں آسکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ مولانا مودودی یا ان کی جماعت کے کسی شخص نے اس کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ مسٹر بھٹو کا مقدمہ، شرعی عدالت کو چھوڑ کر، اس عدالت کے زیر سماعت لایا گیا جو برطانوی قانون پر چلتی آرہی ہے۔ مسٹر بھٹو پر قتل کا الزام تھا جس کے لئے واضح قوانین اسلامی شریعت میں موجود ہیں۔ مگر ان کا مقدمہ جانتے بوجھتے برطانی قانون تعزیرات کے تحت چلایا گیا نہ کہ اسلامی قانون تعزیرات کے تحت۔

پاکستان کا یہ مشہور ترین مقدمہ مولانا مودودی کی مکمل تائید و حمایت کے تحت چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو

مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی جب کہ مولانا مودودی زندہ سلامت موجود تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریہ کے مطابق یہ ساری کارروائی تحاکم الی الطاغوت (اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے اس حاکم کے پاس جانا جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو) کی مصداق تھی۔ وہ مکمل طور پر غیر اسلامی تھی کیوں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت عمل میں لائی گئی۔ مگر مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کی پوری تائید کرتے رہے۔ وہ شخص جس نے اس عنوان سے شہرت پائی کہ وہ اس اصول کا سب سے بڑا مبلغ ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلہ کرنا کفر اور ظلم اور فسق ہے، یہ طاغوتی عدالت کے پاس اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے جانا ہے جو سراسر ایمان کے منافی ہے۔ جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لئے کسی طرح راضی نہ تھا۔ اس نے خود اپنے اختیار سے اس اصول کو دفن کر دیا۔ اس نے اپنی پوری تائید اور اہتمام کے ساتھ غیر خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ایک مشہور ترین "مجرم" پر مقدمہ چلوایا اور اسی غیر خدائی قانون کے مطابق اس شخص کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ وہ شخص جو ساری عمر خدائی قانون کے نفاذ کی تحریک چلاتا رہا، پہلا موقع ملتے ہی اس نے اپنے عمل سے یہ گواہی دی کہ ملک کے لئے یا کم از کم اس کے اپنے مقصد کے لئے سب سے زیادہ کارآمد قانون وہ ہے جو انسان کا بنایا ہوا ہے ـــــــ موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے بڑی بڑی اسلامی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر وہ اپنی تحریک کی آپ تردید کرتے رہے۔ پھر جو لوگ اپنی تردید آپ کریں وہ اپنے باہر کس طرح اس کو نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ وہ شاندار کامیابی حاصل کرنے کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں اسلام پسند مفکرین کا کہنا تھا کہ ملک کے ۹۹ فی صد لوگ اسلامی نظام چاہتے ہیں، صرف بھٹو جیسے چند لوگ ہیں جو اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر ان تھوڑے سے لوگوں کو میدان سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بعد عوامی انتخاب ہو تو سارے لوگ اسلام کو ووٹ دیں گے اور اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسری چیز قائم نہ ہو سکے گی۔ بے شمار ناقابل بیان قربانیوں کے بعد "بھٹووں" کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی مفکرین کے پسندیدہ حکمراں جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ کو پاکستان میں عام الکشن کرائیں گے۔ پھر اس کو ملتوی کر کے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ کی تاریخ الکشن کے لئے مقرر کی گئی جو دوبارہ منسوخ کر دی گئی۔ دونوں بار جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ چوں کہ "مثبت نتائج" کی امید نہیں اس لئے الکشن ملتوی کئے جاتے ہیں۔ "بھٹووں" کے خاتمہ پر پاکستان کے اسلام پسند عام الفتح (۱۹۷۷) منا چکے تھے۔ مگر جب انتخاب کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ عوامی رائے کے ذریعہ ان کے لئے اقتدار پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ابتدائی اندازہ کرنے کے لئے ملک میں بلدیاتی الیکشن (ستمبر ۱۹۷۹) کرایا گیا۔ مگر ہر قسم کی پابندیوں کے باوجود "بھٹو پارٹی" نے ۸۰ فی صد نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد عام انتخابات کا منصوبہ مستقل طور پر ختم کر دیا گیا۔ شاندار فتح حاصل کرنے کے باوجود صرف شاندار ناکامی اسلام پسندوں کے حصہ میں آسکی۔ اب پاکستان میں جو "اسلام پسند" حکومت قائم ہے وہ صرف جبر کے زور پر قائم ہے نہ کہ عوامی تائید کے زور پر۔

اب ایران کی مثال لیجئے۔ شاہ محمد رضا پہلوی نے جب جنوری ۱۹۷۹ میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ملک کو چھوڑا اور فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ روح اللہ خمینی فاتحانہ انداز سے تہران کے ہوائی اڈہ پر اترے تو اسلام پسندوں نے اس کو ایسا انقلاب قرار دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے باوجود ایران کو نئے انقلاب نے

جو کچھ دیا وہ صرف دہشت و بربریت تھی۔ ایران کے عوام کو اسلام کی برکتوں کا کوئی تجربہ نہ ہو سکا۔ اٹلی کی ایک صحافی خاتون اوریانا فلاسی (Oriana Fallaci) نے اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا دورہ کیا اور ایران کے مطلق حکمراں آیات اللہ روح اللہ خمینی کا انٹرویو لیا۔ خاتون نے موصوف سے پوچھا "میں نے ایران کے دورہ میں دیکھا کہ یہاں اسلامی انقلاب کے نتائج سے لوگ بہت غیر مطمئن ہیں۔ ہر طرف انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے اسلامی انقلاب کا وہ پھل لوگوں کو نہیں ملا جس کا ان سے انقلاب سے پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔ حتی کہ یہاں کچھ لوگ ہیں جو اندیشہ کر رہے ہیں کہ ایران کے لئے بہت مشکل ایام آنے والے ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے" آیات اللہ خمینی جن کی عمر ۸۰ سال ہو چکی تھی اس کے جواب میں کہا: ہم اس بچہ کی طرح ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ ماہ ہے۔ ہمارے اسلامی انقلاب کی عمر صرف چھ مہینے ہے۔ ہم اپنے سفر کے آغاز میں ہیں۔ آپ ایسے بچے سے کیا امید کر سکتی ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ مہینے ہو (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ نومبر ۱۹۷۹)

ایران کے اسلامی لیڈر کا یہ جواب صرف اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا انقلاب شان دار کامیابی کے باوجود صرف شاندار ناکامی تک پہنچا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک "بچہ" ہوتی ہے، انقلاب کبھی بچہ "نہیں ہوتا۔ انقلاب تو کسی تحریک کے مکمل عمر کو پہنچنے کا نام ہے۔ پھر وہ بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ انقلاب جو انقلاب کے مرحلہ میں پہنچ کر بچہ ہو وہ انقلاب ہی نہیں۔ وہ صرف ایک ہڑلونگ ہے جس کو غلطی سے انقلاب کا نام دے دیا گیا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ الہی خلافت کے نام پر اٹھنے والے جب اقتدار پاتے ہیں تو فوراً انسانی آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ملک کے مایوس اور ناراض عوام کے درمیان اپنی زندگی کی کوئی صورت انھیں آمریت کے سوا نظر نہیں آتی۔ "اسلامی نظام" قائم کرنے کے دعوے دار بالآخر "غیر اسلامی نظام" قائم کر کے اس کے سایہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے انتہائی بڑے بڑے اسلامی مفکرین و مصلحین کا یہ عبرت ناک انجام کیوں ہوا۔ اس کے اسباب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ایک مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مفکرین دراصل رومانی مفکرین تھے نہ کہ حقیقت پسند مفکرین، اور رومانی دنیا میں جو خیالی محل بنایا گیا ہو وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی واقعی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ رومانویت (Romanticism) جو اٹھارویں صدی سے لے کر جنگ عظیم اول تک ایک خاص صورت میں یورپ میں پائی جاتی تھی، وہی انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلم مفکرین پر اپنے حالات کے لحاظ سے چھائی رہی ہے۔ ہر قوم جس کا ایک شان دار ماضی ہو اور پھر وہ زوال کا شکار ہو جائے، اس کے بعد جب اس کے درمیان احیاء نو کی تحریک اٹھتی ہے تو اس میں خوش خیال مفکرین کثرت سے جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنے تصوراتی ماضی کے زیر اثر اپنے مستقبل کے بارے میں حسین خواب دیکھتے ہیں جو ہمیشہ مبالغہ آمیز حد تک خیالی ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں کوئی واقعہ پیدا کرنے کے لئے لمبا وقت اور خشک عمل درکار ہوتا ہے۔ جب کہ خیالی دنیا میں شان دار قلعہ کھڑا کرنے کے لئے الفاظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ماضی اور مستقبل کے درمیانی فاصلہ کو طے کرنے کے لئے الفاظ کے بڑے بڑے پل بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے دور میں حقیقت پسندانہ بات کرنے والے کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ البتہ آنے والے مستقبل کا جو شخص جتنا زیادہ مبالغہ آمیز نقشہ دکھائے اتنا ہی زیادہ وہ عوام میں مقبول ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام مفکرین خوش خیالیوں کا محل کھڑا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور جس کا

فرضی محل جتنا زیادہ شان دار ہو اتنا ہی زیادہ بھیڑ اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بھیڑ تخریبی نوعیت کا کوئی "انقلاب" برپا کرنے میں ممکن ہے کامیاب ہو جائے۔ مگر وہ تعمیری نوعیت کا انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تخریبی انقلاب کے لئے تو کسی "بھٹو" یا کسی "شاہ رضا" کا گلا گھونٹ دینا کافی ہے۔ مگر تعمیری انقلاب کے لئے "مارنا" نہیں بلکہ "زندہ کرنا" پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہوش درکار ہے نہ کہ جوش۔ اس کے لیے حقیقت پسندی درکار ہے نہ کہ خوش خیالی۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی خاموش جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے مثبت عوامل درکار ہوتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے مطابق حقائق و واقعات کی زمین فراہم کی جائے۔ مگر یہ وہ چیزیں ہیں جو خوش خیال مفکرین کے یہاں سرے سے موجود نہیں ہوتیں۔ ان کا سرمایہ ہوتا ہے — غلو، لفاظی، خیال آرائی، شاعرانہ بلند پروازی۔ اور ظاہر ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کا خیالی محل اپنے لئے حقیقی زمین نہ پاکر اچانک منہدم ہو جاتا ہے۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ زمانہ کے ان اسلامی مفکرین و مصلحین نے کوئی مفید کام نہیں کیا۔ ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ مفید پہلو ہوتے ہیں اور ان کی تحریکوں کے دوران بھی بلاشبہ کئی مفید کام انجام پائے۔ مگر یہ تحریکیں مجموعی طور پر اثمهما اکبر من نفعهما (ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے) کا مصداق تھیں۔ اور سب سے بڑا نقصان جو ان تحریکوں کے ذریعہ امت مسلمہ کو پہنچا وہ ذہنی بگاڑ تھا۔ یہ براہ راست طور پر انھیں تحریکوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ جذباتی اور غیر حقیقت پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی تحریک جو انسانی معاشرہ میں اٹھے، ضروری نہیں کہ وہ اپنے مقررہ عملی نشانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ تاہم عملی نتیجہ نہ پیدا کرکے بھی وہ ایک نتیجہ لازماً پیدا کرتی ہے، اور وہ فکری نتیجہ ہے۔ ہر تحریک کم از کم اپنے متاثر ہونے والوں میں، سوچنے کا ایک ڈھنگ، رائے قائم کرنے کا ایک طریقہ، معاملات کے بارے میں فیصلہ کا ایک ذہن دیتی ہے۔ اس لئے کسی تحریک کی قدر وقیمت کو اس اعتبار سے متعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عملی طور پر اپنی مقررہ منزل تک پہنچی یا نہیں۔ بلکہ کسی تحریک کی قدر وقیمت کو جانچنے کا اصلی معیار یہ ہے کہ اس نے جن افراد کو متاثر کیا ان کے اندر اس نے کس قسم کا فکری مزاج پیدا کیا۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کی قوم کے مزاج کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین و مصلحین کا ایک طبقہ وہ ہے جس کا تمام تر سرمایہ بڑے بڑے الفاظ تھے۔ اس نے شاعرانہ ترنگوں، جوشیلی تقریروں اور خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ اپنی تحریکیں چلائیں۔ الفاظ کے زور پر واقعات برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان تحریکوں نے قوم کے افراد کو صرف جذباتی بنانے میں مدد دی۔ لوگ الفاظ کو واقعہ کا بدل سمجھنے لگے۔ حقیقت پسندانہ طرز فکر ان سے رخصت ہو گیا۔ خیال آرائیوں سے وہ اس نتیجہ کی امید کرنے لگے جو اس دنیا میں صرف حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ مفکرین تھے جو خود بھی غلو کا شکار ہوئے اور اپنے افکار سے دوسرے بہت سے لوگوں کو غلو کا شکار کیا۔ وہ سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ ملت کا مستقبل برآمد کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی غلو پسندی صرف سیاسی عمل پر قانع نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے سیاسی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے پورا سیاسی فلسفہ بنایا، حتیٰ کہ خود قرآن و اسلام کو سیاسی بنا ڈالا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے ان کے لئے خدا کا دین ایک قسم کا سیاسی نظریہ بن کر رہ گیا۔ وہ بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے مکمل اسلام کو پالیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جس اسلام کو پایا اس میں سب کچھ تھا مگر وہی چیز نہ تھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے ——— تعلق باللہ اور خوف آخرت۔

مدعو میں برتری کی نفسیات پیدا کرنا

مسز اندرا گاندھی کو ہندستان کے الکشن ۱۹۷۷ میں مکمل شکست ہوئی تھی، اس کے بعد جنتا حکومت نے پوری کوشش کی کہ ان کو سیاسی منظر سے ہٹادے۔ مگر جنوری ۱۹۸۰ کے الکشن میں دوبارہ اندرا گاندھی کو اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی کہ ہندستانی پارلیمنٹ کی دو تہائی نشستوں پر ان کی پارٹی قابض ہوگئی۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندستان ٹائمس (۸ جنوری ۱۹۸۰) لکھتا ہے: ملک اپنی جمہوریت پر فخر کرسکتا ہے جس نے اندرا کے لئے اس حیران کن واپسی کو ممکن بنایا۔ ہندستان کا سیاسی ڈھانچہ انتخابی طریقہ کے ذریعہ پرامن سیاسی تبدیلی کے نظام کے ساتھ، ان بہت سے زیر ترقی ممالک سے ممتاز طور پر نمایاں ہے جہاں اختلاف رائے کو سختی سے دبا دیا گیا ہے، انفرادی آزادی کا خاتمہ کردیا گیا ہے اور سیاسی تبدیلی صرف تشدد ہی کے ذریعہ وجود میں آسکتی ہے:

> The country can be proud of its democracy which has enabled her to make her stunning comeback. India's political system with its mechanism of smooth political change through the ballot, stands out in striking contrast to those of most developing countries where dissent is stiffled, individual liberties smothered and change ushered in only amid violence.

اس عبارت میں واضح طور پر ایران اور پاکستان جیسے ملکوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اقتباس موجودہ زمانہ کے ایک بہت بڑے المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں انھوں نے اسلام کی کوئی واقعی خدمت تو نہ کی۔ البتہ اسلام کو ایک بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ انھوں نے اپنے "بوائق" کو اسلام کا عنوان دے کر دوسری قوموں کے سامنے اسلام کی تصویر ہلکی کردی۔ اور اس طرح مدعو اقوام میں غیر ضروری طور پر اسلام کے مقابلہ میں احساس برتری کا جذبہ پیدا کردیا۔

یہ تحریکیں اگر اسلام کے سوا کسی اور نام پر اٹھتیں تو ان کی نادانیوں کا الزام ان کے اپنے سر جاتا۔ مگر اسلام کے نام پر اٹھنے کی وجہ سے ان کی ہر چیز اسلام کی طرف منسوب ہوگئی۔ وہ قومیں جو اسلام کے لئے مدعو کا درجہ رکھتی تھیں وہ اپنے کو افضل پاکر اس نفسیات میں مبتلا ہوگئیں کہ ان کے پاس وہ چیز زیادہ بہتر طور پر موجود ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ "اسلامی نظام" اور "نظام مصطفیٰ" میں انسان کی آزادی کو کچلا جاتا ہے جب کہ ہمارے اپنے نظام میں انسان کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔ ان کے یہاں حرث و نسل کی ہلاکت کی قیمت پر حکومتیں بدلتی ہیں، ہمارے یہاں پرامن انتخابات سے۔ ان کے یہاں سیاسی اختلاف پر کوڑے لگتے ہیں اور ہتھکڑیاں پہنائی جاتی ہیں، ہمارے یہاں سیاسی اختلاف پر کوئی پابندی نہیں۔ ان کے یہاں کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے نہ گواہی شہادت کی ضرورت ہے اور نہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کی۔ جس کو چاہا پکڑا اور سرسری سماعت کے بعد گولی ماردی یا جیل میں بند کردیا۔ ہمارے یہاں کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاسکتی جب تک اس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر قانونی طور پر اس کو مجرم ثابت نہ کردیا جائے۔ ان کے یہاں اختلاف کو آپس کی مار کاٹ کے ذریعہ طے کیا جاتا ہے، ہمارے یہاں آپس کا اختلاف پرامن ذرائع سے طے ہوجاتا ہے ———— مسلمان اپنی نالائقی کی بنا پر موجودہ دنیا میں دوسرے درجہ کی قوم بن چکے تھے، اب انھوں نے اسلام کی غلط نمائندگی کرکے اسلام کو بھی قوموں کی نظر میں دوسرے درجہ کا مذہب بنادیا ہے۔

ضمیر — دنیا میں خدا کی عدالت ہے

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۷۹ — ۱۹۲۸) کو قتل کے الزام میں راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم واجب القتل تھے یا نہیں، اس میں دنیا کے علما قانون کی دو رائیں ہیں۔ تاہم اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان کے علم برداران اسلام نے ۴ اپریل کی رات کو اس شخص کو قتل کر دیا جس کا نام "ذوالفقار علی بھٹو" تھا۔

اس سلسلے میں ہم پاکستان کے علم برداران اسلام سے صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اصل مسئلہ دنیا کا نہیں بلکہ آخرت کا ہے۔ اگر فی الواقع آپ کے اس اقدام کا مقصد انصاف کے تقاضے پورا کرنا تھا تو اللہ کے یہاں آپ کے لئے اجر ہے۔ اور اگر یہ ایک قانونی ڈراما تھا جو سیاسی مقصد کے لئے کھیلا گیا تو آپ کو ڈرنا چاہئے کہ کل قائم ہونے والی بڑی عدالت میں آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔

ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ آپ اپنا احتساب کرکے دیکھیں کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تنہائی کے وقت میں جب کہ نہ کوئی آپ کے آگے ہو اور نہ پیچھے، نہ کوئی دائیں ہو اور نہ کوئی بائیں۔ بس آپ ہوں اور آپ کا خدا ہو۔ ایسے عالم میں آپ اپنے کو بے پردہ کرکے دیکھیں کہ اس پھانسی کا محرک آپ کے لئے کیا تھا۔ کیا یہ کہ ایک بے گناہ انسان کے قاتل کو اس کے قتل کی سزا مل جائے۔ یا اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ کام کر رہا تھا کہ ایک سیاسی حریف جس کے متعلق آپ جان چکے تھے کہ الکشن کے میدان میں آپ اس کو شکست نہیں دے سکتے، اس کو قتل کرکے ہمیشہ کے لئے سیاست کے میدان سے ہٹا دیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے ایک عدالتی ڈرامہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

تنہائی کا احتساب جس میں آپ کا دل لرز رہا ہو اور آخرت کے خوف سے آپ کی پلکیں بھیگ گئی ہوں، اگر آپ کو یہ بتائے کہ آپ نے صرف ایک "قاتل" کو اس کے قتل کے جرم کی سزا دینے کے لئے ایسا کیا ہے، اس میں کوئی سیاسی جذبہ شامل نہیں ہے تو بلاشبہ آپ اللہ کے نزدیک بری الذمہ ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ اپنا احتساب کرتے وقت آپ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں۔ آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ کی اندرونی آواز آپ کی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے گواہ کی گواہی آپ کے خلاف ہے۔ آپ سے اتنا بڑا جرم ہو گیا ہے کہ آخرت میں ہمالیہ پہاڑ کے برابر سونا دے کر بھی آپ اپنے کو بری الذمہ نہ کرا سکیں۔ اس دن نہ کسی "جنرل" کو اس کی مسلح فوج بچانے والی ثابت ہوگی اور نہ کسی "اسلام پسند" کو کوئی فوجی حکمراں۔ آج کے تمام بامعنی الفاظ اس وقت بے معنی ہو جائیں گے۔ آج کے تمام ساتھی اس دن ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو آج آپ کو مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں۔

باہر کے جن لوگوں نے اس کارروائی کی تائید کی، ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ اگر وہ پائیں کہ ان کی تائید صرف اس لئے تھی کہ قاتل کو اس کے قتل کی سزا ملے تو اللہ کے یہاں ان کے لئے اجر ہے۔ اور اگر اس کے پیچھے دوسرے محرکات کام کر رہے ہوں تو وہ بھی یکساں طور پر اس ذمہ داری میں شریک ہیں۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: اذا عملت الخطیئة فی الارض ۔ ۔ ۔ من غاب عنہا فرضیہا کان کمن شہدہا (ابوداؤد) ■

ہم کہاں ہیں

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ کو ایک بڑی اسلامی شخصیت کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس شخصیت سے وابستہ اخبارات و رسائل میں مرحوم کے بارے میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین نے بتایا کہ مرحوم کے معتقدین مرحوم کے بارے میں کیسی غیر معمولی شیفتگی اور وارفتگی اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے۔ مرحوم کی موت نے ان کے دل کے پیمانہ کو چھلکا دیا اور انھوں نے مرحوم کے تذکرے انتہائی والہانہ انداز میں بیان کئے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میں نے مرحوم کے ایک معتقد سے پوچھا کہ آپ کے یہ اخبارات و رسائل چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے نکل رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان پرچوں میں کبھی خدا کا تذکرہ بھی اس جوش اور وارفتگی کے ساتھ شائع ہوا ہو۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کے کارناموں سے سرشار ہو اور خدا کے نام سے اس کے قلب و روح میں حرکت پیدا ہو جائے۔ پھر کیا آپ کے اخبارات و رسائل کے صفحات میں کبھی خدا کے لئے ان غیر معمولی کیفیات کا مظاہرہ ہوا ہے جو آپ نے اپنے رہنما کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔

یہ صرف کسی ایک اسلامی تحریک کا معاملہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں اور تحریکوں کا حال یہی ہے۔ ان کی مجلسیں اپنے "اکابر" کے تذکرے سے معمور ہیں۔ ہر ایک نے اپنے کچھ بڑے بنا لئے ہیں اور جب ان بڑوں کا نام آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زبان و قلم پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس کسی بھی حلقہ میں یہ نظر نہیں آتا کہ وہاں خدا کے چرچے میں لوگوں کو لطف ملتا ہو، خدا کا نام آنے پر لوگوں کے اندر والہانہ کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ خدا کی حیثیت بس ایک خشک عقیدہ کی ہے۔ جب کہ ان کی اپنی محبوب شخصیتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا نام آتے ہی ان کی پوری ہستی جھوم جاتی ہے۔ ان کے دل و دماغ کا چمن کھل اٹھتا ہے۔ ان کے تصور سے ان کی یادوں کی دنیا میں بہار آ جاتی ہے

خدا اپنے سورج کے ذریعہ سارے عالم کو روشن کر رہا ہے مگر اس کو دیکھ کر کسی پر غیر معمولی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ البتہ دنیا کو یہ بتانے میں وہ فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی محبوب شخصیت نے سارے عالم کو اپنی تقریروں سے جگمگا دیا ہے۔ ہواؤں کا نظام دیکھ کر انھیں خدا کی کاریگری پر وجد نہیں آتا۔ البتہ اپنے بزرگوں کے کارنامے بتانے کے لئے وہ یہ شاندار الفاظ پا رہے ہیں کہ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے فیض کی ہوائیں چلا دی ہیں۔ زمین و آسمان میں خدا کی بے پایاں حکمتیں ان کی روح پر رقص طاری نہیں کرتیں۔ البتہ اپنے محبوب قائد کے فکر و تدبر کی عظمت کو بتانے کے لئے لغت کے سارے الفاظ بھی ان کو ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنی بے پناہ طاقت سے زمین و آسمان کو سنبھال رکھا ہے مگر اس کو دیکھ کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے۔ البتہ اپنے بڑے ان کو اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے وہ تمام ملکوں اور قوموں کو تھامے ہوئے ہیں۔ پانی کا عجیب و غریب انتظام جس نے زمین کو ساری معلوم کائنات میں ایک استثنائی کرہ بنا دیا ہے ان کو حیرانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے پیشواؤں کے کارنامے بیان کرنے کے لئے وہ پورے جوش سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کے فیض کے چشمے سے ساری دنیا سیراب ہو رہی ہے ——— شاید انسان کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا مرکز محبت بنانا چاہتا ہے اور جب خالق اس کو دکھائی نہیں دیتا تو وہ کسی مخلوق کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے۔

نظام مصطفیٰ کی نئی تعبیر

ذوالفقار علی بھٹو کی قید کے زمانہ میں پاکستان قومی اتحاد کے ایک حامی اخبار نے طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

"۔۔۔اب تو بھٹو نے جیل میں سجادہ بچھالیا ہے، نمازیں پڑھنا شروع کر دی ہیں اور تسبیح ہاتھ میں لئے اوراد و وظائف میں مشغول دکھائی دیتے ہیں (المنبر فیصل آباد ۲۳ مئی ۱۹۷۸) ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مسٹر بھٹو کو جب پھانسی کے تختہ پر کھڑا کیا گیا تو آخری کلمات جو ان کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے: "خدایا میری مدد کر، میں بے قصور ہوں" رپورٹر مسٹر مارک ٹولی (Mark Tully) کے لئے دنیا کو اس واقعہ کی خبر دینا اتنا مہنگا ثابت ہوا کہ نظام مصطفیٰ کے علم بردار نوجوانوں نے اسلام آباد میں رپورٹر کو گھیر کر اسٹک سے مارا اور حکومت نے اس کے خلاف راولپنڈی کے مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا ـــــ نظام مصطفیٰ کی یہ قسم بالکل نئی ہے کہ اس کے علم بردار کسی شخص کو صرف اس کے جرم کی سزا دینا کافی نہیں سمجھتے، اسی کے ساتھ وہ اس کو جہنم میں پہنچانا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہم کو عیسائی ہو جانا چاہئے

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ۵ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی میں تعزیتی جلسہ ہو رہا تھا۔ عورتیں اور مرد جمع تھے۔ غیر ملکی نامہ نگار بھی جائزہ لینے کے لئے آ گئے۔ اس موقع پر ایک پاکستانی مسلم خاتون نے ایک مغربی نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے کہا:

If this is Islam, we should all become Christians

اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب کو عیسائی ہو جانا چاہئے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۶ اپریل ۱۹۷۹) خاتون کے جملہ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اگر اس کا نام ہے کہ اپنے سیاسی حریفوں کو اخلاقی مجرم بنا کر قتل کرو تو ایسے اسلام سے مسیحیت بہتر ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کی گواہی موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفیٰ" کے علم بردار دے رہے ہیں۔

ایک اقدام سے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں

مسٹر اندر ملہوترا نے ایک مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے کیا کیا اثرات کشمیر کی سیاست پر پڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں کشمیری مسلمانوں کی ناراضی اور ضیاء الحق مردہ باد" کے نعروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ---Despite the law and order problem that has been created in the valley, the present situation provides this country with an opportunity to eliminate once and for all, the 'Pakistan Factor' from the politics of Kashmir.
> The Times of India, April 12, 1979

پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف کشمیر میں جو مظاہرے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے اگرچہ وادی میں امن و نظم کے مسائل پیدا ہوئے ہیں، مگر یہ صورت حال ہندستان کے لئے موقع دے رہی ہے کہ وہ کشمیر کی سیاست سے "پاکستانی عامل" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے ـــــ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام بے شمار پہلوؤں سے اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ تاہم جو لوگ خود غرضی اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ ان پہلوؤں کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔ ■

الفاظ ۔ الفاظ ۔ الفاظ

" سیکولر اور جمہوری قوتوں کو منظم کیجئے "
" خیر پسند اور شر بیزار انسانوں کو پکارئے "
" ووٹوں کی طاقت کو دباؤ کی سیاست کے لئے استعمال کیجئے "
" جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ اپنی آواز بلند کیجئے "
" اپنے حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبات کی دھوم مچائیے "
" ظالمانہ حکومت کو متحدہ طاقت سے اکھاڑ پھینکئے "
" جمعہ کے روز مسجدوں اور مدرسوں میں یوم دعا منائیے "
" لوگوں کے دلوں کے دروازہ پر دستک دیجئے "

ہر روز کاغذ کے لاکھوں ورق اس قسم کے الفاظ سے سیاہ ہو رہے ہیں۔ اور بے شمار لاؤڈ اسپیکر ہر دن ان کو فضا میں بکھیر رہے ہیں۔ مگر ان کوششوں سے اتنا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا جتنا قوم کی جیب سے ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الفاظ کی پہلوانی ہے اور الفاظ کی پہلوانی کسی قوم کو حقیقت کی دنیا کا سورما نہیں بنا سکتی۔

فرض نماز کا وقت ہو جائے اور مسجد سے آواز بلند ہو: حیّ علی الصلوٰۃ (آؤ نماز کی طرف) تو اس وقت عبادت الٰہی کا مقام مسجد ہوتا ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مسجد میں آکر اپنے عابد ہونے کا ثبوت دے۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص ایسا کرے کہ عین اس وقت مسجد کے باہر میدان میں شامیانہ لگائے اور لاؤڈ اسپیکر پر "فلسفہ عبادت" کے موضوع پر لمبی تقریر شروع کر دے تو یہ اس کے عابد ہونے کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ صرف ظالم ہونے کا ثبوت ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت کسی کے لئے اپنے عابد ہونے کا ثبوت دینے کا مقام مسجد ہے نہ کہ جلسہ گاہ میں عبادت کے عنوان پر شاندار تقریر۔

اس قسم کی غیر مطلوب عبادت آج لوگوں کے اندر بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ دور کے "مظلومین" کے بارے میں تجویزیں اور بیانات چھپ رہے ہیں۔ حالاں کہ مظلوموں سے ہمدردی کا ثبوت دینے کا مقام سب سے پہلے آدمی کا اپنا پڑوس ہے۔ دوسروں کو انسانیت اور اخلاق کا سبق دینے کے لئے کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ حالاں کہ انسانیت دوست اور با اخلاق "حقیقۃً" وہ ہے جو خود اپنے معاملات میں انسانی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کرے۔ ملت کو بچاؤ کا نعرہ ہر ایک لگا رہا ہے مگر فرد کو بچانے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ آدمی اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت وہاں دینا چاہتا ہے جہاں اس کی خدا پرستی ایک شان دار چیز بن کر لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرے، حالاں کہ اس کا خدا جہاں اس کی خدا پرستی کا امتحان لینے کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ مقامات وہ ہیں جہاں سب کچھ کر کے بھی آدمی کو کوئی عزت اور شہرت حاصل نہیں ہوتی۔

مسلمان: کل اور آج

آج کل کسی بڑے قومی ادارہ کا ذکر ہو تو مشکل ہی سے اس کے ذیل میں کسی مسلمان کا نام آتا ہے۔ مگر آزادی سے قبل صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت قومی اداروں کے ساتھ مسلمانوں کے نام اتنی کثرت سے وابستہ تھے کہ کسی ادارہ کے تذکرہ کے ذیل میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا تذکرہ آجانا ضروری تھا۔ مسٹر ڈی۔ ڈی لکھن پال (سابق صدر ریڈیو مینوفیکچررس ایسوسی ایشن آف انڈیا) پچھلے دور میں لمبی مدت تک آل انڈیا ریڈیو سے متعلق رہے ہیں۔ انھوں نے قومی نشریاتی ادارہ سے متعلق اپنی یادداشت شائع کی ہے (ٹائمس آف انڈیا ۳ جولائی ۱۹۷۵)

اس مضمون میں آل انڈیا ریڈیو کے سابقہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کی تعداد کل آٹھ ہے جن میں سے چار مسلمان ہیں:

سرابراہیم رحمت اللہ، وائی اے فضل بھائی، حاجی حسن علی، سراکبر حیدری

اسی طرح سوتنتر لیڈر مسٹر مینو مسانی (۔ ۱۹۰۵) سے ایک اخبار نویس نے پوچھا "آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: یوسف مہر علی نے میری زندگی کو نئے افکار سے دوچار کیا، میرا کردار بدلا اور میری قوت فکر کو جلا دی۔ وہ میرے کالج کے ساتھی تھے اور میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ انھیں سے متاثر ہوا ہوں (شبستان)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ بوڑھے غیر مسلموں میں کتنے ہی ایسے ملیں گے جو اپنی زندگی کی سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت کی حیثیت سے کسی مسلمان کا نام لیں گے۔ مگر اب یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ اب اس ملک کے مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں قائدانہ مقام سے ہٹ کر پیچھے کی صفوں میں جا چکے ہیں۔

اس فرق کی وجہ کوئی ظلم یا تعصب نہیں ہے۔ اس کی وجہ تمام تر اقتصادی ہے۔ قدیم ہندوستان کی اقتصادی بنیاد زراعت پر قائم تھی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں بڑی بڑی زمینداریاں تھیں۔ یہ صورت حال ان کو نہ صرف حوصلہ اور اعتماد دیتی تھی بلکہ وہ مالی قیمت بھی ادا کرتی تھی جو کسی شعبہ میں آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے۔ قدیم زمین دار خاندانوں ہی سے عام طور پر وہ لوگ نکلتے تھے جو علم و عمل کے مختلف شعبوں میں ترقی کرتے تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادیات کی بنیاد زمین کے بجائے صنعت و تجارت ہو گئی۔ مسلمان نئے اقتصادی نظام میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اس لئے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں بھی پیچھے رہ گئے۔

گزرے ہوئے "کل" کو واپس لانے کے لئے احتجاج اور مطالبات کی مہم چلانا اپنی محرومی کی مدت کو مزید لمبا کرنا ہے۔ ہمارے لئے کرنے کا واحد کام یہ ہے کہ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اقتصادیات کی زمین کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں ہم کو اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہو سکے۔

ترکی کی یہ تاریخ ایک انتہائی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کس طرح حالات کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے اور نتیجۃً وقت کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں دو اور علامتی مثالیں بھی ہیں۔ ملی کام کے لئے جان دار کارکنوں کا نہ ملنا، اور تیاری کے بغیر اقدامات۔

جدید ترکی میں دو شخصیتیں علمی وفکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۸۸-۱۸۴۰) دوسرے ضیا گوک الپ (۱۹۲۴-۱۸۷۵) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور "ترک اتحاد" کے بجائے "اسلامی اتحاد" کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار وسیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی"

Halde Edib, Turkey Faces West, P.84

دوسری طرف ضیا گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست وقیادت پر چھاگئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ نامق کمال نے اگرچہ اپنی قوم کے ایک طبقہ میں محبوبیت حاصل کی۔ تاہم اپنے خطیبانہ ادب میں وہ جن خیالات کو پیش کر رہے تھے، ان کے اندر روایتی لوگوں کے لئے خواہ کتنی ہی اپیل ہو، جدید افکار کے عالمی سیلاب میں اس کی حیثیت ایک قسم کے رومانی خواب کی تھی۔ اصولی طور پر بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ اسلام کو اجتماعی اداروں کی بنیاد ہونا چاہیے۔ مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں عملی طور پر سیکولر افکار کا غلبہ ہو، کوئی شخص اپنا علیحدہ جزیرہ تعمیر نہیں کرسکتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عمومی فکری فضا کو اس کے موافق بنالیا جائے۔

سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت

کوئی مرد عورت اپنی اولاد کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہی سیاست کا معاملہ بھی ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پیدا کردہ سیاسی حالات کے منطقی نتائج سے انکار کر سکے۔ ایسی ہر کوشش ہمیشہ الٹی پڑتی ہے اور صرف محرومیوں میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کو پاکستان کی مثال سے سمجھئے۔

پاکستان تقسیم کے نعرہ پر بنا۔ مسلمانوں کی طرف سے "ڈائرکٹ ایکشن" کی نوبت آجانے کے بعد بالآخر یہ تحریک کامیاب ہوئی اور فریق ثانی نے اس مطالبہ کو مان لیا کہ آبادی کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب تقسیم کی سرحدیں طے کرنے کا وقت آیا تو پاکستانی لیڈروں کو نظر آیا کہ تقسیم کے اصول کے مطابق "جوناگڑھ" اور "حیدر آباد" جیسی مسلم ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اب انھوں نے کوشش کی کہ دیسی ریاستوں کے معاملہ میں الحاق کے اصول کو مبہم رکھا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ بیک وقت کشمیر پر بھی قبضہ کر لیں گے اور حیدر آباد پر بھی۔ کشمیر کو اس دلیل سے کہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، حیدر آباد کو اس لئے کہ وہاں کا حکمراں مسلمان ہے۔ مگر یہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے منطقی نتائج سے انکار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا انجام الٹا ہوا۔ دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں پاکستان ایک کو بھی نہ پکڑ سکا۔

پاکستان بنا تو وہ دو ایسے الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک (مشرقی حصہ) واضح طور پر دوسرے کے مقابلہ میں عددی اکثریت رکھتا تھا۔ بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کی کوششوں سے پاکستان کے سابقہ دونوں حصوں میں سیاسی مساوات (Parity) قائم ہوگئی۔ صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت میں یہ مساوات ایک مسلمہ سیاسی اصول کے طور پر باقی رہی۔ اس کے مطابق مشرقی حصہ کے چالیس ہزار اور مغربی حصہ کے چالیس ہزار نمائندہ ووٹر ملک کی حکومت کا فیصلہ کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے رہنما اس نظام کے خلاف ہوگئے۔ انھیں صدر ایوب کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور اس کی سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ عوام کو یہ کہہ کر ان کے خلاف بھڑکا دیا جائے کہ بنیادی جمہوریت قائم کر کے انھوں نے عوام کے سیاسی حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اب پاکستان میں تحریک جمہوریت چلائی گئی۔ بے پناہ نقصانات کے بعد بالآخر تحریک کامیاب ہوئی۔ صدر ایوب اور ان کی بنیادی جمہوریت دونوں ختم ہوگئے۔

۱۹۷۰ میں پاکستان کا پہلا عوامی انتخاب ہوا جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی آبادی چونکہ زیادہ تھی، اس کے نمائندوں کی تعداد مرکزی اسمبلی میں زیادہ (۵۵ فی صد) ہوگئی۔ مساوات ٹوٹ گئی اور بنگلہ دیش نے پاکستان کے اوپر سیاسی بالاتری حاصل کر لی۔

اب پاکستان کے رہنما چیخ اٹھے۔ انھوں نے جمہوریت کے فتنہ کو یہ سمجھ کر جگایا تھا کہ وہ خود ان کو اقتدار تک پہنچانے کا زینہ بنے گی نہ اس لئے کہ بنگلہ دیش کے سیکولر لیڈر اس کو استعمال کر کے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے۔ انھوں نے چاہا کہ جمہوریت کو دوبارہ "پابند جمہوریت" بنائیں اور مشرقی اور مغربی حصہ میں مساویانہ نمائندگی

کا اصول قائم کریں جیسا کہ وہ پہلے قائم تھا۔ مگر عوامی جمہوریت کو زندہ کرنے کے بعد اس قسم کی کوشش خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج سے بھاگنے کے ہم معنی تھا۔ بنگلہ دیش عوامی رائے دہی کے اصول کے تحت ملی ہوئی سیاسی فوقیت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ جمہوری منطق کے تحت پیدا شدہ نتائج کے انکار نے نئے شدید تر مسائل پیدا کئے۔ دونوں حصوں میں کش مکش بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ خود پاکستان دو ٹکڑے ہوگیا۔

۱۹۷۸ میں یہ تجربہ اب ایک نئی شکل میں دہرایا جارہا ہے۔ پاکستان کے دوسرے عوامی انتخاب (۱۹۷۷) میں بھٹو پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حزب مخالف کے لئے یہ سیاسی محرومی ناقابل برداشت تھی۔ اس نے الکشن کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ بھٹو پارٹی دھاندلی کرکے الکشن جیتی ہے۔ ورنہ پاکستانی عوام کی ننانوے فی صد اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے "دوبارہ الکشن کراؤ" کے نام پر پاکستانی شہروں میں ہنگامے شروع کر دیئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر فوجی افسروں نے بغاوت کردی اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ صرف ریفری کے طور پر حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے ہیں اور بہت جلد منصفانہ الکشن کرائے جائیں گے۔

پاکستان قومی اتحاد کے لیڈر خوش ہوگئے اور ۱۹۷۷ کو "عام الفتح" قرار دیا۔ مگر بھٹو پارٹی کے جلسوں میں عوام کی بھیڑ نے بتایا کہ بھٹو کے بے اقتدار ہونے کے باوجود عوام اب بھی اسی کے ساتھ ہیں اور اگر الکشن ہوا تو بھٹو پارٹی ہی دوبارہ برسر اقتدار آجائے گی۔ جس جمہوریت کو لانے کے لئے پاکستانی رہنماؤں نے چوتھائی صدی خرچ کردی تھی وہ جب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ساری کی ساری "بھٹو" جیسے لوگوں کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ مسئلہ صرف جمہوری انتخابات کا نہیں ہے بلکہ "مسئلہ انتخابات کی پیش آمدہ مصیبت اور ان کے متوقع بھیانک نتائج کا بھی ہے۔" اب انھوں نے اپنے نعرے بدل دیئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "جمہوریت کو جلا ڈالو۔ لوگوں کی آزادیاں سلب کرلو۔ عمر کا کوڑا حرکت میں لاؤ" (المنبر، فیصل آباد ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۸) یہی پاکستان کے تمام مخالف بھٹو رہنماؤں کا ذہن ہے۔ کوئی اس بات کو بھدے الفاظ میں کہہ رہا ہے اور کوئی خوبصورت الفاظ میں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی سیاست خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج کو قبول نہ کرنا ہے۔ جب پاکستان میں عوامی جمہوریت کو زندہ کیا گیا ہے تو اب یہ ممکن نہیں کہ اس کے منطقی نتائج کو ظہور میں آنے سے روکا جا سکے۔ پاکستانی رہنماؤں کی یہ سیاست بلاشبہ ان کے لئے نہایت مہنگی پڑے گی۔ "نظام مصطفیٰ" اور "نظریہ پاکستان" جیسے الفاظ بول کر اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس قسم کی غلطی بار بار کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ "سیاسی حرص" ہے۔ ہمارے رہنما صرف اتنے پر قانع ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں جو حقیقی حالات کے اعتبار سے انھیں مل سکتا ہے۔ ان کی اس کمزوری نے انھیں غیر حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ ایسے اقدامات کرتے ہیں جن کو نبھانے کی طاقت ان میں نہیں ہوتی۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اگر وہ حرص کے بجائے قناعت کا طریقہ اختیار کریں تو وہ زیادہ بڑی اور حقیقی کامیابی حاصل کریں اور قوم کو بھی نئے نئے مسائل سے دوچار کرنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں۔ (۲۳ اکتوبر ۱۹۷۸)

سیاست کے ساتھ دینی خدمت کا کام نہیں کیا جاسکتا

شمالی نائجیریا کی ۵۰ ملین آبادی میں آدھے سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ شمالی نائجیریا کے سلطان بیوا نے ریاست کے علما کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کو تحفے دئے۔ آنے والوں میں ایک بزرگ نے تحفہ قبول نہیں کیا۔ یہ عثمان دان فودیو (۱۸۱۷ – ۱۷۵۴) تھے۔ انھوں نے کہا: میں آپ کا تحفہ اس وقت لوں گا جب کہ آپ مجھ کو تبلیغ اسلام کا پروانہ عطا فرمائیں — سلطان نے فوراً ان کے مطالبہ کو مان لیا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا۔ ان کی کوششوں سے نائجیریا کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔

تاہم یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد سلطان کے سامنے سیاسی مطالبات رکھنے شروع کئے۔ "تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرو، ٹیکس کی شرح گھٹاؤ، وغیرہ"۔ اس قسم کے مطالبات نے حکمرانوں کو خفا کر دیا۔ سلطان بیوا کسی طرح ان کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا سلطان نفتا تخت پر بیٹھا۔ اس نے نہ صرف عثمان دان فودیو کے سیاسی مطالبات کو رد کیا بلکہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی پابندی لگا دی۔ اب عثمان دان فودیو اور ان کے ساتھی سلطان کے سیاسی مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ ۱۸۰۹ میں اس باہمی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جو عثمان دان فودیو کی موت (۱۸۱۷) تک ناکام طور پر جاری رہا۔ احمد و بلو انھیں عثمان دان فودیو کے لڑکے تھے جن کو اپنے باپ سے ایک طرف تبلیغی جذبہ کی وراثت ملی تھی اور اسی کے ساتھ سیاسی جہاد کی بھی۔ عجیب بات ہے کہ احمد و بلو نے اپنے والد کے انجام سے کوئی سبق نہیں لیا اور اسی تجربہ کو پھر دہرایا جو ان کے پیش رو کے زمانہ میں ناکام ہو چکا تھا۔

"میری کوششوں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۶۳ سے لے کر مارچ ۱۹۶۵ تک تقریباً دو لاکھ مشرکوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں"۔

یہ نائجیریا کے سابق وزیر اعظم الحاج احمد و بلو (۱۹۶۶ – ۱۹۰۱) کے الفاظ ہیں جو انھوں نے ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کی موتمر اسلامی (قاہرہ) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ افریقہ کی لگ بھگ ۲۲ کروڑ آبادی میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

اگر مسلم ملکوں کی مدد شامل حال ہو تو افریقہ کے مشرک قبائل میں تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت خود میری وہ کامیابیاں ہیں جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا"

احمد و بلو کو اسلام کی خدمت کا یہ جذبہ اپنے دادا عثمان ڈان فوڈیو سے ملا تھا۔ ۱۹ویں صدی میں جب پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے افریقہ کے علاقوں میں گھسنا شروع کیا تو افریقہ میں اس کے رد عمل کے تحت بہت سے مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں میں سے ایک عثمان ڈان فوڈیو بھی تھے۔ انھوں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی اصلاح اور استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کی زبردست تحریک چلائی۔ دریائے نائجیریا کے کنارے کنارے دور تک انھوں نے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ۱۸۳۲ میں ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے

یہ مہم جاری رکھی۔ نائجیریا کی راجدھانی لاگوس سے لے کر شمال میں لکوٹو شہر تک مقابلے جاری تھے۔ تاہم آخری فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۹۷ میں سلطان محمد طاہر اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر نائجیریا پر قبضہ کرلیا۔

احمدو بلو انھیں رنایات کے درمیان موجودہ صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سوکوتو کے امیر قبیلہ تھے۔ ابھی وہ دس سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ماں ایک دیندار خاتون تھیں۔ قدیم رواج کے مطابق پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۲۱ سال کی عمر تک دینی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ ۱۹۲۶ میں مغربی تعلیم کے لئے کاسینا کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی زبان اور ریاضیات کی تعلیم مکمل کی۔ خاندانی وراثت کے تحت ان کو سکوتو کا امیر بنایا گیا۔ ۱۹۳۴ میں سلطان حسن نے ان کو شہر رباح کا گورنر مقرر کیا۔ ۱۹۳۸ میں جب سلطان حسن کا انتقال ہوا تو نئے سلطان ابوبکر نے احمدو بلو کو سوکوتو کے "سار دونا" کے منصب پر سرفراز کیا۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور آزادی کے مسائل پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کی۔

۱۹۶۳ کی مردم شماری کے مطابق نائجیریا میں ۳۶ ملین مسلمان ہیں، عیسائی ۱۹ ملین اور دوسرے قبائل ۱۰ ملین ہیں۔ شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور جنوبی نائجیریا میں زیادہ تر عیسائی۔ احمدو بلو شمالی نائجیریا کے لیڈر تھے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۰ میں نائجیریا آزاد ہوا تو وہاں ایک فیڈرل گورنمنٹ بنی۔ اس حکومت کے فیڈرل پرائم منسٹر سر ابوبکر تفاوا بلیوا (۱۹۶۶-۱۹۱۲) تھے۔ احمدو بلو شمالی نائجیریا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ ایک مخلوط حکومت تھی جس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور اور مسلمان اور عیسائی دونوں شریک تھے۔ احمدو بلو نے مسلمانوں کی اصلاح و تعمیر اور عیسائیوں میں اسلام کی اشاعت کا کام پوری توجہ سے شروع کیا۔ اس کے نتائج بھی نکلنے شروع ہوئے۔ مگر انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ کو ۲۵ فوجی افسروں نے مل کر بغاوت کردی۔ اس بغاوت میں ابوبکر تفاوا بلیوا احمدو بلو اور بہت سے مسلمان اور عیسائی مارے گئے۔ اس کے بعد نائجیریا میں فوجی حکومت قائم ہوگئی جس کے سربراہ جنرل ارونسی تھے۔ مگر انھیں بھی صرف چھ ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۶۶ کو دوسری فوجی بغاوت ہوئی اور وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔

نائجیریا میں دو مسئلے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد ستر فی صد ہے۔ مگر تعلیم، اقتصادیات اور تنظیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے عملاً اکثر شعبوں پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بلند کیا جائے تاکہ وہ ملک میں اپنا جائز مقام پاسکیں۔ دوسرا کام یہاں کے عیسائیوں اور خاص طور پر ۱۰ ملین مشرک قبائل میں اسلام کی اشاعت ہے۔ یہ دونوں کام احمدو بلو نے شروع کر دیئے تھے۔ مگر ان کی شہادت سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ کہ تعمیر و تبلیغ کا کام سیاست کو لے کر نہیں کیا جاسکتا۔ احمدو بلو اگر سیاست سے الگ ہو کر یہ کام کر رہے ہوتے تو وہ ۲۰-۲۵ برس میں نائجیریا کی تاریخ بدل دیتے۔ مگر سیاست کے خارزار نے انھیں بھی ختم کر دیا اور ان کے ملی اور اسلامی کام کو بھی □

جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں

ملک عبدالشکور بی اے (پیدائش ۱۹۴۶) بُدھل (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ وہ سگرٹ کے عادی تھے اور روزانہ تین پیکٹ پی جاتے تھے۔ "سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے" "سگرٹ پینا اپنے کمائے ہوئے پیسہ کو آگ لگانا ہے" اس قسم کی کوئی بھی دلیل ان کو سگرٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں کرسکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی اصرار کرکے پلاتے۔ چائے پینے کے بعد وہ سگرٹ کا کش لینے کو اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اپنے دوستوں سے کہتے "جو آدمی چائے پی کر سگرٹ نہ پیئے اس کو چائے پینے کا حق نہیں"

مگر ایک چھوٹے سے واقعہ نے ان کی محبوب سگرٹ ان سے چھڑا دی۔ سگرٹ کے ٹکڑے جو وہ پینے کے بعد پھینکتے ان کو ان کا تین سالہ بچہ فاروق قیصر اٹھالیتا اور منھ میں لگا کر پیتا۔ ملک عبدالشکور صاحب اس کو منع کرتے مگر وہ نہ مانتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بچہ کی ماں نے سختی سے بچہ کو منع کیا تو بچہ نے کہا: "ابا بھی تو پیتے ہیں"۔ ملک عبدالشکور صاحب نے بچہ کی زبان سے یہ سنا تو ان کو سخت جھٹکا لگا۔ اگرچہ وہ دوستوں کے سامنے اپنی سگرٹ نوشی پر قصیدہ پڑھتے تھے مگر ان کا دل خوب جانتا تھا کہ سگرٹ پینا ایک بری عادت ہے جس کا انجام نہ صرف صحت اور پیسہ کی بربادی ہے بلکہ وہ اخلاق کو بھی بگاڑنے والا ہے۔ جب کوئی شخص ان سے سگرٹ چھوڑنے کو کہتا تو وہ اس کے خلاف لفظی دلائل کا انبار لگا دیتے۔ مگر ان دلائل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ اپنے ایک "نشہ" کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ اپنی غلطی کو مان لیں۔ اس لئے وہ لفظی تاویلات کے سہارے اپنے کو حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ سگرٹ کے خلاف کسی دلیل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

مگر جب سگرٹ کا سوال بچہ کی زندگی کا سوال بن گیا تو اچانک وہ سنجیدہ ہوگئے۔ ان کے ذہن سے وہ تمام پردے ہٹ گئے جنھوں نے ایک سادہ سی حقیقت کو سمجھنا ان کے لئے ناممکن بنا دیا تھا۔ جو شخص مضبوط دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوتا تھا وہ ایک بچہ کے کمزور الفاظ کے آگے بالکل ڈھ گیا۔ "اگر میں خود سگرٹ پیتا رہوں تو میں اپنے بچہ کو سگرٹ پینے سے باز نہیں رکھ سکتا" انھوں نے سوچا۔ بچہ کا یہ کہنا کہ "ابا بھی تو پیتے ہیں" ان کے لئے ایک ایسا ہتھوڑا بن گیا جس کی ضرب کو برداشت کرنے کی طاقت ان کے اندر نہ تھی۔ بچہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ان کو سخت جھٹکا لگا۔ انھوں نے ایک لمحہ کے اندر وہ فیصلہ کرلیا جس کے لئے ان کے دوستوں کی مہینوں اور سالوں کی کوشش بھی ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ انھوں نے طے کرلیا کہ وہ سگرٹ پینا بالکل چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے نہ صرف اگلے دن سگرٹ نہیں پی بلکہ مستقل طور پر سگرٹ نوشی ترک کردی۔

باپ کو سگرٹ سے محبت تھی۔ مگر بیٹے سے اس سے زیادہ محبت تھی۔ اس نے بیٹے کی خاطر سگرٹ کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہر آدمی کو اپنے مفادات اور مصلحے سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ خدا کی محبت اتنی بڑھ جائے کہ اس کی خاطر آدمی دنیا کے مفادات اور مصالح کو قربان کردے۔ (۲۰ ستمبر ۱۹۷۹)

اسی سے تعمیرِ دنیا بھی

ایک مرتبہ مجھے مسلم نوجوانوں کے ایک اجتماع میں بلایا گیا۔ میں نے وہاں آخرت کے موضوع پر کچھ باتیں عرض کیں۔ میں نے کہا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور آخرت کی فکر رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ میں اپنی بات پوری کرکے چپ ہوا تو ایک نوجوان نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے، اب اصل بات شروع کیجئے" ان کو کسی نے بتایا تھا کہ میں "تعمیر ملت" کے موضوع پر کچھ باتیں پیش کروں گا۔ "آخرت" کا وعظ سن کر انھیں محسوس ہوا کہ میں نے اصل بات نہیں کہی، میں نے مسلمانوں کے دنیوی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر آخرت کی تعمیر سے الگ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیر آخرت ہی میں تعمیر دنیا کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایک باشعور قوم بنیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اقتصادی خوش حالی حاصل ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک طاقتور قوم ہوں۔ اور یہ تینوں چیزیں آخرت کے عقیدہ سے کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ آخرت کا عقیدہ انسانی شعور کو بیدار کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ آخرت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جائے۔ جس آدمی کا شعور اتنا بیدار ہو کہ وہ نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھنے لگے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اور بھی زیادہ دیکھنے والا بن جائے گا۔ آخرت کوئی رسمی عقیدہ نہیں، وہ انسان کے شعور کو آخری حد تک جگادینے والی سب سے بڑی انقلابی تدبیر ہے۔ آخرت کے عقیدہ سے سنجیدگی اور احتیاط پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو سوچنے والا اور حقیقت پسند انسان بناتا ہے۔ ایسا آدمی ہر معاملہ کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی اصلیت اور واقعیت کے اعتبار سے جانچنے لگتا ہے نہ کہ محض ان کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔ یہ باتیں جس کے اندر پیدا ہو جائیں وہ سب سے زیادہ باشعور انسان بن جاتا ہے، وہ دنیا سے لے کر آخرت تک تمام چیزوں کو خدائی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

اس کی بہترین واقعاتی مثال صحابہ کرام کا گروہ ہے۔ انھوں نے مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی کے کام کو منظم کیا اور قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ کو نہ صرف مسلمان بنایا بلکہ ان کی زبان اور تہذیب تک کو بدل ڈالا۔ یہ سب کام وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے اگر وہ شعور کی اعلیٰ سطح پر نہ پہنچ گئے ہوتے۔

۲۔ اقتصادی ترقی ہمیشہ دو چیزوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محنت اور دیانت داری۔ اور آخرت کے عقیدہ سے یہ دونوں چیزیں کمال درجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ عمل کئے بغیر کسی کو کوئی انعام نہیں مل سکتا۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو بتاتا ہے کہ خدا کے یہاں صرف سچائی اور اخلاص کی قیمت ہے،

جھوٹ اور فریب کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس طرح جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت پسند ہو جائے وہ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر محنتی اور دیانت دار بن جاتا ہے۔ اور جس شخص کے اندر یہ دونوں خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ صفر سے آغاز کرکے بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اقتصادیات کی دنیا میں کسی کے لیے سب سے بڑا سرمایہ محنت اور دیانت داری ہے اور یہ دونوں چیزیں آخرت کے عقیدہ کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ جس شخص کے اندر آخرت کا احساس ہوگا اس کے اندر لازمی طور پر محنت بھی ہوگی اور دیانت داری بھی۔

اس کی ایک واضح مثال صحابہ و تابعین کا گروہ ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے۔ مادی وسائل کے اعتبار سے کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے وقت کی تجارتوں پر قبضہ کر لیا، وہ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک کی منڈیوں پر چھا گئے۔ ان کی اس اقتصادی کامیابی کا راز یہی دو چیزیں تھیں ——— محنت اور دیانت داری۔

۳۔ کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ اتحاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کا دوسرا نام طاقت ہے اور اختلاف کا دوسرا نام کمزوری۔ کسی گروہ کے افراد میں جب اتحاد ٹوٹتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہوتی ہے اور وہ افراد کی انانیت ہے۔ اگر ہر فرد میں تواضع آجائے، ہر آدمی اپنی "انا" کو ختم کر چکا ہو تو وہاں اختلاف کا سرے سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور آخرت کا عقیدہ سب سے زیادہ یہی چیز پیدا کرتا ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کی ہیبت اور آخرت کا فکر بیٹھ جائے اس کے اندر سے گھمنڈ اور بڑائی کے تمام احساسات نکل جاتے ہیں۔ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو ایک بے "میں" والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہی کیفیت اتحاد کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ جس قوم کے افراد سے گھمنڈ اور انانیت نکل جائے ان کے اندر سے گویا اختلاف کی جڑ ختم ہو گئی۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ متحد قوم بن جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں اتحاد سے بڑی کوئی دوسری طاقت نہیں

اس کی واقعاتی مثال اسلام کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جو لوگ تیار ہوئے وہ بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے تھے۔ چنانچہ ان ابتدائی مسلمانوں میں بے پناہ اتحاد پایا جاتا تھا۔ اسی اتحاد کی طاقت سے انھوں نے اپنے سے زیادہ طاقت ور اور اپنے سے زیادہ سامان والے دشمنوں کو مغلوب کر لیا۔ مگر بعد کے دور میں جو لوگ اسلام کی صفوں میں شامل ہوئے ان میں آخرت کا عقیدہ اتنا گہرا اور اتنا زندہ نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ اس کی بات مانی جائے، اس کی بڑائی تسلیم کی جائے، اس کے نتیجہ میں ایسا اختلاف پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ لوگ جو اب تک کفر و شرک کا زور توڑنے میں لگے ہوئے تھے وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے میں لگ گئے۔

موت کے عقیدہ نے زندگی دے دی

ایک نوجوان نے عربی مدرسہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اسی دوران گھر سے ایک خبر آئی جس نے ان کے حوصلے ختم کر دیے۔ خبر یہ تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ہے ان کے گھر پر معمولی کھیتی باڑی تھی۔ اسی میں محنت کرکے ان کے والد صاحب گھر کا کام چلاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد گھر پر صرف ان کی بیوی تھیں اور چند چھوٹے بچے۔ اب مذکورہ نوجوان ہی گھر کے بڑے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہوا۔ والد صاحب کی وفات کا مطلب ان کے لئے صرف ایک تھا۔ یہ کہ وہ مزید تعلیم کا ارادہ ترک کرکے اپنے گھر چلے جائیں اور اپنے والد صاحب کی طرح کھیتی باڑی کے کام میں لگ کر گھر کا انتظام سنبھالیں۔

مدرسہ میں ایک بزرگ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اس کے بعد وہ ان سے ملے اور کہا "حضرت اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اور آپ سے آخری ملاقات کے لئے آیا ہوں" بزرگ نے کہا: آخر کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور میں ہی اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ اس لئے اب مجھ ہی کو گھر کا انتظام سنبھالنا ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاتھوں میں "قلم" کے بجائے "ہل" ہو۔ بظاہر اب میرے لئے مزید تعلیم کا کوئی سوال نہیں۔ بزرگ یہ سن کر خاموش ہوگئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے: "کیا موت آپ کے لئے نہیں ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ گھر پہنچ کر آپ کا انتقال نہیں ہوجائے گا۔ پھر اگر آپ کا بھی انتقال ہوگیا تو" اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ کسی گھر کا سنبھالنے والا کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا سرپرست اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے کسی کے جینے مرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اپنے تعلیمی منصوبہ کو جاری رکھئے اور گھر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ "آپ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ میرا بھی انتقال ہوگیا ہے۔"

یہ بات نوجوان کے دل کو لگ گئی۔ انھوں نے گھر کا خیال چھوڑ دیا اور اس کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کرکے اپنی تعلیمی جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے مدینہ کے جامعہ اسلامیہ میں درخواست بھیجی اور اس کے لئے ضروری کوششیں کرنے لگے۔ کوشش کامیاب رہی اور ان کا داخلہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں ہوگیا۔ انھوں نے مدینہ کا سفر کرکے جامعہ اسلامیہ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد وہ سعودی عرب کے دارالافتاء کے تحت افریقہ کے ایک ملک میں مبلغ اور استاد کی حیثیت سے بھیج دیے گئے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۸۰ کو ایک ملاقات میں انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ افریقہ میں رہتے ہوئے اُن کو دس سال ہوچکے ہیں۔ اور ان کی موجودہ زندگی سے وہ اور ان کے گھر والے دونوں مطمئن ہیں۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہیں اور یہ کامیابی ان کو اس مختصر سے جملہ سے ہوئی کہ ــــــــــ سمجھ لیجئے کہ آپ کا بھی انتقال ہوگیا ہے

موت کا عقیدہ بظاہر منفی عقیدہ ہے۔ مگر وہ اپنے اندر زبردست مثبت اثرات رکھتا ہے۔ جس کو موت کا یقین ہو، زندگی کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ جو اپنے کو مرتا ہوا دیکھ لے وہ اپنی زندگی میں زیادہ باعمل ہوجاتا ہے۔

قناعت

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰-۱۸۶۳) ایک مخلص عالم تھے۔ ابتداءً وہ علی گڑھ اور حیدر آباد کی یونیورسٹیوں میں استاد رہے۔ آخر عمر میں وہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) میں مقیم ہو گئے اور قرآن اور تعلیم دین کی خدمت کرتے ہوئے عمر گزار دی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے ان کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا اس کا ایک ٹکڑا یہ تھا:

سادہ کھاتے، سادہ پہنتے، دنیا سے بہ قدر ضرورت لیتے کھانا کھا رہے ہیں، دسترخوان پر صرف دال اور روٹی ہے دال میں نمک کم ہے بلا کسی ناخوشی کے اوپر سے نمک ملایا اور چہرہ تک سے ناگواری نہ ظاہر ہونے دی۔ دوسرے دن پھر وہی کھانا آج نمک بہت زائد ہو گیا ہے اسی انداز سے اٹھے اور آج پانی ملا کر پھر اس ناخوش گوار کو خوش گوار بنا لیا شریک طالب علم کچھ جھنجلائے، کچھ دنگ رہ گئے منھ سب نے بنایا فرمایا بھائی بات کچھ نہیں ایک چٹنی تیار رکھو بغیر پیسہ کوڑی کے خرچ سے تیار ہو جاتی ہے۔ جس کھانے میں ملا لوگے۔ مزہ دار ہو جائے گا۔ چٹنی کا نام ہے قناعت!

قناعت محض ایک درویشانہ عادت نہیں، وہ زندگی کی ایک زبردست حقیقت ہے۔ قناعت دراصل اس پختہ مزاجی کا نام ہے کہ آدمی ان حالات کے ساتھ موافقت کر کے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ موجودہ دنیا میں اس مزاج کی ضرورت ایک عام آدمی کو بھی ہوتی ہے اور ایک بادشاہ کو بھی۔ عام آدمی کو اگر یہ نعمت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے بے مزہ سالن کو ہنسی خوشی کھا کر اپنے کام میں لگ جائے گا، نہ کہ وہ اس پر غصہ ہو کر اپنے وقت اور اپنی طاقت کو خواہ مخواہ برباد کرے۔ اسی طرح اگر "بادشاہ"، کو یہ نعمت مل جائے تو وہ عوام کے جمہوری رجحانات سے موافقت کر کے اپنی بادشاہت کو دیر تک باقی رکھ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ عوامی تقاضوں سے لڑنے لگے اور بالآخر اپنے تخت و تاج کو کھو دے۔ قناعت اکثر نفسیاتی امراض کا علاج ہے۔

امریکہ کے ایک شخص نے اندیشے (Fears) کے بارے میں معلومات جمع کیں بہت سے لوگوں سے مل کر اس نے پوچھا کہ آپ کو کس قسم کے اندیشے لاحق ہوئے اور ان کا انجام کیا رہا۔ تحقیق کے بعد اس نے پایا کہ بیشتر اندیشے ایسے تھے جو صرف اندیشے ثابت ہوئے، وہ کبھی واقعہ نہیں بنے۔ حالاں کہ ان لوگوں نے اپنے ان امکانی اندیشوں کے غم میں اپنی صحتیں برباد کر لیں اور دوسرے بہت سے نقصانات کر ڈالے۔

"اندیشہ" ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر آدمی اپنے حالات کے اعتبار سے طرح طرح کے اندیشوں میں

مبتلا رہتا ہے جو اس کے سکون کو غارت کرتے رہتے ہیں۔ آدمی کے اندر اگر قناعت کا مزاج آجائے تو اس کو خود بخود اس قسم کے ہمیشگی اندیشیوں سے نجات مل جائے گی۔ جب آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کو جو مل جائے اسی پر وہ راضی رہے تو اندیشیوں کی بنیاد پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ قناعت کا ہر شخص کو یہ پیغام ہے —— دنیوی نقصان کا غم نہ کرو۔ اگر وہ ہو چکا ہے تو وہ ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ اور اگر وہ صرف ایک اندیشہ ہے تو بہت سے اندیشے ایسے ہیں کہ آدمی ان کے لئے اپنے آپ کو پریشان کرتا ہے حالاں کہ وہ کبھی واقع نہیں ہوتے۔

قناعت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو دنیا کے مسائل میں غیر ضروری طور پر الجھنے سے بچاتی ہے اور اس طرح اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے کاموں میں لگا سکے۔ آخرت کے مسافر کے لئے قناعت اتنی ہی ضروری ہے جتنا دنیا کے مسافر کے لئے حرص۔ جس آدمی کے اندر حرص نہ ہو وہ متاع دنیا کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جس کے اندر قناعت نہ ہو وہ متاع آخرت کو پانے سے محروم رہے گا۔

قناعت کی اسی اہمیت کی بنا پر دین میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو جو کچھ دیا اس پر اس نے قناعت کیا (قد افلح من اسلم ورُزِقَ کفافاً وقنّعہ اللہ بما آتاہ، اخرجہ مسلم والترمذی)

انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں اور دنیا کی چیزیں محدود۔ آدمی دنیا کی چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ حاصل کرلے وہ اس کی تسکین کے لئے ہمیشہ ناکافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ پانے والا بھی اس دنیا میں اتنا ہی پریشان رہتا ہے جتنا کم پانے والا۔ اس لئے اس دنیا میں اگر کوئی چیز آدمی کی تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ قناعت ہے۔ کیونکہ قناعت تو ہر حد پر مطمئن ہو جاتی ہے جب کہ حرص کسی حد پر مطمئن نہیں ہوتی۔

قناعت دراصل حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں مختلف وجوہ سے ہماری مرضی کے خلاف واقعات پیش آتے ہیں۔ کہیں دوسرے کو زیادہ مل جاتا ہے اور ہم کو کم۔ کہیں خود اپنی حاصل شدہ چیز کو پوری طرح استعمال کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ پاتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہوتا ہے جو ہم اپنے اندازہ کے مطابق اپنے لئے چاہتے تھے۔ کہیں کوئی ناگہانی حادثہ پیش آکر ہمارے بنے بنائے معاملہ کو بگاڑ دیتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ نقصان کے بعد نقصان کے غم سے اپنے کو بچایا جائے۔ اور قناعت آدمی کی زندگی میں یہی اہم خدمت انجام دیتی ہے۔ قناعت آدمی کو بے صبری سے بچاتی ہے۔ وہ تلخ یادوں کو بھلاتی ہے۔ وہ زندگی کی ناخوش گواریوں کو خوش گوار بنا دیتی ہے۔

زندہ رہنمائی

اسلام انسان کے لئے خدا کی ابدی رہنمائی ہے۔ اسلام کی صورت میں خدا نے وہ تمام بنیادی اصول بتادئے ہیں جو انسان کو موجودہ دنیا کی زندگی میں سچائی اور انصاف پر قائم رکھنے والے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مزید انتظام کیا گیا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے ذریعہ ان اصولوں کا مکمل عملی نمونہ بھی ایک شان دار تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تاریخ ہر موڑ پر ایک زندہ رہنما کی طرح کھڑی ہوئی ہر آدمی کو بتارہی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایک غریب مسلمان دن بھر کی محنت کے بعد شام کو اپنے گھر واپس آیا۔ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کھانا لائی تو وہ صرف ارہر کی دال اور جو کی روٹی تھی۔ مسلمان اس کو دیکھ کر جھنجلا اٹھا کہ دن بھر کی محنت کے بعد ہم کو یہی کھانا ملا ہے اور کتنے لوگ بغیر محنت کے عمدہ عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر معاً بعد اس کو خیال آیا کہ خدا کے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانا تو اس سے بھی زیادہ معمولی ہوتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ انسانوں کے درمیان معاشی اونچ نیچ اس کو اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر اہم نظر آنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنا کھانا کھا لیا اور رات کی نماز پڑھ کر سو گیا۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چلتے چلتے سیدھے راستہ کے اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔ وہ اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ اس کی نظر اصل نشانہ سے ہٹ کر وقتی چیزوں میں الجھ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تاریخ آدمی کے لئے ایک معیار کا کام دیتی ہے۔ وہ زندہ نمونوں کے ذریعہ آدمی کی تصحیح کرتی رہتی ہے۔ ایک "عام" آدمی بھی اس میں اپنا سبق پا سکتا ہے اور ایک "خاص" آدمی بھی۔

۳ مئی ۱۹۶۹ کو سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک وفات ہوئی تو مسٹر وی وی گری نائب صدر تھے۔ اس کے بعد دستور ہند کے مطابق وہ قائم مقام صدر ہو گئے۔ تاہم جلد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے عہدہ سے استعفا دے دیں اور صدارتی الکشن کا مقابلہ کریں۔ ان کے استعفا کے بعد جو قانونی صورت پیدا ہوئی اس کے مطابق جناب محمد ہدایت اللہ (پیدائش ۱۹۰۵) ہندستان کے ایکٹنگ صدر مقرر ہوئے جو اس وقت ہندستانی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کی صدارت ۳۵ دن (۲۰ جولائی تا ۲۴ اگست ۱۹۶۹) جاری رہی۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کے صدر کی حیثیت سے جناب محمد ہدایت صاحب کو جو تجربات ہوئے ان کو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (My Own Boswell) میں درج کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۶۹ کو راشٹر پتی بھون کے مغل گارڈن میں یوم آزادی کی تقریب تھی۔ محمد ہدایت اللہ صاحب بحیثیت صدر روایتی جلوس کے ساتھ راشٹر پتی بھون سے نکلے۔ اعلیٰ فوجی افسران، اے ڈی سی کا عملہ، صدارتی باڈی گارڈ سب جلو میں چل رہے تھے۔ ان کا پرشوکت یونیفارم اور منظم انداز میں حرکت کرنا راشٹر پتی بھون کے شاہانہ ماحول میں عجیب شان دار منظر پیش کر رہا تھا۔ محمد ہدایت اللہ صاحب کہتے ہیں کہ اپنے گرد یہ شان و شوکت دیکھ کر مجھے کسی قدر فخر کا احساس ہونے لگا:

I felt a little pride (P.245)

مگر اگلے ہی لمحہ ان کو فاروق اعظم رضؓ کا وہ واقعہ یاد آگیا جو معمولی فرق کے ساتھ تاریخ کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔

شام و فلسطین کی جنگ کے آخری مرحلہ میں عیسائیوں نے پیش کش کی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ خلیفہ اسلام خود سفر کر کے یہاں آئیں۔ خلیفہ دوم ایک اونٹ اور ایک غلام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دمشق کے قریب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابو عبیدہ بن الجراح اور خالد بن ولید اور اسلامی فوج کے دوسرے سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ جابیہ میں کئی دن تک قیام رہا اور عیسائیوں سے گفتگو کے بعد یہیں معاہدہ لکھا گیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمر فاروق رضؓ بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے جسم پر پرانے نہایت معمولی کپڑے تھے۔ آپ کی سواری ایک دبلی اونٹنی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے آپ کی خدمت میں نیا کپڑا اور ترکی نسل کا عمدہ گھوڑا پیش کیا اور اصرار کیا کہ آپ اونٹنی کو چھوڑ دیں اور اسی گھوڑے پر سفر کر کے جائیں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ عجیب شان کے ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد عمر فاروق رضؓ گھوڑے سے اتر گئے اور کہا کہ میری اونٹنی لاؤ، میں اسی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا: میرے دل میں بڑائی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی بڑائی کا جذبہ ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

محمد ہدایت اللہ صاحب کو جب یہ واقعہ یاد آیا تو ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ اس وقت ان کا جو حال ہوا اس کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ——— مجھے اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت اس احساس کو اپنے اندر سے نکال دیا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا:

I felt ashamed of myself and put aside the feeling
at once and begun thinking of other things. (246)

اسلامی تاریخ ہر آدمی کے لئے ایک زندہ نمونہ ہے۔ وہ ہر موقع پر آدمی کو متوازن بناتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اندر کسی "بادشاہ" کے لئے بھی اتنی ہی رہنمائی ہے جتنی ایک "معمولی" انسان کے لئے۔

کہاں سے کہاں تک

لندن کے برٹش میوزیم میں جو نادر چیزیں محفوظ ہیں ان میں سے ایک سونے کا وہ سکہ ہے جو قدیم انگلینڈ کے علاقہ مرشیا (Mercia) کے بادشاہ اوفا ریکس (Offa Rex) کے زمانہ میں ڈھالا گیا تھا۔ اس بادشاہ کا زمانہ ۷۹۶ — ۷۵۷ ہے۔ اس سکہ کی شکل بالکل مسلمانوں کے دینار جیسی ہے۔ شاہ اوفا ریکس کے نام کے گرد اس پر ایک عربی فقرہ درج ہے جس میں سکہ ڈھالنے کی تاریخ (۷۷۴) اور کلمہ توحید دونوں صاف پڑھے جاتے ہیں۔ سکہ کے دوسری طرف بغداد کے دو سکہ گروں کے نام عربی رسم خط میں لکھے ہوئے ہیں۔

Charles Oman,
History of England before the Norman Conquest (1910)

برٹش میوزیم میں اس قسم کی ایک اور مثال موجود ہے۔ یہ نویں صدی کی ایک آئرش صلیب ہے جس کے مرکز میں شیشہ کے مسالہ پر کوفی حروف میں "بسم اللہ" لکھا ہوا ہے۔

Legacy of Islam, Compiled by Sir Thomas Arnold,
Oxford University Press London

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعت و حرفت میں اتنا آگے بڑھے ہوئے تھے کہ دوسری قومیں اندھی تقلید کی حد تک ان کی پیروی کرتی تھیں (جیسا کہ موجودہ زمانہ میں برعکس صورت میں نظر آتا ہے) اس زمانہ میں یورپ کے حکمراں اپنے سکے ڈھالنے کے لئے بغداد کے کاریگر بلاتے تھے اور اپنے سکہ پر کلمہ توحید کو مونوگرام کے طور پر لکھتے تھے، نیز عربی زبان اور اسلامی تہذیب کا اس قدر غلبہ تھا کہ اس کی چھاپ نہ صرف سکہ جیسی چیزوں پر بلکہ خالص مذہبی نشانات پر بھی دکھائی دیتی تھی۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کے مقابلہ میں مغرب کو جو صنعتی اور سائنسی فوقیت حاصل ہے وہی برعکس شکل میں کسی وقت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ مسلمانوں نے بدویت اور شتربانی کے مقام سے آغاز کر کے ہجرت کے صرف دو سو برس بعد یہ حیثیت حاصل کر لی تھی کہ وہ دنیا کے امام بن گئے۔ ایران کے اصطخر، مصر کے رمیس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد تھا۔

دور اول میں اسلام کو عالمی سطح پر پھیلانے میں مسلمانوں کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اس کا سبب احتجاج اور مطالبہ کی سیاست نہ تھی، بلکہ دنیا کے لئے ان کا رحمت اور برکت بن جانا تھا۔

خدا کی اس دنیا میں جو اصول کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ جو اپنے کو نفع بخش ثابت کرے اس کو قیام اور استحکام حاصل ہو (و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض) مسلمان نفع بخشی کے اس معیار پر پورے اترے، یہی وجہ ہے کہ ان کو دنیا کی امامت حاصل ہوئی، وہ قوموں کے لئے مرجع تقلید بن گئے۔

"صحرائے عرب کے ایک کنارے مکہ کے گم نام مقام پر اسلام نے جنم لیا" ایک مستشرق لکھتا ہے "اور وہاں سے نکل کر اس نے قلیل عرصہ میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کو حیرت انگیز طور پر فتح کر لیا۔ اور پھر ایک طرف شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین اور دوسری طرف ایران کے راستے سے چین کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ مشرقی یورپ میں اسلام کی پیش قدمی کی آخری حد بوڈاپسٹ (ہنگری) تھی جہاں آج بھی دریائے ڈانوب کے کنارے "گل بابا" کا ترکی طرز کا مزار نشانی کا کام دے رہا ہے۔

اسی سیلاب کا کرشمہ تھا کہ وحشی عربوں نے ایک عالمی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جہاں ایک طرف ان کی زبان اس وقت کی معلوم دنیا کے آخری کناروں تک پھیلتی چلی گئی، وہاں دوسری طرف انھوں نے نہ صرف اس زمانے کے انسانی علوم کو حاصل کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا بلکہ انھیں ترقی بھی دی۔ ساتویں صدی عیسوی میں دمشق کی اموی خلافت نے عربوں کی عالمی سلطنت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد رکھی اور آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عباسی خلافت جس کا پایۂ تخت بغداد منتقل ہو چکا تھا، تاریخ کی عظیم ترین تہذیب کو وجود میں لانے کا باعث بنی۔

اس تہذیب کے علم برداروں کا مقصد اشاعت اسلام تھا مگر انھوں نے ماحول کی ہر جائز چیز کو لیا اور اس سے اسلام کو تقویت پہنچائی، یونانی اور رومی تہذیب میں خاص چیز اس کے طبیعی علوم تھے جن سے عرب اور غیر عرب مسلمانوں کو نئی نئی تحقیقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ طبیعیات، کیمیا، الجبرا اور سائنس میں ایسے شان دار نتائج تک پہنچے کہ آج تک ان علوم کی مختلف شاخوں میں سینکڑوں فنی اصطلاحات اپنے عربی الاصل ہونے کی یاد دلاتی ہیں۔ شروع میں وہ فلسفہ میں یونانیوں کے گویا شاگرد تھے مگر آخر میں وہ خود استاد بن گئے۔

فلکیات کے مطالعہ کے لئے مسلمانوں نے جگہ جگہ رصد گاہیں قائم کی تھیں اس سلسلہ میں اشبیلیہ کی رصد گاہ کے بارے میں ڈریپر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں (Moors) کے اسپین سے ملک بدر ہو جانے کے بعد یہ رصد گاہ کلیسا کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دی گئی کیونکہ اسپینی باشندے اس کے استعمال کا کوئی اور طریقہ جانتے ہی نہ تھے۔ جغرافیہ میں نویں صدی کے نصف اول میں خوارزمی اور اس کے شرکار کار نے معلوم کیا تھا کہ زمین کا محیط بیس ہزار میل اور اس کا نصف قطر ۶۵۰۰ میل ہے۔ یہ

صحت حیرت انگیز ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ سرگرمیاں ایسے زمانے میں جاری تھیں جب کہ سارا کا سارا یورپ زمین کے چپٹی ہونے کا قائل تھا۔

Edward Mc Nall Burns, Western Civilization, P. 264

جہاں تک تہذیب اور کلچر کا تعلق ہے، تیرھویں صدی کے وسط تک اسلام دنیا کے تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے آگے رہا ہے۔ اسپین میں عربوں نے پختہ بازار بنوائے اور ان میں رات کو روشنی کا انتظام کیا۔ ان میں جو دولت مند تھے وہ اپنے مکانوں کو پانی کے نلوں اور فواروں کی مدد سے ٹھنڈا رکھا کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحی یورپ کے شہروں میں لوگوں کو کیچڑ اور اندھیرے میں دھکے کھانے پڑتے تھے۔ مسلمانوں کے یہاں شفاخانے تھے، کتب خانے تھے، ایسی درس گاہیں تھیں جہاں دینیات سے لے کر طب تک ہر چیز پڑھائی جاتی تھی۔ دمشق، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ میں لکڑی، لوہے، چاندی اور سوت کا ایسا اعلیٰ درجہ کا سامان بنتا تھا جو اسکینڈے نیویا تک کی دور دراز ریاستوں میں جاکر مہنگے داموں بکتا تھا۔ اس زمانہ میں یورپ کا ٹکنکل علم اور اس کی سائنس عرب مسلمانوں کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھی۔

علوم کی تمام شاخوں میں مسلمان اتنے آگے تھے کہ یورپ کے لئے ان کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ "راجر بیکن نے عربی سائنس سیکھی تھی۔ نہ تو راجر بیکن کو اور نہ اس کے بعد اس کے کسی ہم نام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ تجربی طریق کی ترویج کا سہرا اس کے سر باندھا جائے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ مسیحی یورپ میں مسلم سائنس اور طریقہ کا مقلد اور مبلغ تھا۔ وہ یہ اعلان کرنے سے کبھی نہ تھکتا تھا کہ اس کے ہم عصروں کے لئے حقیقی علم تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی راستہ عربی سائنس کے سوا نہیں ہے:

Briffault, The Making of Humanity.

بارھویں صدی کے آخر تک ابن رشد کو یورپ میں اس قدر مقبولیت ہوگئی اور اس کا فلسفہ راسخ عیسائیوں کے حق میں اتنا زبردست خطرہ بن گیا کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل کو ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کی تعلیم و تدریس کو ممنوع قرار دینا پڑا۔ اگرچہ ایک صدی بعد اسی یونیورسٹی کا یہ حال ہوا کہ اس نے اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو حلف دینا شروع کر دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کی تعلیم اور تدریس کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو۔
(راشڈل، یونیورسٹیز، صفحہ ۳۶۸)

ابن رشد نے یورپ کے دماغ پر چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکمرانی کی اور اطالوی نشأۃ ثانیہ کی بنیادیں اسی نے رکھیں۔ کولٹن ابن رشد کی اثر انگیزی کا موازنہ موجودہ زمانے میں ڈارون کی اثر انگیزی سے کرتا ہے مگر اس موازنہ کے درست اترنے کے لئے ڈاروینیت کو ابھی مزید تین سو سال تک زندہ رہنا ہوگا۔

سترھویں صدی کے آخر میں اسلام کی فوجی طاقت کو دھکا لگتا ہے اور اٹھارویں صدی میں یورپ کی فوج سائنس، مسلمان اقوام کے فن جنگ پر قطعی طور پر سبقت لے جاتی ہے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک انگریزی دستہ نے ہندستان کے مسلم فرماں روا کی دس ہزار فوج کو شکست دی۔ کیونکہ مؤخرالذکر نے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں نہ تو سامان جنگ میں اور نہ فن جنگ میں ترقی کا کوئی قدم آگے بڑھایا تھا۔ مسلمانوں کی زبردست سلطنتیں یورپی فوجوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوگئیں اور ایشیا اور افریقہ، جہاں اسلام کو غلبہ حاصل تھا یورپ کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ یورپ میں فلسفہ، علم السنہ، علم آثار قدیمہ اور تاریخ تہذیب کے ذخیرے بڑھتے چلے گئے۔ ان سے بھی بڑھ کر یورپ کی ٹکنکل ایجادات کا وہ لامتناہی سلسلہ تھا جنھوں نے پوری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ یورپ نے ان ایجادات کی مدد سے اسلامی مشرق کو پہلے اقتصادی طور پر اور اس کے بعد سیاسی طور پر غلام بنالیا۔ مشینی صنعت نے جدید طرز پر منظم یورپ کی مصنوعات سے اسلامی دنیا کے بازاروں کو، جو اس وقت تک قرون وسطیٰ کی حالت میں پڑے ہوئے تھے، اس طرح بھر دیا کہ مشرق کی ہاتھ سے بنی ہوئی مصنوعات ان مشینی مصنوعات کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئیں۔

اس تمام عرصہ میں اسلامی مشرق گہری نیند سوتا رہا۔ ہنگری نژاد ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کے الفاظ میں "ابن خلدون کے بعد جس کا انتقال ۱۴۰۶ میں ہوا، اسلامی مشرق نے دنیا کے سامنے پہلے کی طرح اعلیٰ پیمانے کے تخلیقی کارنامے پیش نہیں کئے۔ اس کی صنعتیں زمانے سے پیچھے رہ گئیں۔ اس کی اقتصادی زندگی خام اجناس پیدا کرنے والی ابتدائی زرعی معیشت کی دیہی رومانی فضا میں کھوئی رہی۔ مسلمانوں کی درس گاہوں میں آج بھی وہی درسی کتابیں پڑھاتی ہیں جو ایک ہزار سال پہلے پڑھائی جاتی تھیں۔"

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں یورپی عالموں نے مشرق قدیم کے زیر زمین مدفون آثار اور اس کی ادبی یادگاروں کی تلاش شروع کی۔ وہ انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر باہر لائے اور دنیا کو ان سے متعارف کرایا۔ یہاں تک کہ آج اس کرہ زمین میں کوئی ایسا مخفی کونہ موجود نہیں ہے جس میں بسنے والے انسانوں

کی صحیح صحیح نسلی خصوصیات یورپی علماء کے ہاتھوں جمع کی ہوئی ہمیں پڑھنے کو نہ مل جائیں۔

ڈنمارک کے ماہر آثار قدیمہ نیوبر کو جب اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں یمن کے کتبات ملے تو عرب کا کوئی شیخ انھیں پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس کو ان کتبات کی نقلیں جرمنی کے شہر ریسکے میں بھیجنی پڑیں۔ جہاں سے فوراً ان کا صحیح حل بھیج دیا گیا۔ عرب کی تاریخ، عربی علم اللسان، عرب کا جغرافیہ اور عربی میں علوم دینیہ کی کتابیں یورپی علماء نے قابل اعتماد طریقہ پر چھاپیں اور بقول ڈاکٹر جرمانوس "آج بھی یورپ ہی وہ سرزمین ہے جہاں عرب، ایرانی اور ترک طلبہ یورپی استادوں کی زیر نگرانی اپنے کلچر کا خصوصی مطالعہ کرنے کے لئے آتے ہیں"۔

جہاں یورپ بغیر کسی بندش کے آزادانہ آگے بڑھتا رہا، اسلام کے حامل جمود میں مبتلا رہے۔ ایک وقت تھا کہ پادریوں اور راہبوں نے عربی ذرائع سے اپنا مسیحی علم کلام پڑھا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں موصل میں کمال الدین بن یونس اور دمشق میں عزالدین اربلی عیسائیت کے اتنے بڑے عالم تھے کہ عیسائی ان سے اپنے مذہب کی کتابیں پڑھتے تھے۔ وہ توریت اور انجیل کی اتنی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے اور اس خوبی سے ان کی شرح کرتے تھے کہ اس زمانے کے عیسائی علماء بھی ایسی تعلیم نہ دے سکتے تھے۔ اس کے بعد جب زوال آیا تو یہ عالم ہوا کہ ترکوں کے اقتدار کے زمانہ میں مصر کے ایک شخص کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے ایک عیسائی راہب کو مقرر کرنا پڑا۔ آج بھی مسلمان نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے مغربی یونیورسٹیوں میں داخلے لے رہے ہیں۔

بعد کے زمانے میں مشرق محض قدیم کتابوں کی خشک تشریحات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ عباسی دور میں کاغذسازی ایک گھریلو صنعت بن چکی تھی یا اب یہ حال ہوا کہ یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں کتابیں چھپتی رہیں اور اس کے بعد کہیں جاکر ۱۷۲۹ء میں ترکی کے شیخ الاسلام نے باقاعدہ فتوے کے ذریعے کتابوں کے چھاپہ خانہ کو عمل شیطانی کے الزام سے بری ہونے کا اعلان کیا۔ مسلمان جو کسی وقت علم طب کے امام تھے وہ چیچک کے ٹیکہ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ حتیٰ کہ علی الاعلان کہا گیا کہ چوہوں اور بیماریاں پھیلانے والے دوسرے جانوروں کو مارنا دراصل اجنبیوں کا ایک بہانہ ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے زنان خانوں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کی بے حرمتی کریں۔ انگریزی زبان کو شیطان کی زبان کہا گیا اور دو سو برس تک اس کا پڑھنا ممنوع رہا۔ اسلام کا دینیاتی نظام آج بھی ارسطو کی منطق پر مبنی ہے جس کو جدید دنیا کے علماء منطق کب کا رد کر چکے ہیں، ایک مستشرق کے الفاظ میں:

"منصور حلاج کی زندہ کھال کھینچی گئی کیونکہ اس نے اپنے اندر خدا کو پایا تھا۔ باب کو ۱۸۵۰ میں ایران میں اس لئے گولی سے مار دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو امام موعود سمجھتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے انکشاف کیا کہ مسیح اور کرشن کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہے۔ مگر یہ لوگ جو مابعد الطبیعیاتی دنیا میں اتنی بلند پروازی دکھا رہے تھے ان میں کوئی ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو انسانیت کو سائنٹفک علوم میں کوئی نیا طریقہ یا کوئی نئی دریافت دیتا"

جو قوم قدیم زمانہ میں سربلندی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچی تھی، وہ موجودہ زمانہ میں تمام قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئی۔ اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں اس نے اپنے آپ کو اور اپنی امکانیات کو استعمال ہی نہیں کیا۔

مسلمان پچھلے سو سال سے ان قوموں کے خلاف لڑائی بھڑائی میں مشغول ہیں جنھوں نے ان کے اوپر غلبہ حاصل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی ترقی کی اصل رکاوٹ دوسرے لوگ ہیں۔ اس لئے جب تک ان دوسروں کے اوپر قابو نہ پایا جائے، ترقی کی سمت میں اپنے سفر کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ذہن ہماری ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کی وجہ سے ابھی تک مسلمانوں کے درمیان ان کی تعمیر نو کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ جب آپ کا ذہن یہ ہو کہ کچھ خارجی دشمن ہیں جو آپ کے راستہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں تو ان دشمنوں کو ختم کرنے سے پہلے آپ کے اندر یہ ذہن ہی نہیں ابھرے گا کہ آپ کو اپنے راستہ پر اپنا سفر شروع کرنا چاہئے۔

امریکہ نے ۱۹۴۵ میں جاپان میں بم گرا کر اس کو تباہ کر دیا اور اس میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ جاپان کے اوپر امریکہ کا فوجی اور سیاسی قبضہ ہو گیا۔ جاپانی اگر امریکہ کو اپنے مصائب کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان کے خلاف لڑائی جاری کر دیتے تو انھیں دوبارہ اپنے مستقبل کی طرف سفر کے لئے کوئی آغاز نہ ملتا۔ وہ بس سیاست کی شمشان بھومی پر قربانیاں دیتے رہتے۔ مگر انھوں نے امریکی قبضہ کو تسلیم کر لیا۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ ان کو معلوم ہو گیا کہ اپنی تعمیر نو کا آغاز انھیں کہاں سے کرنا چاہئے۔ انھوں نے فوجی اور سیاسی میدان کو امریکہ کے حوالے کر کے دوسرے میدانوں میں یکسوئی کے ساتھ اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے بعد جو واقعہ ہوا وہ یہ کہ صرف ۲۵ سال میں جاپانیوں کو نہ صرف دوسرے دائروں میں غلبہ حاصل ہو گیا بلکہ خود اس دائرہ میں بھی جس کو ابتداءً انھوں نے امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔

خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دے دی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ کا ہے۔ ہٹلر اور گورنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کر لی تھی۔ اس کے بعد ربن ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزن برگ، فرنیک، ولہم فرک جولیس، ساکل، جوڈل، سس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کر کے ختم کر دئے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۲۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (Concentration Camp) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بوڑھے، معذور اور بیمار لوگوں کو ـــــ "جرمنی کے لئے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول کو دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو چکے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے وہ اپنے انجام کو دیکھ کر پاگل ہو گئے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت دعزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے۔ خواہ مادی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا اس قسم کے تمام خارجی سہاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

اگر خدا کی مدد کا یقین دلوں میں زندہ ہو تو آدمی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ طاقت ور دشمنوں میں گھر کر بھی عزم و ہمت کی چٹان بنا رہے گا۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی وہ اس طرح زندہ سلامت نکل آئے گا جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہ تھا۔

دوسرے کا اعتراف

مولانا اقبال احمد سہیل غیر معمولی ذہین اور طباع آدمی تھے۔ وہ اعظم گڈھ میں رہتے تھے۔ ان کے گھر پر چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک "ماسٹر صاحب" مقرر تھے۔ وہ رات دن مولانا سہیل کے گھر پر رہتے تھے۔ اور بچوں کو اردو اور انگریزی وغیرہ پڑھاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کا کھانا مولانا سہیل کے گھر سے آتا تھا۔ صبح کے ناشتہ میں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ گھر سے ان کے لئے سالن کے ساتھ باسی روٹی آئی۔ ماسٹر صاحب نے لڑکوں سے کہا کہ باسی روٹی مت لایا کرو۔ باسی روٹی کھانے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ لڑکوں نے گھر میں آکر اپنی والدہ (اہلیہ مولانا اقبال احمد سہیل) سے یہ بات کہی۔ اسی کے ساتھ لڑکوں نے یہ بھی کہا کہ ابا تو باسی روٹی بہت کھاتے ہیں مگر ان کے دماغ میں کمزوری نہیں آئی۔ اہلیہ نے جواب دیا:

تمہارے ابا کا دماغ بہت بڑا ہے۔ اس میں کچھ کمی آجائے تب بھی فرق نہیں پڑتا۔ ماسٹر صاحب کا دماغ چھوٹا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر کم ہوا تو ختم ہی ہو جائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دوسرے کے اعتراف کا ہے۔ اکثر لوگ دوسرے کی لیاقت کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ دوسرے کی اہمیت کا اقرار کرنے سے اپنی حیثیت گھٹ جائے گی۔

دوسرے کا اعتراف کرنے کے لئے اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اور کون ہے جو اپنے کو چھوٹا کرنے کی قیمت پر دوسرے کی حیثیت کا اعتراف کرے۔ صرف دو قسم کے لوگ ہیں جو اپنے کو "چھوٹا" کرنے پر راضی ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگ جو اتنے اونچے ہوں کہ کسی کی بڑائی کا اعتراف کرنے سے انھیں یہ ڈر نہ ہو کہ ان کی شخصیت میں کمی آجائے گی۔ دوسرے وہ لوگ اس کی ہمت کرتے ہیں جنھیں اللہ کی عظمت کے احساس نے پہلے ہی سے اتنا چھوٹا بنا رکھا ہو کہ اب کسی چیز سے انھیں مزید چھوٹا ہونے کا خطرہ نہ رہے۔

کرنے کا کام

یہ ۱۹۲۰ کا زمانہ ہے جب کہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہو چکی ہے اور تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر سرگرمیوں کے آسمان پر نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل دفلاسفی آف انڈین ہسٹری) دیکھا جو ماڈرن ریویو میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی خود معبود بن گئے ہیں۔ کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیح کی طرح محمدؐ کی بھی پرستش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کا عظیم الشان شاعر جو امریکہ کی سیاحت سے واپس آرہا ہے اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی نہیں معلوم جو خود اس کے اپنے گھر میں بستے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے وہ مسلمان باقی نہیں رہتا۔ ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبر انسان تھا۔ اسلام کا اصل مشن انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔ اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو ہندستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری دیکھ کر متعجب ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ ایک امریکن۔ (ذکر آزاد۔ از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹیگور اور چٹرجی جیسے لوگوں پر تعجب کیا ہے۔ حالانکہ اصل تعجب کے قابل خود مولانا آزاد اور ان کے جیسے دوسرے اکابر ہیں، جو آزادی وطن اور قومی حکومت جیسے مقاصد کے لئے زندگی بھر سرگرم رہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اصل کام اسلام کے صحیح تعارف کا ہے نہ کہ آزادی اور قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا

آج کا انسان اس مذہب کی تلاش میں ہے جس میں انسان کو خدا نہ بنایا گیا ہو۔ جس میں خدا کو خدا کی جگہ رکھا گیا ہو اور انسان کو انسان کی جگہ۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو مجاہدین اسلام میں سے کوئی بھی کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔

دنیا اگر خدا کے سچے دین سے بے خبر ہے تو سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو بے خبر ہیں۔ بلکہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اس سے باخبر تھے مگر انھوں نے بے خبروں کو خبردار نہ کیا۔

دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو محوری طاقتوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" کے مصنف کے الفاظ میں جنگ کے بعد برطانیہ کے پاس اتنا تیل بھی نہ تھا کہ وہ اپنی فتح کی خوشی میں چراغ جلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ میں فتح پانے کے باوجود وہاں یہ انقلاب آیا کہ ایک طرف اندرونی طور پر فاتح چرچل کی حکومت ختم ہوگئی اور دوسری طرف برطانیہ کو اپنے نوآبادیاتی علاقوں کو آزادی دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

یہی معاملہ فرد کے لئے بھی ہے اور یہی قوم کے لئے بھی۔ جنگ، ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہے۔ مگر ہتھیار صرف تباہی لاتے ہیں، وہ کبھی کوئی صالح نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ ہتھیار کی طاقت کا حصول ہمیشہ اپنی بربادی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ ہتھیاروں کے ذریعہ جیتنے والا بھی اتنا ہی ہارتا ہے جتنا ہارنے والا۔ کیونکہ جب لڑائی ختم ہوتی ہے تو دونوں فریق تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

مگر یہاں ایک اور ہتھیار ہے۔ اس کی طاقت زیادہ ہے اور اس کی فتح بھی یقینی۔ یہ ہے ایمان ویقین کی طاقت۔ اخلاق وانسانیت کی طاقت، اصول ونظریات کی طاقت۔ اس کی قوت بے پناہ ہے۔ اس کی مار ہمیشہ بے خطا ہوتی ہے۔ اس سے آدمی کے اندر وہ ہمت پیدا ہوتی ہے کہ بظاہر خالی ہاتھ ہو کر بھی اپنے حریف سے کامیاب مقابلہ کر سکے۔ یہ ایک ایسی تسخیری قوت ہے جو دشمن کو اپنا دوست بنا لیتی ہے، جو غیر کو اپنے اثاثہ میں شامل کر لیتی ہے۔

جنگ ومقابلہ کے طریقہ میں ہتھیار استعمال ہوتے ہیں اور ایمان اور اخلاق کے طریقہ میں صبر۔ صبر بے ہتھیار والی لڑائی کا ہتھیار ہے۔ عام طور پر ایسا ہے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ بات سامنے آتی ہے تو آدمی صرف ایک بات سوچتا ہے ـــ "یہ ہمارا مخالف ہے اس کو کچل ڈالو"۔ اور پھر ہر ایک اپنی طاقت اور حالات کے بقدر دوسرے کو کچلنے کی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔ مگر یہ انسان کے امکانات کا بہت ناقص اندازہ ہے۔ خدا نے انسان کی نفسیات میں بے حد لچک رکھی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ صبر کسی بے عملی کا نام نہیں۔ صبر کا مطلب وقتی تلخیوں کو برداشت کر کے مستقبل کے انسان کا انتظار کرنا ہے۔ ہر آدمی کے اندر ہمیشہ ایک اور انسان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور صابرانہ طریقہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس آنے والے وقت کو آنے کا موقع دیا جائے جب کہ "آج" کے انسان کے اندر چھپا ہوا "کل" کا انسان برآمد ہو جائے۔

غریبی کا سبب

ٹائمس آف انڈیا نے سوسائٹی کے نام سے ایک ضمیمہ (نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۸) شائع کیا ہے۔ اس میں ٹائمس آف انڈیا (۴ دسمبر ۱۸۸۰) کی ایک خبر نقل کی گئی ہے۔ اس وقت ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ایک انگریز افسر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W. W. Hunter) نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اِس وقت ہندستان ایک بنیادی مسئلہ سے دوچار ہے۔ اور وہ عوام کی غربت (Poverty of the people) کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہندستان جو کسی وقت اتنا زیادہ دولت مند ملک سمجھا جاتا تھا، اب وہ اتنا غریب کیوں ہو گیا:

> How comes it that India was once held to be so rich and now proves to be so poor? (p. 34).

تاریخ بتاتی ہے کہ ہندستان، مسلم حکومت کے دور میں نہایت خوش حال تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں پہلی بار وہ غریب ہوا، اور آزادی کے بعد ملکی حکومت کے زمانہ میں بھی وہ غریب ہے، بلکہ اب اس کی غربت میں ہمیشہ سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم مسلم حکمرانوں نے ملک سے جو دولت حاصل کی۔ اس کو انھوں نے ملک کے اندر ہی خرچ کیا۔ اس طرح دولت کی گردش ملک کے اندر ہوتی رہی۔ انگریزوں نے یہ کیا کہ ملک کی دولت کو یہاں سے نکال کر انگلینڈ لے گیے۔ اس طرح دولت کی گردش اندر سے باہر کی طرف ہونے لگی۔ یہی اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ہندستان مسلم عہد میں خوش حال تھا اور انگریزی عہد میں وہ بدحال ہو گیا۔

دولت کی الٹی گردش کا یہی عمل "آزاد ہندستان" میں بھی بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ ہندستان کے دیسی حکمراں اور یہاں کے بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار مختلف طریقوں سے ملک کی دولت باہر لے جا کر یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں جمع کر رہے ہیں، اسی کے ساتھ اسمگلنگ کا کاروبار جو موجودہ ہندستان کا سب سے بڑا کاروبار ہے، وہ ملک کی بے شمار دولت کو بیرونی ملکوں میں پہنچا رہا ہے۔ اس طرح جو دولت باہر جا رہی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں بھی شاید اتنی زیادہ دولت باہر نہیں بھیجی۔

ایک تقابل

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۴۶ میں پہلی بار حیدرآباد کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کی روداد کے ذیل میں موصوف لکھتے ہیں:

" میں چوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تنخواہ نہیں لیتا تھا، میرے پاس واجبی کپڑے تھے۔ اس سفر میں کوئی شیروانی بھی ساتھ نہیں تھی۔ شیروانی قدیم ریاست حیدرآباد میں شریف انسان کی وردی تھی جس سے اس کے معیار کا اندازہ ہوتا تھا۔ بعض پروفیسر صاحبان سے ایک ہی دو بار ملنے سے اندازہ ہوگیا کہ شیروانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طریقہ پر ملتفت نہیں ہوئے۔ اس وقت ہمارے دارالعلوم کے ایک پشاوری طالب علم مولوی محمد شریف حیدرآباد میں تھے۔ میں نے اس غرض کے لئے ان کی شیروانی مستعار لی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ نگاہیں بدل گئیں اور لوگ کسی قدر احترام سے ملنے لگے"۔ کاروان زندگی صفحہ ۳۲۲

اب دوسرا واقعہ دیکھئے۔ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں اسلامی فوج کے مختلف نمائندے ایرانی فوج کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے۔ ان میں سے ایک ربعی بن عامر بھی تھے۔ وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو ان کے جسم پر نہایت معمولی کپڑے تھے۔ تاہم ان کے غیر معمولی کلام کو سن کر رستم مرعوب ہوگیا۔ اس وقت رستم اور اس کے درباریوں سے جو گفت گو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

قال هل رأيتم قط اعز وارجح من كلام هذا الرجل۔ فقالوا معاذ الله ان تميل الى شئ من هذا وتدع دينك الى هذا الكلب۔ اما ترى الى ثيابه فقال ويلكم لا تنظروا الى الثياب وانظروا الى الرای والكلام والسيرة۔ ان العرب يستخفون بالثياب والمأكل ويصونون الاحساب

(حیاۃ الصحابہ جلد اول صفحہ ۲۲۱)

رستم نے کہا کیا تم نے اس آدمی کے کلام سے زیادہ مضبوط اور اعلیٰ بات کبھی دیکھی ہے۔ درباریوں نے کہا، خدا کی پناہ کہ آپ اس کی کسی بات کی طرف مائل ہوں اور اپنے دین کو چھوڑ کر اس کتے کے ساتھ ہوجائیں۔ کیا آپ نے اس کے کپڑے کو نہیں دیکھا، رستم نے کہا، تمہارا برا ہو، کپڑے کی طرف نہ دیکھو۔ بلکہ رائے اور بات اور کردار کی طرف دیکھو۔ عرب لوگ کپڑے اور کھانے کو ناقابل لحاظ سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ حسب نسب کی حفاظت کرتے ہیں۔

گویا ہمارے مسلم دانشوروں میں وہ حقیقت شناسی بھی نہ تھی جو قدیم زمانہ میں ایران کے پارسی لیڈروں کو حاصل تھی۔

مسجد کو دیکھ کر

مولانا محمد علی ہندستانی مسلمانوں کے انتہائی مشہور لیڈر تھے۔ ان کے زمانہ میں دہلی کے ایک مسلمان پینٹنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ مختلف تصویریں بنا کر بیچتے تھے۔ یہی ان کا معاشی ذریعہ تھا ایک بار انھوں نے ایک تصویر بنائی اور یہ تصویر مولانا محمد علی کے سامنے پیش کی تاکہ وہ اس کو خرید لیں۔ اس تصویر میں جامع مسجد دہلی کو دکھایا گیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کافی اونچائی پر ہے اس کی سیڑھیوں کا عام منظر گداگروں کی موجودگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو تصویر بنائی اس میں مسجد کے ساتھ یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ اس کی سیڑھیوں پر ایک بھیک مانگنے والی عورت اپنے ایک بچہ کو لئے ہوئے کھڑی ہے۔

محمد علی نے تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ایک شرط پر اس کو خرید لوں گا۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھ دو کہ اس کے آباروا جداد نے اسے بنایا تھا:

Her fathers built it

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم لیڈر مختلف ملکوں میں اٹھے وہ کس چیز سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ وہ دراصل اپنے کھوئے ہوئے ماضی کے لئے بیچین تھے اور اس کو واپس لانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریکوں کو اگرچہ احیار اسلام کا عنوان دیا۔ مگر ان کی تحریک کا نشانہ ان کا سیاسی ماضی تھا نہ کہ حقیقۃً احیار اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کی یہی نفسیات تھی جس کی وجہ سے وہ کوئی دوررس تعمیری کام نہ کر سکے۔ مثلاً دہلی میں "گذرے ہوئے دور" کی بنی ہوئی کم از کم ایک سو نہایت بڑی مسجدیں تھیں۔ جن میں سے اکثر نیم آباد یا غیر آباد پڑی ہوئی تھیں۔ ان مسجدوں میں اکثر کے پاس بڑی بڑی ملحق زمینیں بھی تھیں۔ یہ لیڈران مسجدوں کو مرکز بنا کر زبردست دعوتی اور تعمیری کام کر سکتے تھے۔ مگر وہ مسلمانوں کے سیاسی ماضی کو واپس لانے کے لئے بے فائدہ قربانیاں دیتے رہے اور اس قسم کے تعمیری امکانات غیر استعمال شدہ پڑے رہ گئے۔

ایک مسلمان جو قومی ذہن رکھتا ہو وہ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کو دیکھ کر صرف اپنے سیاسی ماضی کو یاد کرے گا۔ مگر جو مسلمان دعوت و تبلیغ کا ذہن رکھتا ہو وہ جب اس قسم کی عمارتوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر یہ جذبہ بھڑک اٹھے گا کہ یہ یہاں دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہنچانے کا مرکز قائم کیا جائے۔

تبرکات

مولانا محمد اسماعیل شہید کا زمانہ مغل سلطنت کے آخری عہد کا زمانہ ہے۔ وہ ایک روز دہلی کی جامع مسجد میں اپنے شاگردوں کے ساتھ حوض کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں جامع مسجد کے ایک حجرے سے کچھ تبرکات برآمد کئے گئے۔ یہ بال اور جوتے وغیرہ تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ مجاورین ان کو اکبر شاہ ثانی کی زیارت کے لئے لال قلعہ لے جا رہے تھے۔ جو لوگ اس وقت مسجد میں موجود تھے وہ ان تبرکات کی تعظیم میں فوراً کھڑے ہو گئے، مگر مولانا اسماعیل شہید کھڑے نہیں ہوئے۔

مجاورین خاص اہتمام کے ساتھ ان تبرکات کو لال قلعہ کے اندر لے گئے۔ وہاں اکبر شاہ ثانی اور دربار کے وزراء اور امراء نے کھڑے ہو کر ان کی تعظیم کی اور ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس موقع پر مجاورین نے اکبر شاہ ثانی سے کہا کہ بادشاہ سلامت، آج ان تبرکات کی بہت توہین کی گئی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کس نے توہین کی ہے۔ مجاورین نے کہا کہ تبرکات جب آپ کے حضور میں لائے جا رہے تھے تو تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کی تعظیم کی۔ مگر شاہ عبد العزیز کے خاندان میں ایک شخص مولوی محمد اسماعیل نامی ہے۔ تبرکات اس کے سامنے سے گزرے۔ مگر وہ بیٹھا رہا۔ نہ اس نے تبرکات کو تعظیم دی اور نہ اس کے شاگردوں نے۔

اکبر شاہ ثانی نے اپنا آدمی بھیج کر مولانا محمد اسماعیل کو طلب کیا۔ مولانا لال قلعہ میں پہنچے تو اکبر شاہ ثانی نے مذکورہ واقعہ بیان کیا اور پوچھا کہ آپ نے رسول اللہ کے تبرکات کی تعظیم کیوں نہ کی۔ مولانا اسماعیل شہید نے کہا کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ پہلے آپ براہ کرم قرآن شریف اور بخاری شریف منگوا دیں۔ شاہ نے حکم دیا اور دونوں کتابیں لا کر رکھ دی گئیں۔ اب مولانا اسماعیل نے کہا: دیکھئے یہ قرآن ہے، اس کے کلام اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ بخاری شریف ہے جو رسول اللہ کی قولی و فعلی و تقریری احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ہے۔ ان سے بڑا رسول اللہ کا تبرک کیا ہو سکتا ہے۔ وہ یہاں لایا گیا مگر آپ ان کی تعظیم کے لئے سر و قد کھڑے نہیں ہوئے اور نہ ان کی زیارت کے لئے خاص آداب بجا لائے۔ گویا اصلی اور حقیقی چیزوں کی آپ نے تعظیم نہیں کی۔ مگر وہ تبرکات جو نعلین مبارک یا موئے مبارک وغیرہ کے نام سے رسول اللہ کی طرف منسوب ہیں ان کی آپ تعظیم کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ان کی نسبت پوری طرح ثابت شدہ نہیں۔

اکبر شاہ ثانی اس تقریر سے متاثر ہوا اور ہدیہ اور تحفہ دے کر مولانا محمد اسماعیل کو رخصت کیا۔

ہر آدمی کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔

ابو تمام (۲۳۱-۱۸۸ھ) دمشق کے قریب ایک گاؤں میں پید ہوا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا اور قاہرہ کی مسجد عمرو بن عاص میں پانی بھرتا تھا۔ اپنے زمانہ کے مطابق شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگا، یہاں تک کہ شاعر بن گیا۔ اس کے اشعار کا دیوان چھپ چکا ہے اس کے علاوہ اس کی دو تصانیف الحماسہ اور فحول الشعراٗ ہیں جن میں شاعروں کے کلام کا انتخاب درج کیا ہے۔ یہ انتخاب اتنا عمدہ ہے کہ جب وہ سامنے آیا تو لوگ کہنے لگے: اس کا انتخاب اس کی اپنی شاعری سے بہتر ہے"

الحماسہ کی شکل میں جو انتخاب ہے، وہ اس نے محض اتفاقاً کیا تھا۔ ایک شخص کے یہاں ایک بار اس کو قیام کرنا پڑا۔ وہاں مختلف شعراٗ کے کلام کا ذخیرہ موجود تھا۔ کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے انتخاب شروع کر دیا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کی زیادہ قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کوئی دوسرا کام اس سے محض ضمنی طور پر ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ قیمتی قرار پاتا ہے۔

اکثر اوقات آدمی کے لئے بہترین بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے طبع زاد کام کا کریڈٹ لینے کا شوق نہ کرے۔ بلکہ کسی دوسرے کے کام میں شریک و معاون بن جائے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت پسندی پر اپنے کو راضی کر سکیں۔

جاحظ اور حریری

جاحظ (م ۲۵۵ھ) بصرہ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے وقت کا زبردست عالم اور بے مثل ادیب تھا۔ علم کلام میں اس نے ایک مستقل مدرسہ فکر پیدا کیا جس کو جاحظیہ کہا جاتا ہے۔ اس نے مختلف فنون پر ۲۰۰ کتابیں لکھی ہیں۔ استاذ ابن العمید (م ۳۶۰ھ) نے اس کی تصنیفات کے بارے میں کہا ہے: وہ اولاً عقل اور ثانیاً ادب سکھاتی ہیں" اس نے حیوانات، نباتات، اخلاقیات، اجتماعیات اور دوسرے موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کی شائع شدہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

کتاب البیان والتبیین

کتاب الحیوان

کتاب المحاسن والاضداد

کتاب البخلا

علم وادب کے کمال کے باوجود وہ نہایت بد شکل انسان تھا۔ بے ڈول جسم، بھدا چہرہ، بدوضع ابھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ دیکھنے والے کو عجیب الخلقت دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا ابھار اتنا نمایاں تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا لقب جاحظ (ابھری آنکھوں والا) پڑ گیا۔ اس کا اصل نام ابو عثمان عمرو بن بحر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ متوکل باللہ نے جب اس کے علم وادب کی تعریف سنی تو اس کو اپنے لڑکے کا اتالیق بنانے کے لئے سر من رائے (عراق) اپنے پاس بلایا۔ مگر جب اس کی بھدی صورت دیکھی تو اس کو سخت کراہت ہوئی۔ اس نے جاحظ کو دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔

مشہور ادیب حریری (۵۱۶-۴۴۶ھ) بھی نہایت بد شکل اور پستہ قد آدمی تھا۔ ایک آدمی اس کی شہرت سن کر دور سے اس سے ادب سیکھنے آیا مگر اس کی صورت دیکھ کر بھڑک گیا۔ اس پر حریری نے اس کو کچھ اشعار لکھوائے جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

مثل المعیدی فاسمع بی ولا ترنی

(میں معیدی کی طرح ہوں۔ میری باتیں سنو شکل نہ دیکھو)

ایک عبرت انگیز واقعہ

قویلہ خاں (چنگیز خاں کا پوتا) ۶۵۵ھ میں چنگیز خاں کے تخت حکومت پر بیٹھا۔ یہ حکومت اس وقت چین سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی سلطنت بہت ضعیف حالت میں تھی۔ عیسائی، مجوسی اور یہودی مغلوں کے دربار میں رسوخ حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں سے ان کو متنفر کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابا قاخاں ابن ہلاکو خاں نے خراسان سے قویلہ خاں کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ مجھ کو یہودیوں اور مجوسیوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، آپ کا اس تعلیم کے متعلق کیا خیال ہے۔ اگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ہم کو جہاں پائیں قتل کریں تو ایسی حالت میں مسلمانوں کی قوم کا دنیا میں باقی رہنا ہمارے لئے ایک مستقل اندیشہ کا باعث ہے۔ قویلہ خاں اسلام سے متاثر تھا چنانچہ اپنی حکومت میں اس نے ایک وزیر مسلمان بھی رکھا تھا جس کا نام امیر احمد بناکتی تھا۔ ابا قاخاں کی اس عرضداشت کو پڑھ کر قویلہ خاں نے بعض مسلمان علماء کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تمہارے قرآن میں ایسا حکم موجود ہے۔ انھوں نے کہا "ہاں یہ حکم قرآن میں ہے" قویلہ خاں نے کہا کہ پھر تم ہم کو قتل کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم قوت نہیں رکھتے۔ جب قوت پائیں

گے، تم کو قتل کردیں گے۔ قویلہ خاں نے کہاکہ اب چونکہ ہم قدرت رکھتے ہیں لہذا ہم کو چاہئے کہ ہم تمھیں قتل کریں۔ یہ کہہ کر اس نے ان علماء کو قتل کرادیا اور حکم جاری کیاکہ مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ خبر مولانا بدرالدین بیہقی اور مولانا حمیدالدین سمرقندی کو ملی تو وہ قویلہ خاں کے دربار میں گئے اور کہاکہ آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم کیوں جاری کیا۔ قویلہ خاں نے کہایہ بتاؤ" اقتلوا المشرکین" کا حکم جو تمہارے قرآن میں ہے، اس کا کیا مطلب ہے۔ دونوں عالموں نے کہاکہ عرب کے بت پرست جو مسلمانوں کے قتل پر ہمہ تن آمادہ تھے۔ ان کی نسبت خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیاکہ اپنی حفاظت کے لئے ان کو قتل کرو۔ یہ حکم تمہارے لئے نہیں ہے کیونکہ تم تو خدا کی وحدانیت کے قائل ہو اور اپنے فرمان کے اوپر خدا کا نام ہمیشہ لکھتے ہو۔ یہ سن کر قویلہ خاں بہت خوش ہوا اور اسی وقت حکم صادر کیاکہ میرا پہلا حکم جو مسلمانوں کے قتل کی نسبت جاری ہوا اس کو منسوخ سمجھا جائے (۸۰۔۳۷۹)

سطحی علم اور گہرے علم کا فرق اس وقعہ سے واضح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس گہرا علم نہ ہو، اس کو چاہئے کہ چپ رہے۔ نہ کہ بے معنی باتیں بول کر غیر ضروری مسائل پیدا کرے۔

جو لوگ تقریر و خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں

سحبان وائل (م ۵۴ھ) خوش بیانی میں ضرب المثل ہے۔ امیر معاویہ کے دربار میں شامل ہو کر اس نے بڑی عزت پائی۔ ایک بار خراسان سے ایک وفد امیر معاویہ کے یہاں آیا۔ انھوں نے سحبان کو بلوایا اور اس سے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا "میرے لئے عصا لاؤ" لوگوں نے کہا "امیر المومنین کے دربار میں تم عصا سے کیا کرو گے"

اس نے جواب دیا "وہی جو موسیٰ اپنے رب سے باتیں کرتے وقت اپنے عصا سے کرتے تھے" اس کے بعد تقریر شروع کی تو ظہر سے لے کر عصر تک اس طرح مسلسل بولتا رہا کہ درمیان میں ایک بار بھی کہیں نہیں اٹکا۔ تمام حاضرین حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ امیر معاویہ نے کہا "واقعی تم عرب کے سب سے بڑے خطیب ہو" سبحان نے برجستہ کہا: نہ صرف عرب کا بلکہ سارے عجم کا اور جن وانس کا بھی"

زیادہ بن ابیہ (م ۵۳ھ) نے ایک بار حضرت عمر کی موجودگی میں مہاجرین وانصار کے سامنے تقریر کی۔ تقریر اتنی کامیاب تھی کہ اس کو سن کر عمرو بن العاص بول اٹھے: سبحان اللہ اس نوجوان کا باپ اگر قریشی ہوتا تو یہ اپنے عصا سے عربوں کی قیادت کرتا" حجاج بن یوسف ثقفی (۹۵-۴۱ھ) کو زبان وبیان کی حیرت انگیز صلاحیت حاصل تھی۔ مالک بن دینار کہتے ہیں: میں نے حجاج سے زیادہ اثر انگیز اور خوش بیان مقرر نہیں دیکھا۔ جب وہ ممبر پر کھڑا ہو کر عراقیوں کے ساتھ اپنے احسانات اور عفو کا ذکر کرتا اور اس کے مقابلہ میں عراقیوں کی زیادتیاں اور بدسلوکیاں بیان کرتا تو میں اس کو سچا اور عراقیوں کو جھوٹا سمجھنے لگتا۔ حالانکہ اس نے ان میں سے ایک لاکھ ۲۰ ہزار کو قید میں ڈال کر مار ڈالا تھا، اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے قید خانوں میں ۵۰ ہزار مرد اور ۳۰ ہزار عورتیں بند پڑی ہوئی تھیں"

شہادت عثمان کے بعد جب مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا اور نتیجہ میں بہت سی ایک دوسرے کی حریف جماعتیں پیدا ہو گئیں تو خطابت نے بہت ترقی کی۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنے نظریہ کی تبلیغ واشاعت کے لئے سب سے زیادہ جس چیز پر اعتماد کرتا تھا، وہ خطابت اور تقریر ہی تھی۔ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونے کے بعد پھر ختم نہ ہو سکا۔ اس لئے خطابت اور تقریر کو خوب غذا ملتی رہی اور اتنے زیادہ مقررین پیدا

ہوئے جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

تاہم دور سائنس کے ظہور سے پہلے تقریر و خطابت اپنی بعض مضرتوں کے ساتھ بہت سے پہلوؤں سے مفید بھی ثابت ہوتی رہی۔ خاص طور پر مقابلہ کے مواقع پر جوش جہاد ابھارنے کے لئے۔ مگر دور سائنس میں اس قسم کی خطابت بالکل بے معنی ہو گئی ہے۔ آج علم و عمل کے سارے اندازے بدل چکے ہیں۔ اب علم میں تحقیق اور تجزیہ نے اہمیت حاصل کرلی ہے اور عمل میں منصوبہ بندی نے۔ ظاہر ہے کہ تقریر و خطابت کا ان دونوں چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے آج تقریر کا مقام وہی ہو چکا ہے جو مشاعروں میں شاعری کا ہوا کرتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ان حالات میں جو لوگ اب بھی تقریر و خطات کے کمالات دکھا رہے ہیں، وہ صرف تقریر و خطابت کے کمالات دکھا رہے ہیں، وہ صرف یہ ثابت کررہے ہیں کہ انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کی خبر نہیں۔ ان کی سرگرمیاں ممکن ہے کسی میوزیم میں جگہ پاسکیں، مگر ان کو حال یا مستقبل کی تعمیر کا عنوان نہیں دیا جاسکتا ہے۔

شاعر کا اعتراف

طرماح بن حکیم (م ۱۰۰ھ) اور کمیت بن زید اسدی دونوں ہم عصر تھے۔ دونوں کا نسب، وطن اور مذہب بالکل الگ الگ تھا۔ طرماح قحطانی، شامی اور خارجی تھا۔ اس کے برعکس کمیت، عدنانی، کوفی اور شیعہ تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خارجی حضرت علی کے دشمن تھے۔ خوارج کے چھ بڑے فرقے ہوئے ہیں: ازارقہ، نجدات، صفریہ، عجاردہ، اباضیہ، ثعالبہ۔ یہ سب حضرت عثمان و حضرت علی سے برأت و بیزاری میں متفق ہیں اور اپنے اس عقیدے کو تمام عبادتوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ طرماح کا تعلق فرقہ ازارقہ سے تھا جو اتنا

متشدد تھا کہ حضرت علی کو نعوذ باللہ کافر کہتا تھا اور آپ کے قاتل ابن ملجم کو برسر حق سمجھتا تھا۔ دوسری طرف کمیت شیعہ ہونے کی وجہ سے حضرت علی کی تعریف میں اتنا غلو کرتا تھا کہ آپ کو بشریت سے بلند مانتا تھا۔

اس شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ کمیت کہتا تھا "ہم دونوں عوام سے بغض رکھنے میں متفق ہیں" ایک بار دونوں شاعر، مخلد بن یزید مہلبی کے یہاں گئے۔ اس نے دونوں کو عزت سے بیٹھایا اور شعر سنانے کے لئے کہا۔ طرماح نے کہا: "ہرگز نہیں شاعری کی عزت یہ نہیں کہ میں کھڑا ہو جاؤں اور وہ مجھے ذلیل کرے" مخلد غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا: تم کمیت کے لئے جگہ خالی کر دو" اب کمیت آگے بڑھا اور کھڑے ہو کر اشعار سنانے شروع کئے۔ مخلد بہت خوش ہوا۔ اور اس کو پچاس ہزار درہم انعام دیئے۔ جب دونوں باہر نکلے تو کمیت نے آدھے درہم طرماح کو دیدئے۔ اس نے کہا: "اے ابو ضبیبہ، تم خوددار ہو اور میں موقع پسند ہوں۔ اور وقت کے مطابق کام کرتا ہوں۔"

بناوٹی قصے

شیخ ابو یزید قرطبی فرماتے ہیں۔ میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار بار لا الہ الا اللہ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے۔ میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کے لئے بھی پڑھا۔ اور کئی نصاب خود اپنے لئے پڑھ کر ذخیرۂ آخرت بنایا۔

ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ صاحب کشف ہے۔ جنت دوزخ کا بھی اس کو کشف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی صحت میں کچھ تردد تھا۔ ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ دفعتاً اس نے ایک چیخ ماری اور اس کا

سانس پھولنے لگا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے ابھی اپنی ماں کو دیکھا ہے۔ وہ دوزخ میں جل رہی ہے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرے پاس لاالہ الا اللہ کے پڑھے ہوئے جو نصاب ہیں، ان میں سے ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں۔ اس طرح نوجوان کی سچائی کا بھی تجربہ ہو جائیگا۔ چنانچہ میں نے ایک نصاب ستر ہزار کا، ان نصابوں میں سے جو اپنے لئے پڑھے تھے، اس کی ماں کو بخش دیا۔ یہ میں نے چپکے ہی سے اپنے دل میں بخشا تھا اور میرے اس پڑھنے کی خبر بھی اللہ کے سوا کسی کو نہ تھی۔ مگر اس کے بعد فوراً ہی وہ نوجوان کہنے لگا کہ چچا، میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹادی گئی۔ (۸۴)

یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ اس طرح کے بے شمار قصے گھڑ گھڑ کرامت کے اندر پھیلا دیئے گئے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں جو اس قسم کی بناوٹی کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان قصوں اور کرامات کی جعلی داستانوں نے بہت سے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ ان کے ذریعہ مذہب کی دکانیں قائم کریں۔ کیونکہ عوام بہت جلد طلسماتی قصوں کے فریب میں آجاتے ہیں۔

ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو

سابق وزیر اعظم ملیشا تنکو عبد الرحمٰن نے بتایا کہ ملیشیا میں جو غیر مسلم آباد ہیں، وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے بہت شائق ہیں، مگر مسلمانوں کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں کہ ان کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ الیکشن کے موقع پر غلط قسم کی سیاست بازی کے ذریعہ وہ غیر مسلموں کو اسلام سے کچھ متوحش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی جماعت ''پرکم'' کی کوششوں سے ملیشیا میں تقریباً ۳۰ ہزار اور صباح میں ایک لاکھ آدمی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ سراوک میں ہر دن لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر مسلمان ان کو اپنے معاشرہ میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حتی کہ بعض لوگ ان نو مسلموں سے مصافحہ تک نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ''ان کے ہاتھ سور کی چربی سے گندے ہو چکے ہیں۔ تنکو عبد الرحمٰن لکھتے ہیں۔

Today I amd fighting a long battles to get these Muslim converst accepted in to the Malay community

ان نو مسلموں کو ملایا کے مسلم معاشرہ میں شامل کرنے کے لئے میں ایک تنہا جنگ لڑ رہا ہوں (اسلامک ہرالڈ، کوالالمپور، دسمبر ۱۹۷۵)

تنکو عبد الرحمٰن اپنی سیاسی زندگی کے زمانہ میں ملیشیا کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ مگر جب انھوں نے سیاست کی ہنگامی زندگی کو چھوڑ کر تعمیری کام کرنا چاہا تو اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ کسی قائد کا ساتھ صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ وہ ان کو جذباتی سیاست کی شراب پلا رہا ہو۔ خاموش کام

کرنے والوں کا ساتھ دینے کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ اس مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ ہمارے درمیان کچھ قائد ایسے نکلیں جو عزت و شہرت کی قربانی پر اپنے آپ کو خاموش تعمیری کاموں میں لگادیں۔ جب قائدین کی ایک نسل اس طرح اپنے آپ کو گم نامی کے قبرستان میں دفن کر چکی ہو گی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ملت کو حقیقی معنوں میں دنیا کے اندر عزت و سربلندی کا مقام حاصل ہو۔ اگر ہمارے قائدین شہرت و عزت کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوں اور عوام کو تعمیری کام کا وعظ سنائیں، تو یہ کام کبھی انجام نہیں پاسکتا۔ بد قسمتی یہ ہے کہ تنکو عبد الرحمٰن جیسے تعمیری کام کا ذوق رکھنے والے ہمارے یہاں صرف استثنا کا درجہ رکھتے ہیں۔

AL-RIYADHA WASHABAB NO. 102 — 23 MAY 1977.

العراق اول قطر فى العالم
اتخذ من الرياضة
اسلوبا للحياة

یہاں عنوان کی جگہ پر ہم ایک عربی اخبار کا تراشہ نقل کر رہے ہیں۔ یہ عراقی ہفتہ وار الریاضۃ والشباب (بغداد) سے لیا گیا ہے۔ عرب دنیا میں خطاطی ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی ہے۔ نئے نئے انداز کی خوبصورت تحریریں وجود میں آرہی ہیں۔ اوپر کا تراشہ اسی کا ایک سادہ سا نمونہ ہے۔

اسلام آیا تو مکہ اور مدینہ میں بمشکل ایک درجن آدمی لکھنا جانتے تھے۔ بدر کی لڑائی میں جو لوگ قید ہوئے، ان میں سے کچھ کتابت کا فن جانتے تھے۔ ان کے فدیہ کے لئے یہ مقرر کیا گیا کہ وہ مدینہ کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا دیں اس کے بعد وہ رہا کر دیئے جائیں گے۔ اس طرح مدینہ میں لکھنے والوں کی کثرت ہو گئی۔

تاہم کتابت کا فن اس وقت بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ عباسی دور میں، دوسرے فنون کی طرح اس کو کافی ترقی ہوئی۔ نئے نئے ڈیزائن پیدا کرنے کی کوشش میں خط مرصع، خط ریاسی وجود میں آئے خط ریاسی، اپنے موجد ذوالریاستین فضل بن سہل کی طرف منسوب ہے۔ اس زمانہ میں خط کوفی کی بیس سے زائد شکلیں بن گئی تھیں، تاہم یہ سارے خطوط ابتدائی صورت میں تھے، عربی خط کو حسین بنانے کا کام سب سے پہلے ابو علی محمد بن مقلہ (م ۳۲۸ھ) نے کیا۔ اس کے بعد علی بن ہلال (م ۴۱۳ھ) آئے اور انھوں نے

اس کی تہذیب و تحسین میں مزید اضافہ کیے۔

عربی خط ارتقا کے مراحل سے گزرتا رہا اور اس نے ایک مستقل آرٹ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب یہ خط اتنا دل آویز بن چکا تھا کہ بہت سی دوسری قومیں جب اسلام لائیں تو انھوں نے اپنی قومی زبان کے لئے اسی رسم خط کو پسند کر لیا۔ مثلاً ترکی، فارسی، افغانی، سندھی، اردو اور افریقہ کی مختلف زبانیں۔

جمالیاتی ذوق انسان کا ایک فطری ذوق ہے۔ یہ ذوق مصوری، مجسمہ سازی اور آرٹ کی دوسری صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، اسلام میں چونکہ آرٹ کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق نے اپنے اظہار کی دوسری صورتیں تلاش کر لیں، مثلاً تعمیرات، چمن بندی، وغیرہ۔

انھیں صورتوں میں سے ایک فن کتابت بھی ہے۔ کتابت کے فن کا چونکہ بہت گہرا تعلق قرآن وحدیث سے بھی تھا، اس لئے اس فن کی طرف مسلمانوں کی توجہ بہت زیادہ ہوئی مسلمانوں میں بہت بڑے بڑے خطاط پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کو اعلیٰ ترین جمالیاتی معیار پر پہنچادیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی خط کی تحسین کے لئے جتنی کوششیں مسلمانوں نے کیں، اتنی کسی بھی دوسرے رسم الخط کے لئے کسی قوم نے نہیں کیں۔ عربی خط آج دنیا کا حسین ترین خط سمجھا جاتا ہے۔ فنی اور تمدنی ترقیوں کا بہت گہرا تعلق اقتصادیات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ فن کتابت کی ترقیاں بھی اسی وقت تک جاری رہیں جب تک اقتصادیات کے سرے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے۔ اٹھارویں صدی میں مغلوں اور ترکوں کے زوال اور جدید صنعتی نظام کے ظہور نے مسلمانوں کو اقتصادیات میں پیچھے کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری سرگرمیوں کے ساتھ خط کی تحسین وترقی کا کام رک گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پڑول کی دولت کے ظہور نے، دوسری چیزوں کے ساتھ، فن کتابت کو بھی دوبارہ نئی ترقی کے مواقع دے دیئے ہیں، عرب ممالک میں ایسے خطاط پیدا ہو رہے ہیں جنھوں نے عربی خط کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ "آفاق عربیہ" فن کتابت کی ان جدید ترقیوں کی ایک مثال ہے۔

یہاں یہ اضافہ غیر متعلق نہ ہوگا کہ جن زبانوں نے عربی رسم الخط کو اپنایا، وہ سب موجودہ زمانہ میں اپنے حسب حال اس کے ٹائپ کو بھی اختیار کر چکی ہیں۔ وہ عربی خط کے حسن کے ساتھ دور جدید کی مشینی خوبیوں کو جمع کر کے وقت کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے۔ اور وہ اسی زبان کا ہے جس کے وارثوں کا یہ خیال ہے کہ ان کی زبان اسی طرح تمام زبانوں میں افضل ہے جس طرح ان کا رسول تمام رسولوں میں۔۔۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ہماری زبان اردو ہے جس کے معنی لشکر کے ہوتے ہیں۔

Acclaimed the best in the world
Reconnus comme les meilleurs du monde
Anerkanntermassen das Beste auf der Welt
Reconocidas como las mejores del mundo
أجمع الناس على أنها الاجود في العالم
最優設計及最高品質之工具
品質最高世界の工具

Modern Asia (Hong Kong) October 1976

Far East/Pacific Division
Snap-on Tools International, Ltd.
103-104 Hollywood Commercial House
3-5 Old Bailey Street
P.O. Box 1619 Hong Kong, B.C.C.

Latin American/Caribbean Divisio
Snap-on Inter-Americas, Ltd.
Dadeland Towers — Suite 314
9200 South Dadeland Boulevard
Miami, Florida 33156

16 on inquiry card 36

عربی زبان نئی اہمیت حاصل کر رہی ہے۔

ہزار برس پہلے ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم تھا۔ یہ صرف ایک سیاسی غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مسلمان اس وقت کی دنیا میں علمی اور فکری امام بنے ہوئے تھے۔ اسپین میں مسلم عہد عروج کے وقت اسپینی عیسائیوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے عملاً عرب تمدن کو اختیار کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو اس زمانہ میں مستعرب (moza-rabes) کہا جاتا تھا۔

قرطبہ کے بشپ (Alvaro) نے ان عیسائی مستعربین پر افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میرے مسیحی بھائی عربی اشعار اور حکایات سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور مسلمان علماء اور فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس نیت سے نہیں کہ ان کی تردید کریں بلکہ اس ارادہ سے کہ وہ عربی کے صحیح اور شستہ طرز ادا سے آشنا ہو سکیں۔ آج کل ہماری کتب مقدسہ کی لاطینی تفاسیر کا پڑھنے والا کہاں ملتا ہے، اور ایسے لوگ کہاں ہیں جو اناجیل اور انبیاء کے صحف کا مطالعہ کرتے ہوں۔ افسوس کا مقام ہے کہ تمام عیسائی نوجوان جو اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں عربی زبان اور ادب کے سوا اور کسی ادب سے واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ عربی کتابیں بڑے ذوق شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کو اپنے کتب خانوں کے لئے زر کثیر صرف کر کے حاصل کرتے ہیں اور علانیہ کہتے ہیں کہ یہ لٹریچر بڑی تحسین کے لائق ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کے سامنے مسیحی کتابوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حقارت سے جواب دیں گے کہ اس قسم کی کتابیں ان کی توجہ کے لائق نہیں۔ افسوس کہ مسیحی اپنی زبان تک بھول گئے ہیں۔ ہزار میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو معقول قسم کی لاطینی میں اپنے دوست کے نام معمولی سا خط بھی لکھ سکے۔ لیکن اگر عربی قابلیت پوچھئے تو بہت سے ایسے اشخاص ملیں گے جو نہایت فصیح و بلیغ عربی میں اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس زبان میں ایسی

عمدہ شاعری کرتے ہیں کہ خود عرب بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں"

یہ اقتباس اسپینی مستشرق پروفیسر پالیسا(Palencia) کی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا پہلا انڈیشن ۱۹۲۸ میں شائع ہوا تھا۔ مصری فاضل حسین مونس نے اس کو اسپنی سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۵) تاتاریوں نے جب عالم اسلام کو تاراج کیا تو صورت حال بدلنے لگی۔ اب نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ فکری اور علمی حیثیت سے بھی مسلم قومیں پستی کی طرف چلیں گئیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے شیخ عبد القادر جرجانی (م ۴۷۱ھ) کے قلم سے یہ الفاظ نکلے کہ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ انسانی طبیعتیں بدل گئی ہیں۔ جہل اور لاعلمی نے علم و فضل کا درجہ لے لیا ہے۔ جو اوصاف پہلے قابل تعریف سمجھے جاتے تھے، وہ قابل مذمت بن گئے ہیں:

حتی صار اعجز الناس عند الجمع من کانت له همة فی ان یستفید علما او یزداد فهما او یکتسب فضلا او یجعل له ذالك بحال شغلا (دلائل الاعجاز ، صفحه ۲۸)

یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ لوگوں کے نزدیک وہ شخص سب سے زیادہ ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو علوم عربیہ کا شوق رکھتا ہو۔ اور اس میں استفادہ و ترقی میں مشغول ہو۔

اٹھارویں صدی میں جب مغربی قومیں عالم اسلام پر غالب آگئیں تو اس میں اور ترقی ہوئی۔ تقریباً دو سو برس تک یہ حال رہا کہ عربی علوم میں مشغول ہونا، کم از کم دنیوی اعتبار سے، بالکل بے فائدہ سمجھا جانے لگا۔ "مسٹر" ہونا عزت کی علامت اور "مولوی" ہونا بے وقعتی کا نشان بن گیا۔ مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں صورت حال دوبارہ تبدیل ہو رہی ہے۔

ہندستان میں بہت سے ادارے ہیں جو مختلف بیرونی زبانیں سکھانے کا کورس چلاتے ہیں۔ چند برس پہلے ان میں عربی زبان کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ آج یہ حال ہے کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات میں جب ان اداروں کا اشتہار چھپتا ہے تو عربی زبان، مختلف غیر ملکی زبانوں کی فہرست میں صرف انگریزی کے بعد نمبر ۲ پر درج ہوتی ہے۔ ہندستانی اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع ہونے لگے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ عربی میں اشتہاری عبارتیں شامل رہتی ہیں۔

یہ محض ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی زبان موجودہ زمانہ میں کتنی اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اب وہ نہ صرف اقوام متحدہ اور اس کی دوسری ایجنسیوں کی سرکاری زبان ہے بلکہ جدید دنیا کی تمام بڑی بڑی سرگرمیوں میں اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔

عربی زبان کی اس جدید اہمیت نے ہمارے عربی مدارس کی تعلیم میں ایک نئی اہمیت پیدا کردی ہے۔ ان مدارس کے طلبہ اگر تکمیل نصاب کے ساتھ عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد بھی لے کر نکلیں تو انھیں یہ شکایت نہ ہوگی کہ۔۔۔ "آج کی دنیا میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں"۔

ہوے رہا ہے۔

مثبت کام کی ضرورت

استعمار کے خلاف پچھلی صدیوں میں جو سیاسی ہنگامے کئے گئے ہیں ان سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، البتہ یہ بڑا نقصان ہوا کہ دوسری قوموں کے لئے اسلام پر غور وفکر کا ماحول ختم ہو گیا۔ مغربی قومیں ہمارے لئے دعوت کا موضوع بننے کے بجائے نفرت کا موضوع بن گئیں۔ مغرب کے لوگوں کو ہم نے اس نظر سے نہیں دیکھا کہ خدا کے یہ بندے ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کو خدا کا پیغام پہنچائیں۔ اس کے برعکس ہم سمجھنے لگے کہ یہ بدترین مخلوق ہیں۔ انھیں ذلیل کرنا اور ان سے دور رہنا ہی تقدس کی بہترین نشانی ہے۔ مولانا مملوک علی کو اپنی ملازمت کی وجہ سے کبھی کبھی انگریز سے مصافحہ کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد وہ غسل خانہ میں جار کر ہاتھ دھو لے تے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز کو چھونے کی وجہ سے ان کا ہاتھ نجس ہو گیا ہے۔

استعمار ختم ہو گیا مگر اسلام کے نام پر لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا عمل اب بھی جاری ہے۔ اب اس کا رخ خود مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلم ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کے نعرہ کے ساتھ مسلم جماعتیں اپنے ملکوں کے مسلم حکمرانوں سے برسرپیکار ہیں۔ یہ باہمی تصادم نہ صرف ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے متنفر کر رہا ہے۔

ہم نے ایک ایسی چیز کے پیچھے اپنی عمر ضائع کردی جس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے، نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہونے والا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے۔ کہا ہاں ٹھیک ہی ہے میاں۔ مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کردی۔ میں نے عرض کیا، حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔

فرمایا: میں تم سے صحیح کہتا ہوں عمر ضائع کردی میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے۔ فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں۔ امام ابو حنیفہ کے مسائل کے دلائل قائم کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی۔ ابو حنیفہ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعی مالک اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب" غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں۔ اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں ہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی۔ قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہو گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ تھے: اللہ نہ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہ کو، نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنھوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے۔ جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا۔ کہ وہاں میدان محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہ نے صحیح کہا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہو گا۔

توجس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نگھرنا ہے، نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی۔ اپنی قوت صرف کردی جو صحیح اسلام کی دعوت تھی۔ مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے واغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے وہ پھیل رہے ہیں۔ گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے شرک و بت پرستی پھیل رہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے۔ لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کردی۔

نصف صدی بعد

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے انیسویں اجلاس (مارچ ۱۹۲۵) میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے خطبہ صدارت پڑھا تھا۔ پچاس برس پہلے ہمارے دینی مدارس کا جو حال تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

ہمارے مدارس کی بے سر وسامانی اس سے ظاہر ہے کہ حال میں جو فتنۂ ارتداد پھیلا تو ہر طرف سے یہ صدائیں بلند ہیں کہ تعلیم تبلیغ کے واسطے جماعتیں قائم کی جائیں۔ یعنی قدیم تعلیم اور جماعتیں اس ضرورت کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ تقریر اور تحریر دونوں کی وہ قوت نہیں جو سننے اور پڑھنے والوں کے دل ودماغ پر سکہ بٹھادے۔ معلومات، کتابوں کے ضمائر اور اشارات تک، شروح وحواشی قدیمہ کی عبارات تک محدود۔ کام چلے تو کیونکر۔ شدید ضرورت ہے جدید جماعتوں کے قیام کی" ان سطروں کو لکھے ہوئے پچاس برس گزر گئے مگر ہمارے اداروں کا یہ خلا بدستور باقی ہے۔

غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے آج پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مبلغین کی ضرورت ہے۔ یورپ میں مذہب کو از سر نو جاننے کا زبردست رجحان بیدار ہو گیا ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگ تیزی سے ان کے درمیان گھس رہے ہیں۔ مگر ہمارے مدارس کے پاس ایسے لوگ نہیں جو اہل یورپ کو اسلام کا پیغام دے سکیں۔ افریقہ کی مقامی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی بے حد مانگ ہے، مگر ہمارے یہاں ایسے لوگ مفقود ہیں جو ان زبانوں میں اسلامی کتابوں کا عمدہ ترجمہ کر سکیں۔ جدید اسلوب اور جدید استدلال کے ساتھ اسلامی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت کا ہر طرف سے تقاضہ ہو رہا ہے۔ مگر

ہمارے رہنما جذباتی تقریروں کے سوا اور کوئی چیز آج کے انسان کو نہیں دے سکتے۔

ہندستان میں خود غیر مسلم جماعتیں اپنے اہتمام سے ایسے اجتماعات کرتی ہیں جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ وہاں آکر اپنے مذہب کا تعارف کرائیں مگر اس ذمہ داری کو ادا کرنے والے آدمی بھی ہمارے پاس نہیں۔

☆

پہلی جنگ عظیم (۱۸۔۱۹۱۴) کے زمانہ میں جب عرب دنیا ترکی کی عثمانی خلافت کے "جوئے" سے رہائی کو اپنے لئے عظیم نجات تصور کئے ہوئے تھی، ان کے درمیان ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے دور رس عواقب کو سمجھتے تھے اور اپنے عرب بھائیوں کو اس سے آگاہ کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶۔۱۸۶۹) نے اسلامی اتحاد کی اہمیت کو محسوس کیا اور عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کے صلہ میں انھیں یہ تحفہ ملا کہ ان کو خوشامدی اور غدار کہا گیا۔ اس کا جواب انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح دیا تھا:

سیعلم قومی اننی لا اغسھم　　　ومھما استطال اللیل فاصبح واصل

(جلد ہی میری قوم جان لے گی کہ میں اس کو دھوکہ نہیں دے رہا ہوں۔ رات خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے، صبح بہر حال آنے والی ہے

☆

ابو عبد اللہ لسان الدین معروف بہ ابن الخطیب (۷۷۶۔۷۱۳ھ) غرناطہ میں پیدا ہوا۔ عربی زبان و ادب، علوم دینیہ، فلسفہ و طب، ریاضی و تاریخ میں وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ مگر حاکم غرناطہ ابو الحجاج یوسف (۷۵۵۔۷۳۳ھ) کے دربار میں اس کو جس

چیز نے پہنچایا، وہ اس کی ادب و شاعری تھی۔ سلطان نے اس کو اپنا سکریٹری بنالیا۔ اس کے بعد اس کو وزیر کا منصب عطا کیا۔ ابو حجاج کے بعد اس کا بیٹا محمد خامس تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اس کو وزارت پر بحال رکھا۔ مگر اس کی ترقی نے اس کے حاسدں کی تعداد بہت بڑھا دی۔ انھوں نے بادشاہ کو اس کے خلاف بدگمان کر دیا۔ وہ غرناطہ سے بھاگ کر افریقہ پہنچا۔ یہاں بھی ابتداءً اس کی عزت و تکریم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے فقہا کو اس کے خلاف بھڑکایا، انھوں نے اس کے الحاد کا فتوی دے دیا۔ چنانچہ کچھ جوشیلے لوگ دیوار پھاند کر اس کے گھر میں گھس گئے اور گلا گھونٹ کر اس کو مار ڈالا۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح افریقہ میں علم وادب کی امامت ابن خلدون پر ختم ہو گئی۔ اسی طرح اندلس میں علم وادب کی امامت ابن الخطیب پر ختم ہوئی۔ ابن الخطیب کا تاریخ میں بہت بلند مقام تھا۔ اس نے تقریباً ۶۰ تصنیفات چھوڑی ہیں۔ الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ (تین جلدیں) غرناطہ کی شخصیتوں کے لئے تاریخی ڈکشنری کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆

ترکی مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لئے مغربی تہذیب سے تصادم کا مسئلہ سب سے پہلے یہیں پیش آیا مگر اس کے جواب میں کیا ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا گروہ تھا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کا اس درجہ مخالف تھا کہ سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۳۹-۱۸۰۸) کی نئی فوجی تنظیمات اور ان جدید اصلاحات تک کی مخالفت کی جو انھوں نے ترکی کو عسکری اور علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لئے نافذ کی تھیں۔

دوسری طرف ترکی کی وہ نئی نسل تھی جو پیرس اور برلن اور لندن کی

یونیورسٹیوں
میں تعلیم حاصل کر کے آئی تھی، وہ ترکی کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔ ان کی انتہاپسندی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے مغربی تقلید کے جواز کے لئے ایک پورا فلسفہ بناڈالا ضیاء گوک الپ نے کہا:

"مغربی تہذیب (جس کو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری، سیتھی، فینقی، رعاۃ، ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانونہ سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لئے وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بیناد پر ہم مغربی تہذیب کا جزٔ ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔ ان کا منتہائے فکر یہ تھا کہ "وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو مغرب کی روشن اور بلند پایہ تہذیب میں نصب کر لیں" (عرفان اورگا، اتاترک، ۲۹۷) کمال اتاترک (۱۹۳۸۔۱۸۸۱) جب ۱۹۲۴ میں ترک جمہوریہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے تو ان کے نزدیک جو سب سے اہم کام تھا وہ یہ کہ ترکوں کو مغرب کا لباس پہنادیں۔ انھوں نے پردہ کو خلاف قانون قرار دیا۔ عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری کئے۔ عربی میں اذان ممنوع ہو گئی۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیدیا گیا۔ حتی کہ جب ایک خوں ریز انقلاب کے بعد ہیٹ کی جنگ جیت لی گئی تو مصطفےٰ کمال نے مکہ کی مؤتمر اسلامی (۱۹۲۷) میں شرکت کے لئے ترک پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اس حال میں روانہ کیا کہ وہ اس کے واحد مندوب تھے جو اپنے سر پر مغربی ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا ترکی کی فتح عظیم کا اعلان تھا۔

یہی مثال ہر مسلم ملک میں پیش آئی ہے۔ ان میں ڈگری کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر جگہ یہی ہوا کہ قدیم مذہبی طبقہ نے مغرب سے نفرت اور اجتناب میں زندگی کا راز بتایا اور جدید تعلیم یافتہ نے مغرب کی تقلید سے یہ امید کی کہ وہ دوبارہ بام عروج پر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ مثال کہیں نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ شدت سے اس پہلو کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہوں کہ قوت و طاقت کے اس راز کو معلوم کرو جس سے مسلح ہو کر مغرب تمہارے اوپر اور دنیا کے اوپر چھارہا ہے۔

جب بادشاہ بھی تنقید سن کر برہم نہیں ہوتے تھے۔

سلطان بایزید ایک ترک بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانہ میں مولانا شمس الدین رومی حاکم عدالت تھے۔ ان کے یہاں ایک مقدمہ آیا جس میں خود سلطان بایزید گواہ تھا۔ جب مقدمہ پیش ہوا اور بادشاہ گواہی دینے کے لئے آیا تو مولانا شمس الدین نے کہا: سلطان بایزید کی شہادت معتبر نہیں ہے، اس لئے ان کی شہادت قبول نہیں کی جاسکتی۔ بادشاہ کو غصہ آگیا۔ اس نے پوچھا اس کا سبب کیا ہے۔ مولانا شمس الدین رومی نے کہا کہ آپ نماز میں جماعت کے پابند نہیں ہیں اور جو شخص باجماعت نماز کی ادائیگی میں کوتاہ ہو اس کی گواہی معتبر نہیں۔ سلطان بایزید نے اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کرلیا۔ بادشاہ وقت کی حیثیت سے سارا اقتدار اس کے پاس تھا اور وہ قاضی کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا۔ مگر اس نے قاضی صاحب کی صاف گوئی پر خوشی کا اظہار کیا اور اس کے بعد پابندی کے ساتھ نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہونے لگا۔ سلطان نے ایک موقع پر کہا: مجھے فخر ہے کہ میری سلطنت میں ایسے ایمان دار اور انصاف پسند قاضی موجود ہیں جو بادشاہ کے آگے بھی حق کا اظہار

کرنے سے نہیں رکتے۔

جب خدا کی زمین تعصّبات سے خالی تھی

ستر سال پہلے کی دنیا آج کی دنیا سے کتنی مختلف تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم مولانا شبلی نعمانی کی تحریر نقل کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۹ میں لکھی تھی:

یہ واقعہ حیرت سے سنا جائے گا کہ کولہاپور کی ریاست نے، جو ایک ہندو ریاست ہے، ایک مسلمان طالب علم کو اپنے صرف سے ندوۃ العلماء کے دار العلوم میں اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ یہاں ایک مذہبی تعلیم پائے۔ ریاست مذکور کے افسر تعلیم کنج لال صاحب دیوالی ایم۔اے کا جو خط اس کے متعلق ہمارے پاس آیا ہے اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"کچھ دن ہوئے مفاخرت نامہ والا شرف صدور لایا تھا۔ موقع پاکر وہ حضور مہاراجہ صاحب دام ملکہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضور ممدوح اس کا مضمون سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ طالب علم کو وہاں روانہ کیا جائے۔ امید کہ یہ نوجوان جناب کے دار العلوم سے اتنا ذخیرہ علوم کا لے کر واپس آئے گا کہ کل گرد و نواح کے مسلمان اس پر فخر کریں گے۔"

موجودہ دنیا میں یہ کس قدر عجیب آواز ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اس عجیب و غریب بے تعصبی کی بقیہ یادگاریں ہیں جو تیموریوں نے ہندستان میں غیر مذہب والوں کے ساتھ برتی تھیں۔ تیموریوں نے کیا کیا۔ اس سوال کا جواب پچھلی تاریخوں نے بار بار دیا۔ لیکن مخالفین کو تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کو زندہ مثالوں کی طرف نظر اٹھانی چاہئے۔ ان کو حیدر آباد جانا چاہئے جہاں سالانہ تین لاکھ روپے صرف شیوالوں، مندروں اور بت خانوں

کی تعمیر اور مرمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ میں نے خود اپنے زمانہ قیام (حیدر آباد) میں دیکھا کہ ایک گاؤں کے ہندو نے درخواست کی کہ ہمارے آس پاس کوئی شیوالہ نہیں ہے جس میں ہم لوگ اپنی مذہبی عبادت بجالائیں، اس درخواست پر ریاست سے چھ ہزار روپیہ عطا ہوا۔

گیا میں بدھ مت کا سب سے بڑا مندر ہے، اس کے آس پاس آج سلاطین تیموریہ کے تیرہ فرامین ہیں (میں نے خود جاکر دیکھا ہے) جس میں جاتریوں اور پجاریوں کے مصارف کے لئے زمین اور جاگیریں عطا کی گئی ہیں۔ ریاست پٹیالہ ایک سکھ ریاست ہے۔ میں نے خود وہاں جاکر معلوم کیا ہے کہ کوئی مسجد تعمیر کی جاتی ہے تو ریاست کی طرف سے ایک معین رقم اس کام کے لئے ملتی ہے۔ اور یہ قاعدہ مدت سے چلا آرہا ہے" الندوہ، ماہ جولائی ۱۹۰۹ء

دین داری یہ ہے کہ دین پوری زندگی پر چھاجائے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں "شریعت" کا بہت اہتمام کرتا ہے۔ مگر بڑے بڑے امور میں اس کو خدا کی شریعت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ ایسے معاملات میں "بال کی کھال" نکالنے کی حد تک مذہبی بنتا ہے جن میں اس کے ذاتی مفادات مجروح نہیں ہوتے۔ جو اس کے دنیوی عزائم میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے، جن میں اسے یہ قیمت نہیں دینی پڑتی کہ دین کی خاطر اپنے ایک مبغوض شخص سے محبت کرے اور اپنے ایک شخص سے محبت کرے اور اپنے ایک محبوب شخص سے قلبی تعلق ختم کردے۔ خلاصہ یہ کہ جو دین اس کی اپنی زندگی میں خلل نہ ڈالے، وہ اس کی پیروی میں بہت آگے

ہوتا ہے۔ مگر وہ دین جو اس کی اپنی زندگی سے ٹکرائے، جو اس سے "یہ کرو اور وہ نہ کرو" کا مطالبہ کرے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

☆

تغلق خاندان کے آخر زمانہ میں جب ان کی سلطنت کا زوال شروع ہوا تو فیروز تغلق کے جاگیر دار دلاور خاں نے مالوہ میں ۱۴۰۱ء میں خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ اس کا دار السلطنت ابتداءً دھار اور اس کے بعد مانڈو تھا۔ دلاور کے بعد ہوشنگ اور اس کے بعد اس کا لڑکا غزنی خاں تخت پر بیٹھا۔ اس زمانہ میں محمود خلجی اس کا وزیر تھا۔ وزیر نے موقع پا کر غزنی خاں کو مروا ڈالا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔

سلطان محمود خلجی ایک بہادر سپاہی تھا اور ذاتی زندگی میں نہایت شریف مزاج تھا۔ اس نے ساری عمر کیمپ میں گزاری۔ محمود نے ۱۴۶۹ میں وفات پائی۔ سلطان محمد تغلق کے عہد ۱۳۴۷ء دکن میں بغاوت ہوئی اور حسن گنگو نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد ہے۔ اس نے گلبرگہ کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ اس خاندان کے احمد بہمنی نے شہر بیدر بسایا جو گلبرگہ کے بجائے بہمنی سلطنت کا پایہ تخت ہو گیا۔ اسی خاندان کا ایک حکمراں نظام شاہ بہمنی تھا۔ وہ ۱۴۶۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ مگر تخت نشینی کے دو سال بعد نظام شاہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔

مالوہ کا حاکم محمود خلجی حلال غذا کا بہت زیادہ اہتمام کرتا تھا۔ ۱۴۶۱ میں اس نے بیدر پر حملہ کیا جو نظام شاہ بہمنی کا دار السلطنت تھا۔ دوران محاصرہ اس کے سامنے ایک مسئلہ یہ آیا کہ اپنے لئے حلال غذا کہاں سے حاصل کرے حلال سبزیوں کا ذخیرہ جو اس کے پاس تھا وہ محاصرہ کے طول پکڑ جانے کی وجہ سے ختم ہو گیا۔

اس مسئلہ کا اسے پہلے سے اندازہ تھا۔ چنانچہ اپنے معمول کے مطابق وہ اپنے ملک سے مٹی اور تختے لے کر گیا تھا اس نے لکڑی کے تختوں پر مٹی ڈال کر سبزی اگائی۔ مگر وہ اس کی ضرورتوں کیلئے ناکافی ثابت ہوئی۔ بالآخر اس نے اس علاقہ کے ایک بزرگ مولانا شمس الدین کرمانی کو بلایا اور ان سے کہا کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ بتایئے جس کے پاس حلال روپے سے خریدی ہوئی زمین ہو اور وہ میرے ہاتھ اس کو فروخت کر دے۔ میں اس کو لے کر اس میں اپنے لئے سبزیاں اگاؤں گا۔ مولانا شمس الدین کرمانی نے جواب دیا: ''تم نے ایک مسلمان ملک پر حملہ کیا ہے۔ یہاں آکر تم لوگوں کا خون بہا رہے ہو اور آباد گھروں کو اجاڑ رہے ہو۔ حرام سالن سے بچنے کی تمھیں اتنی فکر ہے اور مسلمانوں کی خوں ریزی سے بچنے کی کوئی فکر نہیں'' یہ سن کر سلطان رو پڑا۔

تاریخ کے مطالعے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً فخر کے جذبے کی تسکین حاصل کرنا یا ماضی کی ایک داستان کے طور پر اس کو دیکھنا — زیرِ نظر کتاب میں، اس کے بجائے تاریخ کا مطالعہ سبق اور نصیحت کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

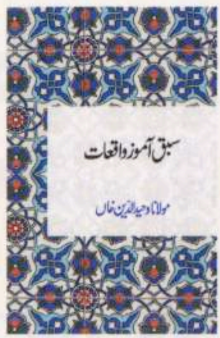

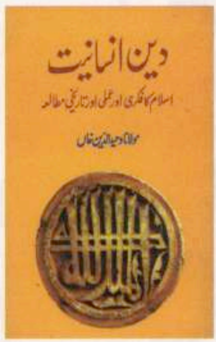

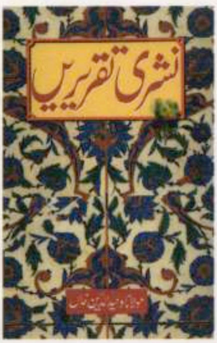

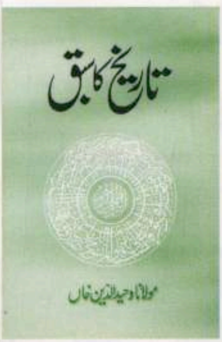

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-845-0
9 788178 988450
₹ 100